# تاریخ کا سفر

(ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)

ترتیب: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

تاریخ کا سفر (ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف) ترتیب: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ
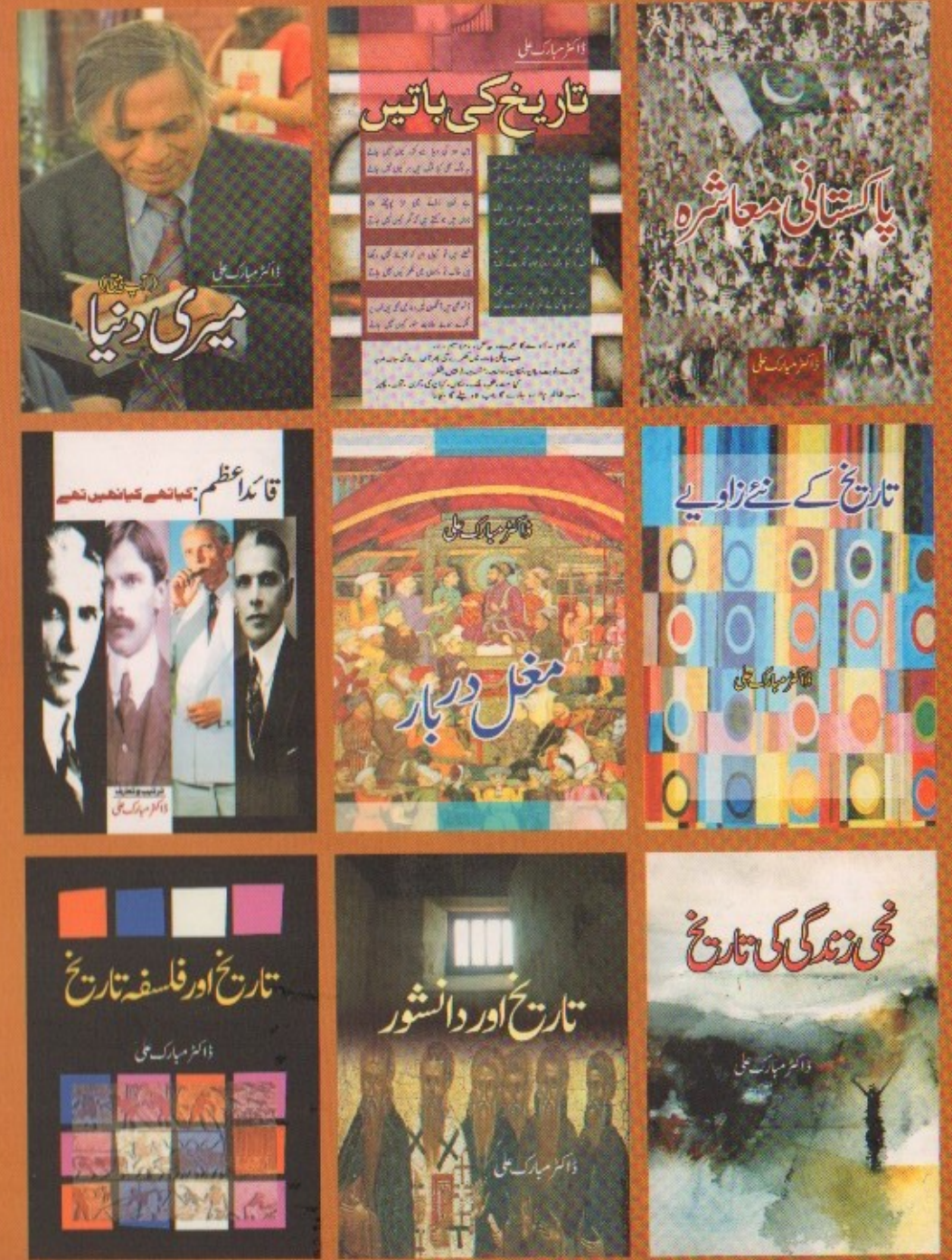
پاکستانی معاشرہ
قائد اعظم: کیا تھے کیا نہیں تھے
ISBN 978-969-914-650-3
تاریخ پبلیکیشنز

تقسیم کار: فکشن ہاؤس
لاہور • حیدرآباد • کراچی •
e-mail:fictionhouse2004@hotmail.com

# تاریخ کا سفر

(ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)

# تاریخ کا سفر

(ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)

ترتیب: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

تاریخ پبلیکیشنز
بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

نام کتاب : تاریخ کا سفر
(ڈاکٹر مبارک علی کی علمی خدمات کا اعتراف)
ترتیب : ڈاکٹر ریاض احمد شیخ
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**
بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : نین تارا
اشاعت : 2013ء
قیمت : -/600 روپے

تقسیم کار:
**فکشن ہاؤس:** بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430
**فکشن ہاؤس:** 52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608
**فکشن ہاؤس:** نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس
• لاہور • حیدرآباد • کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com



# فہرست

# پیش لفظ

پاکستان جیسے ملک میں جوکہ طویل عرصے تک فوجی آمریتوں کے زیر تسلط رہا ہے وہاں آزادیٔ تحریر پر پابندیاں عائد رہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوقومی نظریے کے تحفظ اور نام نہاد مسلم امّہ کا حصہ بننے کی جستجو میں ہم نے حقیقت سے منہ موڑتے ہوئے خیالی اور افسانوی دنیا میں زندہ رہنے کو ترجیح دی۔ ریاست کے زیر سائے نصابی کتب اور تمام علوم کو ریاست کے گھڑے گئے نظریے میں پابند کرنے کے لئے ایسے گل کھلائے کہ سچ اور حقیقت ہماری کتب اور مضامین سے غائب ہوکر رہ گئیں۔ رہی سہی کسر جنرل ضیاء الحق کے دور میں اپنے آپ کو بلاضرورت افغان جہاد میں الجھانے اور پاکستانی معاشرے کو اسلامی بنانے کے عمل نے پوری کردی۔ اس پورے عمل نے ویسے تو پاکستانی معاشرے کے تقریباً تمام شعبوں کو متاثر کیا لیکن سب سے زیادہ نقصان نصابی کتب کا ہوا جہاں نصاب کو بدل کر نفرت، جھوٹ اور بغض سے بھر دیا گیا اور اس سلسلے میں بھی سب سے زیادہ جس مضمون کا حشر ہوا وہ تھا ''شعبۂ تاریخ''۔

ہمارے تمام حکمران حقیقت اور سچ کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ سچ کا سامنا کرنا انتہائی دشوار اور تکلیف دہ ہے۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اس لئے تو وہ سچ سننا نہیں چاہتے ہیں۔ نہ حقیقت دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ایسے لوگوں کو برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ جو کہ حق اور سچ کی بات کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ ایسے کرداروں کی سرپرستی کی جو کہ ان کے وضع کردہ نظریوں کو جو صرف جھوٹ، نفرت اور کدورتوں پر مشتمل ہیں ان کی تبلیغ کرتے رہے۔ پاکستان کے حکمرانوں کی خواہشات پر لکھی جانے والی تاریخ نے حقیقت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔

اس گھٹن اور تنگ نظری کے ماحول میں ڈاکٹر مبارک علی جیسے سچے اور کھرے مؤرخ کا سامنے آنا اور پھر تاریخ جیسے حساس علم کو حقیقت کی نگاہ سے بیان کرنا ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جس طرح گذشتہ تین دھائیوں سے اپنے قارئین کو

سچائی سے روشناس کرایا ہے وہ ایک بے مثال اور بے نظیر کاوش ہے۔ آج اپنی تحریروں کے ذریعے چاہے وہ اخبارات و جرائد میں چھپنے والے ان کے مضامین ہوں یا پھر ان کی تاریخ کے موضوع پر لکھی گئیں کتب ہوں وہ اس ملک کے ہر عمر، علاقے، مختلف زبان بولنے والوں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے طبقات میں یکساں مقبول عام ہیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر مبارک علی کے گزشتہ تین دھائیوں سے زائد عرصے سے جاری قلمی جہاد کو مختلف دوستوں کی تحریروں کی صورت میں خراج تحسین پیش کرنے کی ایک کاوش ہے۔ 21 اپریل 2013ء کو ڈاکٹر مبارک علی کی 72 ویں سالگرہ ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر مبارک علی کے دوستوں اور قارئین کی طرف سے ڈاکٹر مبارک علی کی خدمت میں محبت اور خلوص کے چند الفاظ ہیں جو کہ مرتب کر کے ایک کتاب کی صورت میں یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصّہ ان مضامین اور تحریروں پر مشتمل ہے جو کہ تمام دوستوں نے ڈاکٹر صاحب کے متعلق تحریر کئے ہیں جبکہ دوسرے حصّے میں چند تصاویر کو شامل کیا گیا ہے کیونکہ تصاویر خود بولتی ہوئی تاریخ ہوتی ہیں جبکہ تیسرے حصّے میں ڈاکٹر صاحب کی تحریر کردہ کتابوں کے ساتھ ان کی رہنمائی میں منعقد کی جانے والی سالانہ تاریخ کانفرنسوں اور ان کی زیر صدارت شائع ہونے والا سہ ماہی تحقیقی جرنل "تاریخ" کے مختلف شماروں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ قارئین جو کہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتے آئے ہیں وہ اس فہرست سے استفادہ کریں اور اگر ان کی کسی تحریر کو اب تک نہ پڑھ سکے ہوں تو وہ اس کا بھی ضرور مطالعہ کریں۔

میرے لئے یہ انتہائی فخر اور اعزاز کی بات ہے کہ میں ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کا قاری ہونے کے ساتھ اب اس کاوش میں بھی شریک ہو گیا۔ میں ان تمام دوستوں کا مشکور ہوں جنہوں نے ہماری تجویز پر خلوص اور محبت کے ساتھ اس کتاب کے لئے اپنے خیالات کو رقم کیا۔ ہماری خواہش اور دعا ہے کہ ڈاکٹر مبارک مزید ہمت اور استقامت کے ساتھ لکھتے رہیں اور نوجوان نسل کی اسی طرح رہنمائی کرتے رہیں۔

**ڈاکٹر ریاض احمد شیخ**

فروری 2013ء



# پبلشر کی جانب سے

1988ء کی بات ہے ڈاکٹر مبارک علی صاحب اقبال احمد خان (مرحوم) کے ساتھ مکتبہ فکر و دانش پر تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تین کتابیں جمیل عمر صاحب کو اشاعت کے لئے دیں۔ یہ 1989ء کی بات ہے کہ جمیل صاحب نے یہ کتب اشاعت کے لئے میرے حوالے کر دیں۔ دسمبر 1990ء میں، میں مکتبہ فکر و دانش سے علیحدہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی کتب مکتبہ فکر و دانش سے شائع نہ ہو سکیں۔ مکتبہ فکر و دانش سے علیحدگی کے بعد میں نے تینوں کتابوں کے مسودے ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو واپس کر دیئے۔ جب میں یہ مسودے واپس کرنے کے لئے گیا تو ڈاکٹر صاحب اُن دنوں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور سے وابستہ تھے۔ تب تک فکشن ہاؤس کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ یہ کتابیں اب تم چھاپ لو۔ میں نے عرض کی کہ ڈاکٹر صاحب ابھی وقت نہیں جب میں اس پوزیشن میں ہوں گا تو آپ سے مسودے اشاعت کے لئے لے لوں گا۔

1994ء میں، میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ گلبرگ گیا۔ پھر میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک کتاب "شاہی محل" اشاعت کے لئے لی، اور پھر اشاعت کا ایسا سلسلہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی درجنوں کتب فکشن ہاؤس سے شائع ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اضافہ ہوا کہ فکشن ہاؤس پر ہفتے والے دن ادبی علمی محفل کا سلسلہ شروع ہوا یہاں پر ملک بھر سے دانشور حضرات تشریف لاتے تھے۔ ان علمی ادبی محفلوں سے میں نے بہت سیکھا۔ میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ یہ محفلیں میرے علمی ادبی اور تاریخی شعور کو اجاگر کرنے میں سودمند ثابت ہوئیں۔

1998ء میں ڈاکٹر صاحب انڈیا کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے ان ہی دنوں میں انڈیا پاکستان نے دوستی بس سروس لاہور سے دہلی کا آغاز کیا اور میں نے اس بس سروس کے ذریعہ ہندوستان کا پہلا سفر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سہ ماہی مجلّہ "تاریخ" نکالنے کا آغاز 1999ء میں کیا۔ جس کو فکشن ہاؤس نے شائع کیا۔ 1999ء سے اب تک سہ ماہی "تاریخ" کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا

انٹرویو جو کہ سہیل وڑائچ نے جنگ اخبار کے لئے کیا تھا، جب وہ شائع ہوا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے انٹرویو کی تعریف کی اور ساتھ ہی ذکیہ آپا سے بات ہوئی۔ ذکیہ آپا نے پوچھا ظہور انٹرویو کیسا لگا۔ میں نے جواب دیا۔ آپا ڈاکٹر صاحب آخری بات سب سے پہلے کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے سمیت کوئی کتنا ہی اختلاف کرے لیکن یہ تو سچ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ عام آدمی کے لئے لکھی ہے۔ پبلشر ہونے کے ناطے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں نے عام آدمی کو روشن خیالی، بُردباری اور قوتِ برداشت دی ہے۔ جس کا سب سے زیادہ فائدہ سندھ، بلوچستان اور سرائیکی بیلٹ کے لوگوں نے اٹھایا ہے۔

میرا تعلق میواتی گھرانہ سے ہے۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے مجھے بہت ہمت اور حوصلہ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ پر تحقیق کو ڈاکٹر صاحب کے ہم خیال اور مخالف دونوں حلقے مانتے ہیں۔ اُن کی زیرادارت اب تک سہ ماہی ''تاریخ'' کے 46 شمارے شائع ہو چکے ہیں اور میں ڈاکٹر صاحب کی 70 سے زائد کتابیں اردو اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی بچوں کے حوالے سے تحقیقی کتب ''تہذیب کی کہانی'' اور ''قدیم ہندوستان'' کو بہت سراہا گیا ہے۔

**ظہور احمد خان**

مارچ 2013ء



# جرمنی کی یادیں

**ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ احمد**

مبارک علی سے میری دوستی 1972ء میں اس وقت ہوئی، جب انہوں نے جرمنی کے شہر بوخم کی روھر یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں داخلہ لیا تھا۔ جرمنی کے نامور پروفیسر اے۔ آر۔ بوسے جو عربی اور اسلامی تاریخ کے پروفیسر تھے، اور اورینٹل اسٹڈی کے صدر تھے، وہ ان کے سپروائزر ہوئے۔ جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے سپروائزر کو ڈاکٹر فاٹر (Vater) یا ڈاکٹر فادر کہا جاتا ہے، وہ اپنے طالب علموں کے ساتھ باپ کی طرح کا مشفقانہ سلوک کرتے ہیں۔ مبارک علی کے لئے انہوں نے وظیفہ کے لئے کئی اداروں کو لکھا، اور ان کی سفارش پر انہیں سوشل ڈیموکریٹک (Social Democratic) پارٹی کی جانب سے فریڈرش ایبرٹ فاؤنڈیشن کا وظیفہ ملا۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علموں کو تھیس لکھنے سے پہلے مختلف کورسز لینا ہوتے ہیں۔ ان میں اول تو تحقیق سے متعلق کورس ہوتا ہے۔ اس کے بعد دو مضامین دوسرے شعبوں سے لینا ہوتے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علم کو ایک کلاسیکل زبان سیکھنا لازمی ہوتا ہے۔ مبارک علی نے لاطینی کی جگہ عربی زبان کا مطالعہ کیا، اور فارسی زبان کو اپنے موضوع کی مناسبت سے سیکھنا پڑا۔ اس طرح اس نے عربی، فارسی، جرمن اور انگریزی زبانوں میں دسترس حاصل کر لی۔

مبارک نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مغل دربار اور اس کی رسومات کا انتخاب کیا۔ مقالہ کی تحقیق کے سلسلہ میں بنیادی فارسی کے ماخذوں کا مطالعہ کیا۔ یہ کتابیں روھر یونیورسٹی نے جرمنی کی دوسری لائبریریوں سے منگا کر دیں۔ مخطوطات کے مطالعہ کے لئے وہ لندن میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری گئے۔ جرمنی میں تحقیقی مقالہ میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اس میں موضوع کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ ہو اور اوریجنل خیالات کے ساتھ اسے لکھا جائے۔ تحقیق کا یہ سلسلہ 1972ء سے 1976ء

تک رہا۔ مبارک نے اپنے تھیسس میں مغل دربار کی رسومات اور آداب کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ ان کے ذریعہ بادشاہ اپنی رعایا سے تعلق پیدا کرتے تھے اور ان میں وفاداری کے جذبات کو ابھارتے تھے۔ تہوار، جلوس، اور شاہی دبدبہ کے مظاہر لوگوں میں بادشاہ کا رعب قائم کرتے تھے۔

پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ کی تکمیل کے بعد، اس کا دفاع فیکلٹی آف آرٹس کے پروفیسرز کے سامنے کرنا ہوتا ہے، جو ایک گھنٹہ تحقیق کے موضوع اور آدھ آدھ گھنٹے دوسرے دو مضامین پر سوالات کرتے ہیں۔ اس کے بعد نتیجہ کا اعلان کیا جاتا ہے، اور امیدوار کو عارضی سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے، ڈگری اس وقت ملتی ہے جب تھیسس کو شائع کر دیا جاتا ہے۔ مبارک نے اس مرحلہ کو کامیابی سے پورا کیا، اور اعزاز کے ساتھ امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

جرمنی کی یونیورسٹی میں یہ رسم ہے کہ پی۔ایچ۔ڈی کے امتحان میں کامیابی کے بعد جشن منایا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے امیدوار کے لئے نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے کہ امیدوار تحقیق کے حربوں سے آراستہ ہو کر اب اپنے میدان میں اور زیادہ بہتر کام کرے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر فادر کو اپنے ڈاکٹریٹ کے طالب علم پر فخر ہوتا ہے کہ اس نے تحقیق کے سلسلہ میں ایک اور امیدوار کو تیار کر کے علم کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔

تحقیق کے اس تجربہ کے بعد، نئے ڈاکٹر کو آزادانہ طور پر نئے خیالات و نظریات اور توانائی کے ساتھ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ اس ذریعہ سے تحقیق کے طریقوں کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور یہ سلسلہ ایک ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ جو تحقیق کے میدان میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

مبارک کے پانچ سال، جو اس نے بوخم میں قیام کیا، اس دوران اسے موقع ملا کہ روھر کے علاقہ اور اس کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہو، یہ علاقہ اپنی کوئلے کی کانوں کی وجہ سے مشہور تھا، اور بعد میں اپنی صنعت کی وجہ سے، کرپس کا مشہور کارخانہ اس کے ایک شہر ایسن (Essen) میں تھا، جس نے اسلحہ بنانے میں شہرت حاصل کی تھی۔ یہ علاقہ مزدوروں کی تحریک کی وجہ سے بھی اہم تھا یہاں مزدور یونین کی جانب سے ہسپتال تھا، اور دیگر سہولتیں تھیں، اس کے علاوہ یہ علاقہ دریائے روھر کی وجہ سے سرسبز و شاداب ہے اور جو کارخانوں اور ان کی آلودگی کے باوجود، اس کی فطری خوبصورتی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جرمن یونیورسٹیاں بائیں بازو کی سیاست کا گڑھ تھیں۔ ویت نام کی جنگ کے خلاف طلباء مظاہرے کرتے تھے، تقریریں ہوتی تھیں اور امریکی سامراجیت کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔



جب جرمنی میں بائیں بازو کی سیاست کمزور ہوئی ہے تو اس کے سابق طالب علم راہنما بعد میں گرین پارٹی میں شامل ہو گئے، جس نے جرمنی کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں کئی نشستیں حاصل کیں، اور حکمران پارٹی کا حصہ بھی رہے۔ میرا خیال ہے کہ مبارک نے جرمنی کی اس سیاسی تبدیلی اور اتار چڑھاؤ سے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔

اپنی تحقیق اور پڑھائی کے باوجود مبارک نے دوستوں کے ساتھ اپنے تعلقات رکھے اور سماجی سرگرمیوں میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ ہم اکثر یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں لنچ یا شام کے کھانے پر ملتے تھے۔ یہ کیفے ٹیریا اس قدر وسیع تھا کہ اس میں بیک وقت 25 ہزار طالب علم کھانا کھا سکتے تھے۔

وہ اکثر دوستوں کو اپنے ہاسٹل بھی بلا لیتے تھے جہاں تاریخ اور سیاست پر گرما گرم بحث و مباحثہ ہوتا تھا، اور ہم سب ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا کہ میں خود بھی اپنے ڈاکٹریٹ کے لئے فزیالوجی میں، جو میڈیسن کی فیکلٹی تھی، وہاں کام کر رہا تھا۔ روھر یونیورسٹی میں میڈیسن، آرٹس، نیچرل سائنس کی بلڈنگیں ایک دوسرے کے قریب قریب تھیں۔ ڈاکٹر ایچ۔ جی۔ حیدر بھی اس زمانے میں بائیولوجی کے شعبہ میں مچھلیوں کی پیداوار پر تحقیق کر رہے تھے۔ اس وقت ہم پی۔ایچ۔ڈی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔

یونیورسٹی میں سوشل سائنسز، نیچرل سائنس اور میڈیسن کی بلڈنگوں میں علیحدہ علیحدہ شعبے تھے۔ مثلاً سوشل سائنس یا آرٹس کی بلڈنگ میں تاریخ، میوزک، اور آرکیالوجی کے شعبے تھے۔ اس طرح سے یونیورسٹی کے شعبے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اور یہ موقع دیتے تھے کہ سارے طالب علم اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے شعبوں میں ہونے والی تحقیق سے بھی واقف ہوں، یہ مواقع سیمینار کے ذریعے ملتے تھے، اور طالب علموں کو وسیع تناظر میں دوسرے مضامین سے آگہی ہوتی تھی۔ اکیڈمک بحث و مباحثہ میں آزادی رائے کا حق حاصل تھا، جس کی وجہ سے طلباء میں نئے نظریات و خیالات کو بحث میں لانے کا پورا موقع ملتا تھا۔ اس ذہنی کاوش سے طلباء تحقیق کے حربوں سے مسلح ہو کر جب عملی زندگی میں داخل ہوتے تھے تو انہیں کامیابی حاصل ہوتی تھی اور وہ معاشرے کی ترقی اور فلاح کے لئے کام کرتے تھے۔ جرمن یونیورسٹی کا یہ ماڈل تھا کہ جسے امریکہ میں جان ہاپکنس اور شکاگو یونیورسٹیوں نے اختیار کیا اور بعد میں امریکہ کی یونیورسٹیاں اس ماڈل میں ڈھل کر تحقیق اور نظریات کی پیداوار کا مرکز بن گئیں۔

مجھے جب بھی اپنی ڈاکٹریٹ کی تحقیقات سے فرصت ملتی تھی، تو میں مبارک کے پاس اس کے ہاسٹل چلا جاتا تھا، جو یونیورسٹی اور میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بعد میں جب وہ شادی شدہ فلیٹ

میں منتقل ہوئے تو پھر ہماری بیٹھک وہاں ہونے لگی۔ جب وہ غیر شادی شدہ تھا تو اس نے کھانا پکانے کا ایک سادہ طریقہ دریافت کر لیا تھا۔ وہ دال کو چولہے پر چڑھا کر اس میں پیاز، ٹماٹر اور دوسرے مسالے ڈال دیتا تھا اور یہ دال آہستہ آہستہ پک کر تیار ہوتی تو ہم سارے جرمن براؤن روٹی یا چاولوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ اس کا ذائقہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ دال کے تیار ہونے تک ہماری بات چیت اور بحث جاری رہتی تھی۔

میں نے مبارک سے ان ملاقاتوں اور بات چیت میں تاریخ کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ یہ بحثیں یا سیمینار جو مبارک کے ساتھ ہوتے تھے، ان کی خوشگوار یادیں آج بھی میرے ساتھ ہیں۔ ان بحثوں کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ ہماری تاریخ کو کس قدر مسخ کیا گیا ہے اور حقائق کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس نے اس کو واضح کیا کہ درحقیقت یہ عوام کی طاقت اور توانائی ہوتی ہے جو تاریخی عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں عوام تاریخ کو بنانے والے ہیں، وہ تاریخ کے دھارے کو آگے چلاتے ہیں۔ اب تاریخ کا مضمون فلسفہ کی طرح سے نہیں ہے، بلکہ اس میں فلسفہ، ادب، عمرانیات، علم بشریات، اور نفسیات بھی شامل ہو گئے ہیں جنہوں نے اسے ایک نئی زندگی اور توانائی دی ہے۔

جب ذکیہ بھابھی جرمنی میں آئیں، تو مبارک شادی شدہ فیملی اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے جو یونی سینٹر سے، کہ جہاں میں رہتا تھا، زیادہ دور نہیں تھا۔ یونی سینٹر کو ایک پل کے ذریعہ یونیورسٹی کی لائبریری، اور دوسری عمارتوں سے ملایا گیا تھا۔ ان عمارتوں میں یونیورسٹی کی انتظامیہ کا آفس، آڈیٹوریم، اور ایک وسیع و عریض میزا (Mensa) یا کیفے ٹیریا تھا اور اس کی چھت پر کافی و چائے کی جگہ۔ جہاں سے یونیورسٹی کے اردگرد پھیلے سرسبز و شاداب جنگل نظر آتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں جب سورج نکلا ہو تو اس کی چھت کی کھلی فضا، تازہ ہوا طلباء کو تازہ دم کر دیتی تھی۔ یونیورسٹی کی عمارتیں ایک دائرے میں تھیں۔ جن میں آرٹس، نیچرل سائنس، میڈیسن اور انجینئرنگ کے شعبہ جات تھے، جو ان علوم کی ہم آہنگی کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت بوٹانیکل گارڈن اور اسپورٹس کا سینٹر تھا۔ اس پورے منصوبے کے تحت یونیورسٹی کا مقصد طلباء کی ذہنی، جسمانی اور جمالیاتی تربیت کرنا تھا۔

یہ نوجوان جوڑا کیمپس میں ایک نئی تازگی اور خوشگوار تبدیلی لایا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر کہانی کے پس منظر میں عورت کا حصہ ہوتا ہے۔ سو یہ مبارک کے ساتھ بھی ہوا۔ ذکیہ بھابھی کو کیمپس کی زندگی اور ماحول میں عادی ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور وہ بہت جلد اس کی عادی ہو گئیں۔ جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علموں میں شادی کا رواج بہت زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ فرد کی تخلیقی

## ڈبیٹنگ سوسائٹی

(بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) مبارک علی خاں، اے۔ کے عزیز، عابد عباس (پرنسپل) منظر اکبر، اکبر
(کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں) ظفر مسعود، عبدالسلام قریشی، عاقل، انعام اللہ

## سٹی کالج سٹوڈنٹ یونین

(بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں) سید مسرور الحسن، مرزا عابد عباس، عنایت علی خان
(کھڑے ہوئے بائیں سے دائیں) امان الرحمن، مشتاق احمد، رمضان احمد، ملازم حسین بلوچ، مبارک علی خان

آل پاکستان مباحثہ میں تقریر کرتے ہوئے

سٹی کالج کے آل پاکستان اردو مباحثہ میں زیڈ۔اے بخاری کے ساتھ بحیثیت نائب صدر طلباء یونین

سٹی کالج سے آل پاکستان اردو مباحثہ میں زیڈ۔اے بخاری کے ساتھ

آگرہ میں فیملی کے ساتھ

تاج محل میں
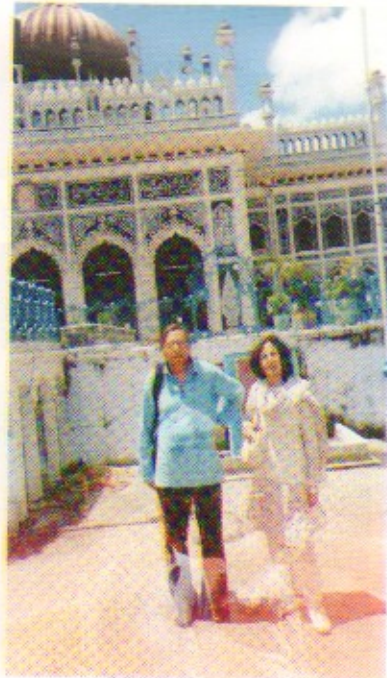
لکھنو میں آصف الدولہ کی امام بارگاہ پر

نین تارا کے ساتھ

دہلی میں ہونے والی ہسٹری کانفرنس میں پروفیسر امریت سنگھ کے ساتھ

پروفیسر ہربنس مکھیا اور عبدالمعبود کے ساتھ
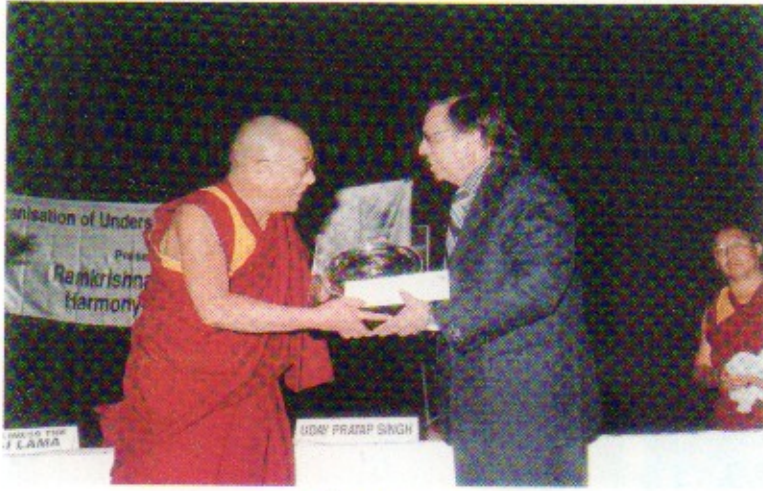
دلائی لامہ کے ساتھ

دلائی لامہ سے انعام لیتے ہوئے

دہلی میں دلائی لامہ اور دیگر دوستوں کے ساتھ

کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے

ہسٹری کانفرنس میں

ڈاکٹر مظاہر، زبیدہ مصطفیٰ اور سحر انصاری کے ساتھ

ڈاکٹر مبارک علی کا مجسمہ

ظفر خضر اور انور کمال کے ساتھ
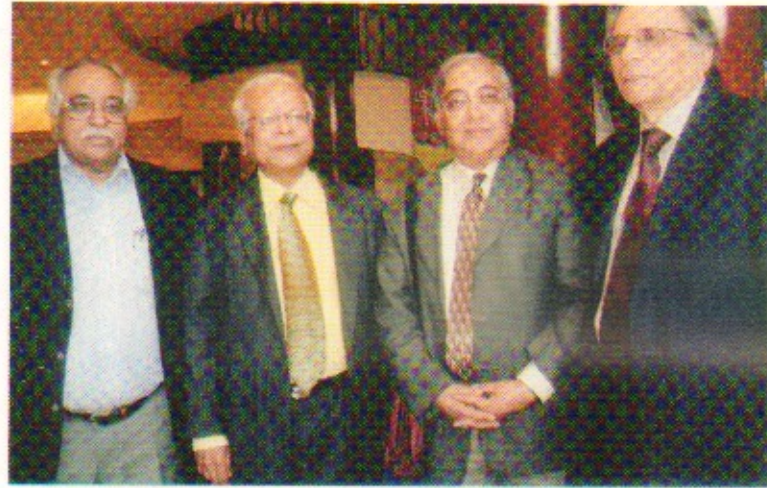
ڈاکٹر جعفر احمد اور راحت سعید کے ساتھ

اسلم گورداسپوری کے ساتھ
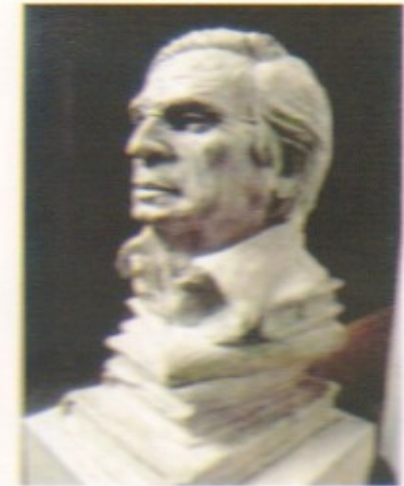
صلاحیتوں کو ابھارنے میں رومان کا اہم کردار رہا ہے۔ اب ہمارا تجرباتی کھانے کا سلسلہ تقریباً ختم ہوا اور یہ ذمہ داری ذکیہ بھابھی نے سنبھال لی۔ اب ہمیں بحث ومباحثہ کے لئے اور زیادہ وقت مل گیا، میں نے ایک طرف تو مارکس کے نظریات کے بارے میں اپنے جرمن دوستوں سے بہت کچھ سیکھا، تو دوسری طرف مبارک نے مغل بادشاہ اکبر کے نظریات اور اس کی رینا ساں تحریک سے مجھے روشناس کرایا۔ مجھے ہمیشہ سے یہ تجسّس رہا کہ اسپین میں علم وادب کی بارش کے کچھ قطرے کیوں نہ ہندوستان کی سرزمین کو سیراب کر سکے، جیسا کہ انہوں نے یورپ کے نظریات کو آبیار کیا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ایسے کوئی ذرائع نہ تھے کہ جو ان کے درمیان راستوں کو پیدا کرتے اور انہیں آپس میں ملاتے۔ افسوس ہے کہ یہ محرومی آج بھی مسلم دنیا اور پاکستان میں جاری ہے۔ مجھے ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے کہ ہمیں بوخم شہر کی جانب سے کیم ناڈے فیسٹیول میں دعوت دی گئی کہ ہم وہاں اپنے کھانے کا اسٹال لگائیں، یہ فیسٹیول ہر سال تین دن کے لئے منعقد ہوتا ہے۔ جس میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اپنے کھانوں کے اسٹال لگا کر انہیں مناسب قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔

اس موقع پر پاکستان، بنگلہ دیش، اور انڈیا کے طلباء نے فیصلہ کیا کہ وہ کھانے کا مشترکہ اسٹال لگائیں گے۔ ہم نے یہ کھانا میزا کے باورچی خانہ میں پکایا جو کہ انتہائی جدید چولہوں اور پکانے کے برتنوں سے آراستہ تھا۔

پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا کے کھانوں کا یہ اسٹال فیسٹیول میں بڑا کامیاب رہا۔ ذکیہ بھابھی اور خالد نے اسٹال پر پیسوں کا حساب رکھا۔ اس اسٹال کو لگانے میں تینوں ملکوں کے طلباء نے برابر کا حصہ لیا، بنگلہ دیش کے شبیر نے اس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔

ہمارے کھانوں کو لوگوں نے پسند کیا، اور کھانے کے ساتھ جرمنوں نے بیر کے جام پر جام چڑھائے۔ ہمارے کھانے کی تعریف میں مقامی اخباروں نے بھی خبریں لگائیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسٹال جو تین ملکوں کی جانب سے لگایا گیا، یہ ایک مشترکہ کلچر کی نمائندگی کر رہا تھا، اور جرمنوں کو پیغام دے رہا تھا کہ ان تینوں ملکوں کا مشترکہ کلچر کس قدر توانا ہے۔ جب ہم غیر ممالک میں ملتے ہیں تو تینوں ملکوں کے لوگ ایک ہو جاتے ہیں، مگر جیسے ہی یہ واپس جاتے ہیں، پھر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب وغریب انسانی رویہ ہے کہ جس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ برصغیر ہندوستان آزاد تو ہو گیا ہے، مگر اس آزادی کی قیمت اس نے تقسیم کی صورت میں ادا کی ہے۔ اس کی قیمت ہم تینوں ملک غربت وافلاس کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ تینوں ملکوں کے باہمی تعلقات اور

ساجدہ اور پروفیسر وندل کے ساتھ

محسن اقبال کے ساتھ

ایوب ملک اور توصیف کے ساتھ

ذہنی ہم آہنگی کے لئے ہمیں جے۔این۔یو (جواہر لال یونیورسٹی) جیسے اداروں کی ضرورت ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مبارک کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے تو واپسی پر میرے لئے طارق علی کی کتاب Peoples Power Or Military Rule لے کر آئے۔ یہ کتاب انتہائی اہم ہے، جس میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو کس طرح سے مغربی پاکستانیوں نے حقارت کے ساتھ دیکھا، اور برا سلوک کیا۔ اس نے دلیل کے ساتھ وضاحت کی ہے کہ کس طرح سے 1958ء کے فوجی گو نے پاکستان کی سیاست کو تباہ کیا اور ملک کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں۔ جس نے مستقبل کی نوجوان نسل کے کیریئر کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہ کتاب ہمارے نصاب کا حصہ ہونی چاہیے۔ اس کتاب کے علاوہ ہم پاکستان پر شائع ہونے والی دوسری کتابوں پر تبصرے کیا کرتے تھے اور ملک کی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس وقت پاکستان کے چار لوگ دنیا میں بڑے مشہور ہو گئے تھے۔ ان میں اقبال احمد امریکہ میں، روشن دھنجی بائی جرمنی میں، حمزہ علوی اور طارق علی انگلستان میں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر افراد کو آزادی رائے کے مواقع ملیں تو وہ اس ماحول میں اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو ابھار سکتے ہیں۔ جرمنی میں فرد کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے وہ (Ousbildung) کے لفظ کو استعمال کرتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ فرد کی تعلیمی تربیت اس انداز سے ہو کہ اس کی ذہانت کو ابھرنے کا موقع ملے۔

بقول آرنلڈ ٹوائن بی، ''فرد سوسائٹی میں انسانیت کی تربیت پاتا ہے'' اگر مبارک کے گروپ سے کہ جس کا تعلق تنقیدی طور پر واقعات کا جائزہ لینا ہے اور روایات کو چیلنج کرنا ہے، اس کو تسلیم کر لیں یا اس میں شامل ہو جائیں تو ہم انسانیت کے درجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

1976ء میں جب ستمبر کا مہینہ آیا، تو مبارک کے لئے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی جام شورو جانے کا وقت آ گیا کہ جہاں سے وہ اسٹڈی پر جرمنی آئے ہوئے تھے۔ اگرچہ اسے کئی جگہ سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کی پیش کش تھی، مگر اس نے اپنے عہدنامہ کو برقرار رکھتے ہوئے، ان سے انکار کیا اور واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ جب مبارک اور ذکیہ بھابھی نے واپس جانے کے لئے اپنے سامان کو پیک کرنا شروع کیا، تو ہم سب ہی افسردہ تھے۔ مبارک جب جرمنی آیا، تو اس وقت وہ اکیلا تھا، اور ایک سوٹ کیس کے ساتھ آیا تھا۔ مگر اب گھر جاتے ہوئے اس کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری سمیت سات سوٹ کیس، کتابوں کے باکس، ذکیہ بھابھی اور ڈیڑھ سال کی عطیہ اور دو ماہ کی شہلا تھی۔ جس کا شہلا نام میرا رکھا ہوا تھا۔ میں عطیہ کو بے بی سٹنگ کیا کرتا تھا۔ جب بھی وہ دونوں کہیں جاتے تھے۔ جب مبارک اور ذکیہ بھابھی عطیہ کو لینے



میرے اپارٹمنٹ میں آتے تو وہ میرے ساتھ اور زیادہ رہنا چاہتی تھی، اور جانے سے انکار کرتی تھی۔ جب کسی فرد کو بچے اور کتے پسند کریں تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں کوئی دلکشی ضرور ہے۔

یہ اتفاق ہے کہ جب مبارک اور ذکیہ بھابھی نے بوخم چھوڑا ہے تو میں اپنی شریک حیات رافعہ کے ساتھ بوخم آیا۔ یہ 1976ء کا واقعہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سفارتی تبدیلی تھی، اس جوڑے کی جگہ ہم نے لے لی۔ رافعہ نے مبارک اور ذکیہ بھابھی کے بارے میں، بہت کچھ سنا تھا، جب کہ وہ بوخم میں 9 سال تک رہیں، مگر آخر کار ہمارے خاندانوں کا کراچی میں ملنا ہوا جب میں نے آغا خاں یونیورسٹی کی پیش کش کو 1985ء میں قبول کیا، بمعہ اہل وعیال کے کراچی چلا آیا۔ رافعہ ذکیہ بھابھی اور مبارک سے پہلی مرتبہ کراچی میں ملیں۔ فیصل اور سمیرا کی عطیہ اور شہلا سے دوستی ہو گئی، یہ بوخم کے رہنے والوں کا ایک چھوٹا کلب ہو گیا۔

مبارک سے میری اس بات پر کافی بحث ہوئی کہ آخر میں نے کیوں ایک طویل عرصہ جرمنی میں رہنے کے بعد آغا خاں یونیورسٹی کی پیش کش کو قبول کیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جنوبی ایشیا کا پہلا میڈیکل کالج ہے کہ جہاں پی۔ایچ۔ڈی اور تحقیق کے مواقع ہیں۔ اس لئے اگر اس کے طالب علم جو کہ ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری کے لئے پڑھتے ہیں، اگر انہیں سائنسدان پڑھائیں تو یقیناً اس کا اثر ان کی تعلیم اور تربیت پر ہوگا۔ اس لئے میرے لئے یہ موقع تھا کہ میں جرمن یونیورسٹی کے ماڈل پر یہاں تحقیق کا ادارہ قائم کروں اور طالب علموں میں اس عمل کو آگے بڑھاؤں کیونکہ اس کی اس وقت بھی ضرورت تھی کہ جب میں آیا تھا اور آج بھی ہمیں ایک تحقیقی میڈیکل ادارہ کی سخت ضرورت ہے۔

اس کے بعد سے آج تک ہم تقریباً روز یا ہر ہفتہ اکیڈمک یا دوسرے مسائل پر آپس میں بحث و مباحثہ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ایک دلچسپ موضوع ہے کہ ہم نے ماضی میں کیا کیا، اور اب مستقبل کے لئے ہمارے کیا منصوبے ہیں۔ زندگی ایک رنگارنگ کا بوقلمونی عمل ہے۔ لہٰذا ہم نے جو فیصلہ کیا، اس میں ایک مشترک چیز نظر آتی ہے کہ دوبارہ سے واپس آ کر اپنے معاشرے کے لئے کچھ کیا جائے، اور جو علم حاصل کیا ہے اس میں یہاں کے نوجوانوں کو شامل کیا جائے۔ ہم نے زندگی کے راستوں کو منتخب کرتے ہوئے، سیدھے اور پُر پیچ راستوں کا انتخاب کیا۔

اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مبارک نے جو سفر 1976ء سے شروع کیا تھا اب تک جاری ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔

وطن کے اس باسی کی واپسی، جو کہ تعلیم اور تحقیق کے نئے حربوں سے آراستہ ہو کر واپس آیا، اس کا جام شورو یونیورسٹی میں خیر مقدم ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے سندھ یونیورسٹی میں

1989ء تک صدر شعبہ اور پروفیسر تاریخ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

اس دوران اس نے عوامی تاریخ کے نظریہ کو پاکستان میں روشناس کرایا۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا کہ مستحکم اور مضبوط روایات کو چیلنج کیا جائے اور حکمرانوں کی تاریخ کی جگہ عوام کی تاریخ کو بنایا اور لکھا جائے۔ اس تحریک کا مقصد ہے کہ نوجوان نسل میں تاریخ کے بارے میں نئے خیالات سے آگاہ کیا جائے اور ان میں روشن خیالی کے جذبات کو پیدا کیا جائے تا کہ وہ حالات کا تنقیدی جائزہ لے سکیں۔ میں مبارک کے اس حوصلہ اور مایوس ہونے کے بجائے، وہ پوری قوت اور توانائی سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔ جب ریاست اور اس کے اداروں اور لوگوں کے صدیوں کے خیالات کی مخالفت کی جائے گی تو اس صورت میں مقبولیت تو نہیں ملے گی مگر اس کے نتیجہ میں نوجوان نسل میں جو تبدیلی آ رہی ہے، وہ حوصلہ دیتی ہے کہ اس عمل کو جاری رکھا جائے۔ مبارک نے سندھ کی تاریخ کو ایک نئے اسلوب اور نظریہ کے ساتھ لکھ کر نوجوانوں کو ایک نئی سوچ دی ہے۔ اس کی پہلی کتاب جہاں تک مجھے یاد ہے، اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، مگر اس کے موضوع نے لوگوں کو تاریخ کے اس نئے نظریہ کی جانب متوجہ کیا، اور پہلی کتاب کے بعد، دوسری کتابوں کو اور زیادہ مقبولیت ملی۔

1989ء میں وہ ذکیہ بھابھی، عطیہ، شہلا، اور نین تارا کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے، تا کہ پاکستان کے اس اہم صوبہ میں روشن خیالی کی تحریک کو مقبول بنایا جائے۔ 1995ء تک وہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کا ڈائریکٹر رہا، اس پوزیشن نے اسے یہ مواقع دیئے کہ اپنی بات کو وسیع تر حلقے میں روشناس کرائے۔ بھابھی نے اے لیول کے طالب علموں کو اردو پڑھانے کے لئے اسکول اور ایک لاء کالج میں ملازمت کی۔

انہوں نے اپنی بچیوں کی تحقیقی صلاحیتوں کو ابھارا عطیہ مورخ بن گئی، شہلا نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا، نین تارا نے ٹیکسٹائل ڈیزائن میں گریجویشن کی، اور اب وہ مبارک کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہے۔

مبارک نے برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں اپنا کردار ادا کر کے روشن خیالی کے نظریات کو فروغ دیا اور کوشش کی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں میں ملاپ اور اتحاد ہو، تا کہ اس خطہ میں امن اور خوش حالی کی زندگی گذارنے کا ہر فرد کو موقع ملے۔ میں اس کے اس کردار پر سلام پیش کرتا ہوں کہ اس نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ اس کو خوابوں سے نکال کر حقیقت تک پہنچایا۔



# خرد افروزی کا مورخ — ڈاکٹر مبارک علی

اسلم گورداسپوری

کبھی کبھی انسان بھی اپنے فکر و عمل میں اور اپنے علم و تدبر میں بحر بیکراں بن جاتے ہیں۔ جن کی ذات کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جن کے بارے میں اظہار خیال کرنا آسان نہیں رہتا۔ ان کی شخصیت کا دائرہ کار کئی ایک موضوع اور کئی ایک جہتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ان تمام کو تحریر کے دائرے میں لانا ممکن نہیں ہوتا۔

سقراط نے کہا تھا کہ بڑے انسانوں کے بارے میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان کی باتیں آسان ہوتی ہیں مگر ان کو بیان کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ میں انسان کی شخصیت کو عظیم کہہ کر اپنی مشکل آسان کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب جن کی ذات کے بارے میں اظہار خیال کرنے کے میں مرحلے میں گرفتار ہوں۔

وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتے ان کا فرمانا ہے کہ ایک عظیم انسان ایک قوم یا ایک قبیلے یا ایک گروہ کے لئے تو عظیم ہو سکتا ہے وہ دوسری قوم کے لئے یا قبیلے یا گروہ کے لئے عظیم نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر وہ سکندر کے بارے میں کہا کرتے ہیں لوگ کس قدر جاہل اور غیر معاملہ فہم ہیں کہ فاتح اور مفتوح بھی اس کو سکندر اعظم کہتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ سکندر اپنی قوم کے لئے تو عظیم ہو سکتا ہے وہ ان لوگوں کے لئے کیسے عظیم ہو سکتا ہے جن کا ملک اس نے تاراج کیا تھا اور لاکھوں انسانوں کو قتل کر دیا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ مگر یہ بات صرف جنگجو فاتحین کے لئے کہی جا سکتی ہے۔ اس بات کا اطلاق فنکاروں، شاعروں، مصوروں، ادیبوں، قلم کاروں، فلسفیوں، تاریخ دانوں اور خود ڈاکٹر مبارک علی پر نہیں ہو سکتا۔

اس لئے کہ ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ دانی اور تاریخ نویسی کا انداز ایک بین الاقوامی انداز ہے۔ وہ انسانوں کی تاریخ لکھتے ہیں وہ محض کسی قوم یا کسی قبیلے یا کسی گروہ کی تاریخ نویسی نہیں کرتے۔ لہٰذا میری نظر میں ڈاکٹر مبارک علی کا مقام اور شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو حقیقت حال میں انسانی نقطہء نظر سے عظیم انسان کہا جا سکتا ہے۔ البتہ کوئی شخص کسی قومی اور مذہبی سے میری بات سے اختلاف کر سکتا ہے۔ جو اختلاف انسانی جدلیات کے اعتبار سے تاریخ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ بڑا انسان وہ ہوتا ہے جو بنی نوع انسان یا پوری انسانیت سے محبت کرتا ہو۔ اس کی اس محبت میں اس کی قوم اور قبیلہ سب ہی آ جایا کرتے ہیں۔

دنیا میں تاریخ کے مضمون کو بہت خشک مضمون خیال کیا جاتا رہا ہے۔ تاریخ کے مضمون کو ایک بے رحم مضمون بھی کہا جاتا ہے۔ مگر تاریخ کے بارے میں یہ دونوں تصور قدیم عہد کے تصور ہیں۔ مگر ہمارے عہد میں تاریخ نویسی کے جدید تصور جس کے موجد اور بانی ڈاکٹر مبارک علی ہیں۔ اس جدید تاریخ کو نہ تو خشک کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی بے رحم قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس لئے کہ ڈاکٹر مبارک علی نے یہ تاریخ نویسی کو ایک جدلیاتی انداز عطا کر کے تاریخ کے قدیم تصور کو ہی تبدیل کر دیا ہے۔ قدیم تاریخ نویسی بادشاہوں کے درباروں کے روزنامچوں سے شروع ہو کر ان روزنامچوں پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اس قدیم تاریخ نویسی میں اس عہد کی سیاسی سماجی ثقافتی اور اقتصادی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ خصوصاً وہ تاریخ نویسی جس عہد کی بھی ہوتی تھی اس تاریخ نویسی میں عوام الناس کا کوئی کردار نہیں ہوتا تھا۔

جبکہ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ میں اس بات کو ایک مرکزی حیثیت دیتے ہوئے ثابت کیا کہ دنیا میں کوئی تاریخ عوام کے کردار کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، اور نہ ہی عوام کا ذکر کئے بغیر مکمل ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک کی تاریخ نویسی کا یہ مارکسی نقطہء نظر ہی ڈاکٹر صاحب کی تاریخ دانی کا سب سے موثر انداز ہے جس کو میں نے انسانی تاریخ کی جدلیات سے تعبیر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تاریخ نویسی ہر عہد کی ایک مکالماتی تاریخ ہے ایک مکالمہ ہے ایک باقاعدہ علم ہے فلسفہ ہے اور خرد افروزی ہے۔

بات خرد افروزی کی ہوئی ہے تو یہاں میں ایک بار پھر سقراط کی ہی بات دہراؤں گا۔ سقراط نے اپنے شاگرد فیدو سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ انسان کی ہر بات کا کچھ مطلب ہونا چاہئے۔ بے مقصد بات چیت غیر انسانی عمل ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ کچھ لوگ معجزوں اور شعبدوں کی زبان میں بات کرتے



ہیں۔ یہ طریقہ لوگوں کی سوچ کو بند کرنے کا طریقہ ہے۔

اسی طریقے سے تاریخ کو جب فاتحین کی تاریخ بنایا جاتا ہے اور اس پر جب مذہب کا رنگ چڑھایا جاتا ہے تو تاریخ نویسی ایک ذہنی لذت کوشی بن جاتی ہے۔ واقعات وحالات سے ماوراء بنا دی جاتی ہے، اور تاریخ لوگوں کے لئے ایک خوش کن مضمون بن جاتی ہے۔ جبکہ انسانی تاریخ ہرگز ایک خوش کن چیز نہیں ہوتی بلکہ تجربات اور حادثات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ انسانوں کی غلطیوں کا پلندہ ہوتی ہے۔ بڑی سبق آموز اور عبرت کا مضمون ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے پہلے ہم نے تاریخ کو جامد و ساکت انداز میں پایا تھا۔ تاریخ کو ایک گزرا ہوا وقت خیال کیا جاتا تھا جس کو ماضی پرستی کہا جاتا ہے۔ تاریخ صرف حکمرانوں کے ہی قصے کہانیوں تک محدود ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جب ہم بادشاہوں کی اپنی خودنوشت تاریخ پڑھتے ہیں تو اس بات کی مکمل تصدیق ہو جاتی ہے کہ تاریخ میں یعنی ماضی کی تاریخ نویسی میں عوام کا کوئی کردار تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور نہ ہی عوام الناس کو اس قابل خیال کیا جاتا تھا کہ ان کا ذکر تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہو۔ مسلمان بادشاہوں میں بابر بادشاہ کی توزک بابری میں یا جہانگیر کی توزک جہانگیری میں اس عہد کے عوام کے کردار وعمل کا کہیں کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اسی طریقے سے پرانے مورخین بھی عوام کے کردار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے ہاں تو تاریخ کو قصے اور کہانیوں کی شکل میں یا ناول اور افسانوں کی شکل میں تحریر کیا جاتا تھا جس طرح عبدالحلیم شرر اور شبلی نعمانی کا انداز تاریخ نویسی تھا۔ ان لوگوں نے تاریخ کو مذہب بنا رکھا تھا۔ انسانوں کی تاریخ کے بجائے مسلمانوں کی تاریخ کا نام دیا گیا تھا۔ ان کے بعد ہمارے ہاں نسیم حجازی کو تاریخ دان خیال کیا جاتا تھا۔ جو تاریخ کے ساتھ ایک مذاق تھا۔

عالمی تاریخ میں انسانی جدلیات کی تاریخ نویسی یعنی عوامی تاریخ نویسی کے بانی مورخ ایڈورڈ ٹامسن اور ایرک ہابس باوم اور ہاورڈ زین اور کرسٹوفر ہل تھے۔ جنہوں نے تاریخ نویسی کی کایا پلٹ دی تھی۔ تاریخ کو لوگوں کی تاریخ بنا دیا تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر مبارک علی پاکستان میں وہ تاریخ دان ہیں جنہوں نے تاریخ کو باقاعدہ زندگی کا مضمون بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر مبارک نے انسانی زندگی کے ہر زاویئے پر تاریخ نویسی کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ٹائن بی کے بقول تاریخ کو صرف پنڈولم کی شکل میں نہیں رکھا۔ تاریخ کو تیر کی طرح آگے بڑھنے کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ ان کی کتابوں کے ناموں سے ہی تاریخ کی قوت اور حرکت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور تاریخ کو زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

ان کی کتابوں کے نام ہی انسانی ذہن میں ارتقاء پیدا کرتے ہیں۔آ گہی پیدا کرتے ہیں۔علم اور شعور پیدا کرتے ہیں مثال کے طور پر ان کی کتاب کے نام ہیں ''برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ''، ''آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان''، ''تاریخ کا المیہ''، ''تاریخ شناسی''، ''تاریخ اور آ گہی''، ''تاریخ کے نئے زاویے''، ''تاریخ اور تحقیق کے نئے رجحانات''، ''گمشدہ تاریخ''، ''تاریخ کے بدلتے نظریات''، ''تاریخ اور سیاست''، ''تاریخ کیا کہتی ہے''، ''تاریخ اور دانشور''، ''تاریخ اور فلسفہ تاریخ''، ''تاریخ کی روشنی''، ''تاریخ اور جاگیرداری''، ''علماء اور سیاست''، ''تاریخ اور عورت''، ''اچھوت لوگوں کا ادب''، ''مغل دربار''____ یہاں تک کہ انہوں نے ''تاریخ ٹھگ اور ڈاکو''، ''نجی زندگی کی تاریخ'' تک کو تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی آپ بیتی ''در در ٹھوکر کھائے'' اور ''تاریخ سے مکالمہ'' نام کی کتاب لکھ کر تاریخ کو بہت سادہ اور آسان مضمون بنا دیا ہے۔پاکستان میں تاریخ کے نام پر یا تاریخ کے حوالے سے کانفرنس منعقد کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔اس کا سہرا بھی ڈاکٹر مبارک علی کے سر ہے کہ انہوں نے لاہور، کراچی، اسلام آباد، حیدرآباد اور پاکستان کے مختلف شہروں میں تاریخ کے حوالے سے کانفرنسوں کا سلسلہ جاری کر کے تاریخ کے مضمون کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ کیا۔

حال ہی میں انہوں نے کراچی میں عورت اور تاریخ کے حوالے سے کانفرنس کر کے تاریخ میں خواتین کے کردار کو تاریخی عظمت عطا کی ہے جو پاکستان میں خواتین کے تاریخی کردار کی پہلی کاوش کہی جا سکتی ہے۔ڈاکٹر صاحب کا علم و مطالعہ بین الاقوامی علم و مطالعہ ہے۔یورپ کے ممالک میں تاریخ پر متنوع انداز میں بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے ایک باقاعدہ شعوری کوشش کے ساتھ پاکستان میں تاریخ کو وہی مقام و مرتبہ دیا ہے جو مقام مرتبہ تاریخ کو ترقی یافتہ اقوام میں دیا گیا ہے۔انہوں نے پاکستان میں تاریخ کا جنرل نکال کر پاکستان میں تاریخ نویسی کو عالمی سطح کے برابر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔جس کو سہ ماہی تاریخ نمبر کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔جس کے آج تک تقریباً 46 جنرل آ چکے ہیں۔جس میں پینتالیس نمبر ''تاریخ اور عوام'' کا خصوصی شمارہ بے پناہ اہمیت کا حامل شمارہ ہے۔انہوں نے تاریخ اور عوام جنرل شائع کرنے کے بعد تاریخ اور عوام کانفرنس بھی منعقد کی۔یہ کانفرنس اپنے عنوان اور اپنے مضمون کی ایک واحد اور منفرد کانفرنس تھی۔عورت اور تاریخ ہی کی طرح____ ''تاریخ اور عوام'' کانفرنس میرے علم کے مطابق پاکستان میں پہلی ایسی علمی ادبی کانفرنس تھی جو تاریخ کے حوالے سے عوام کے کردار و عمل کے بارے میں دیکھنے میں آئی تھی۔ان تمام نئی باتوں کو ایجاد کرنے کے موجد پاکستان کی



تاریخ میں ڈاکٹر مبارک علی ہی ہیں۔

یورپ کے ممالک میں تاریخ پر بہت کام کیا گیا ہے۔یورپ میں عالمی تاریخ انگریزی زبان میں تحریر کی گئی تھی۔جس زبان سے ایشیائی اقوام کی بہت کم تعداد واقف تھی۔پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں اردو زبان میں تاریخ کا شائع کیا جانا بلاشبہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے مفکر فلاسفر اور دانش ور تاریخ دان کا ہی کام تھا۔

''تاریخ اور عوام'' کانفرنس انتہائی الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت جامع انداز میں کہا تھا کہ ایک طویل عرصے تک تاریخ پر اہلِ اقتدار اور حکمرانوں طبقوں کا تسلط رہا ہے جس کی وجہ سے عوام کو اس سے خارج رکھا گیا۔موجودہ دور میں تاریخ میں ان گم شدہ عوام کی اہمیت کو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔انہوں نے کہا کہ ان گم شدہ لوگوں کو واپس تاریخ میں لانے کے لئے مورخوں کو بھرپور جدوجہد کرنی چاہئے، اور تاریخ کے ان ماخذوں کو تلاش کرنا ہوگا۔واضح رہے کہ ڈاکٹر مبارک علی عوام کو تاریخ کے ماخذ قرار دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تمام محنت اور عرق ریزی اور انسان پرستی اور عوام دوستی کی دانش و فکر ہم پر ثابت کرتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی ایک دانش ور اور تاریخ دان ہونے کی حیثیت سے خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی ذات باقاعدہ ایک انسٹی ٹیوشن ہے۔وہ اپنی ذات میں تاریخ اور علم و ادب کے ایک معلم ہی نہیں ہیں بلکہ ایک مکتب اور ایک اسکول آف تھاٹ ہیں۔ایک مدرسہ ہیں بلکہ ایک کالج اور یونیورسٹی ہیں۔ایک سنجیدہ فکر انسان ہیں اور بڑے منظم انسان ہیں۔

وہ ایک راست گو اور حقیقی انسان ہیں۔میں ان کو حقیقی انسان (Rational) ریشنل انسان کے معنوں میں تحریر کر رہا ہوں۔وہ بہت عمدہ آدمی ہیں۔

وہ اپنے تعلقات میں اپنے میل ملاپ میں اپنی گفتگو میں اپنے مراسم میں بہت صاف بہت سنجیدہ اور بڑی سادگی کے حامل ہیں۔وہ اپنے تعلقات میں کسی قسم کی کوئی بناوٹ اور ملاوٹ نہیں رکھتے۔اس معاملے میں وہ بہت معصوم انسان ہیں۔وہ دنیاداری اور عام لوگوں کی ہیرا پھیری سے بالکل مبرّہ انسان ہیں۔کسی قسم کی ریاکاری کا ان کی ذات میں شائبہ تک نہیں ہے۔

ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان سے ملنے والا ہر انسان راست گو ہو۔دوسرا وہ جس طرح تاریخ کے بارے میں سیاست کے بارے میں علم و ادب کے بارے میں فکر و فلسفہ کے بارے انسانی مبادیات کے بارے میں خود سوچتے ہیں دوسروں کو بھی چاہتے ہیں کہ انہی کی طرح سوچیں اور انہی کی طرح بات

کریں۔ یہاں آ کر ان کا لوگوں کے ساتھ کچھ اختلاف یا بگاڑ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں وہ غلط ہرگز نہیں ہیں۔ مگر ان کی ذات کا ایک ایکسپشنل ہونا ایک مخصوص نوعیت کا حامل ہونا ہے۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات ہر انسان میں ہرگز نہیں ہوا کرتیں۔

ڈاکٹر مبارک علی جیسی شخصیتیں اپنی ان اعلیٰ خداداد یا فطری خصوصیات کی وجہ سے زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے علم و مقام حکمت و فلسفہ اور بود و باش میں فطری اعتبار سے خود کفیل ہوا کرتی ہیں۔ جبکہ عام لوگوں کو زندگی کے معاملات میں بڑی جمع تفریق کرنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں اور طالب علموں کو اس جمع تفریق کی اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ اجازت ہی نہیں ان کی جمع تفریق کو گوارا نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے اکثر لوگ ڈاکٹر صاحب سے بدکنے لگ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کھچنے لگ جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ کچھ لوگ ڈاکٹر صاحب کے مخالف بھی ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت بالکل نہیں سو فی صد سقراط سے ملتی جلتی ہے۔ ایتھنز کے تمام قابلِ ذکر طبقوں کے نمائندہ لوگوں سے سقراط کا اختلاف دشمنی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ لوگ ان کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ اس قسم کی صورتِ حالات میں افلاطون کے چچازاد بھائی ''گلاکون'' نے سقراط سے کہا کہ آخر تم ہر شخص کو اپنا دشمن کیوں بنا لیتے ہو۔ افلاطون سقراط کا شاگرد تھا اس کا یہ چچازاد بھائی گلاکون ایک نام نہاد قسم کا سیاست دان تھا ایک ٹوڈی قسم کا سیاست دان تھا۔ ہر اقتدار حکومت میں شریک رہتا تھا۔

سقراط کا جواب تھا کہ لوگ حقائق سے منہ چراتے ہیں، حقیقت سے خوف کھاتے ہیں۔ علم و تجسس اور تحقیق و عمل سے عاری ہیں۔ ان کا علم ان کی معلومات بے معنی ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ میں ان کی زندگی کو بامعنی اور بامقصد دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان عالموں کی مکاری اور عیاری کا پردہ چاک کرتا ہوں۔ یہ میرے خلاف ہو جاتے ہیں۔

یہ بے مقصد اور بے عمل زندگی گزارتے ہیں۔ یہ جاگتے ہوئے بھی سو رہے ہوتے ہیں۔ سقراط بے شعور انسان کو سویا ہوا انسان خیال کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں ان سوئے ہوئے لوگوں کو جگانا چاہتا ہوں۔ میں بھڑ مکھی کی طرح اپنے دلائل سے ان کے جسموں پر ڈنک مارتا ہوں۔ یہ سٹ پٹا کر اٹھتے ہیں اور مجھے اپنی بے شعوری جس کا نام یہ نیند دیتے ہیں اس میں خلل ڈالنے والا گردانتے ہوئے میرے خلاف ہو جاتے ہیں۔

گلاکون نے کہا کہ تم ایسا کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ سقراط نے کہا ایسا کرنا میری فطرتِ ثانیہ



ہے۔ میں غیر فطری انسان نہیں بن سکتا اسی طریقے سے ڈاکٹر مبارک علی صاحب جب نظریہ پاکستان قائداعظم اور علامہ اقبال پر اپنے تاریخ و فلسفہ کی تحقیق کے مطابق بات کرتے ہیں۔ یا مذہب کے حوالے سے کوئی بات کہتے ہیں تو تمام وہ لوگ جو اپنی پسند کو عقیدہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں جن کو راسخ الفکر کہا جاتا ہے۔ جو ایک ہی جگہ پر ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

یا ایسے لوگ جو معاشرے میں کسی تبدیلی کا شعور نہیں رکھتے وہ ان سے اتفاق نہیں کرتے۔ اب اس میں ڈاکٹر صاحب کا کیا قصور ہے جبکہ تبدیلی ہی انسانی زندگی کا اصل محرک ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ڈاکٹر صاحب خود کو عقلِ کل خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک بار تحریر کیا تھا کہ تاریخ سے انسان کچھ نہیں سیکھتا۔ ان کا یہ خیال اس عام محاورے کے مطابق تھا کہ انسانی تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس بات کی خود ہی اصلاح کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ

ایسا نہیں ہے کہ لوگ تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے انہوں نے کہا تھا کہ تاریخ کے بغیر مستقبل کے سفر کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام باتیں میں ڈاکٹر کی محبت میں تحریر کر رہا ہوں۔ وگرنہ میں ان کا کوئی محقق نہیں ہوں۔ میں ان کا ایک طالب علم ہوں ان کے ساتھ محبت کرنے والوں میں سے ہوں۔ تاریخ چونکہ ماضی کی ہی داستان ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب ماضی کو سرے سے رَد نہیں کرتے مگر وہ ماضی کو انسانی تجربات کا نچوڑ رکھتے ہوئے مستقبل کی بات کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''تاریخ کی آواز'' میں کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو قومیں ماضی کے بوجھ سے آزاد ہوتی ہیں وہ آگے کی جانب دیکھتے ہوئے تیزی سے ترقی کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پیش نظر تابناک مستقبل ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کرتی ہیں۔

ان کے مقابلے میں جو قومیں ماضی سے لگاؤ رکھتی ہیں۔ وہ ماضی کی شان و شوکت میں کھوئی رہتی ہیں۔ وہ مستقبل کی جانب نہیں دیکھتیں۔ وہ اپنی تمام توانائی ماضی کی تشکیل میں ضائع کر دیتی ہیں۔ وہ روایات سے علیحدہ نہیں ہوتیں۔ ان کو نئی ایجادات تخلیق کرنے کا خیال نہیں آتا۔ یہ تحقیق کے بجائے تقلید میں غلطاں رہتی ہیں۔ ان کی زندگی کا نئی اور قدیم روایات کے درمیان تصادم رہتا ہے۔

اس کی مثال وہ امریکہ کے صدر تامس جیفرسن کی اس بات سے دیتے ہیں کہ امریکہ کے زمانہ حال کو ماضی سے اس طرح آزاد ہونا چاہئے جس طرح امریکہ جغرافیائی طور پر یورپ سے علیحدہ ہے۔ اس نے ماضی کے بارے میں کہا تھا کہ مردہ لوگوں کو یہ اجازت نہیں دینی چاہئے کہ وہ زندہ لوگوں پر حکومت کریں۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ماضی صرف استحصالی طبقوں کے لئے شاندار ہو سکتا

ہے۔ زیر دست طبقوں کا ماضی نہ تو شاندار ہوتا ہے نہ ہی خوشگوار ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے مورخ کی بات کی مثال دیتے ہوئے تحریر کیا جس نے کہا تھا زمانہء حال کو ماضی سے دور رہنا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں جب قومیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں تو اعلیٰ اقدار پروان چڑھتی ہیں۔ جب زوال پر ہوتی ہیں پستی کی طرف گامزن ہوتی ہیں ماضی میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ تاریخ کو پڑھنے کا کیا فائدہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسانوں کے ذہن کو بدلنے اور سماج میں تبدیلی لانے کے عمل کو پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ مارکسی نقطہء نظر کے مورخ ہیں۔ وہ ایک نصابی تاریخ رقم کرنے والے تاریخ دان نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں اور عام تاریخ دانوں میں فرق یہ ہے کہ عام تاریخ دان صرف واقعات بیان کرتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب صرف تاریخ کے واقعات ہی بیان نہیں کرتے وہ تاریخ کے ان واقعات کے محرکات بھی بیان کرتے ہیں وہ اپنی تاریخ نویسی سے لوگوں کی جدلیاتی تعلیم کرتے ہیں۔

وہ سقراطی انداز میں اپنی کتاب ''تاریخ کے بدلتے نظریات'' میں خود ہی سوال کرتے ہیں۔ سیکولر ازم کیا ہے پھر جواب میں تحریر کرتے ہیں کہ سیکولر ازم کا مطلب ہے کہ وہ سماجی عمل کہ جس کی وجہ سے مذہبی اثر ورسوخ جو معاشرے پر ہوتا ہے اس سے ذہنوں کو آزاد کرایا جائے، اور مذہب کو انسانی زندگی میں نجی حیثیت دی جائے۔

وہ اس لئے کہ مذہب انسان کو پابند کرتا ہے کہ وہ پیدائش سے لے کر موت تک مذہبی رسومات میں گرفتار رہے۔ مذہب انسان کو اس بات کی آزادی نہیں دیتا کہ وہ سماج کے معاملات کو عقل اور زمانے کے تقاضوں کی بنیاد پر طے پائے مذہب انسان کو عقل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس قسم کی ذہنی صورتِ حال میں انسان کی تمام تخلیقی صلاحیتیں بھسم ہو جاتی ہیں۔ انسان زندگی کے عمل سے ہی باہر ہو جاتا ہے۔ وہ سائنس، آرٹ، موسیقی، ریاضی، شاعری، فلسفہ، فنِ تعمیر اور تمام علوم وفنون سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

لہٰذا سیکولر ازم انسان کی آزادی اور معاشرے کو آگے بڑھانے کے لئے مادی ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔ معاشرے میں صحت مند اقدار پیدا کرتا ہے۔ انسانی نفرتوں کو ختم کرتا ہے۔ انسانی معاشرے کو ایک بین الاقوامی معاشرہ بناتا ہے، اور اس کو ہر نوع کے استحصال سے پاک صاف کرتا ہے۔ انسان کو ایک وسیع المشرب اور وسیع الخیال بناتا ہے۔ قدامت پسند لوگ سیکولر ازم کو کفر کہتے ہیں۔ جو ایک انتہائی غلط بات ہے۔ سیکولر ازم ایک علم ہے اور علم کبھی کفر وغیرہ نہیں ہوتا۔



عام طور پر تاریخ کا معاشرے کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور نہ تاریخ دان یا مورخ معاشرے کا کوئی مصلح ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کا تعلق ماضی کے واقعات سے ہوتا ہے۔ ماضی کے کسی بھی غلط واقعہ کی اصلاح وغیرہ نہیں کی جا سکتی۔ میری نظر میں ڈاکٹر صاحب پاکستان میں ایسے پہلے مورخ ہیں جنہوں نے تاریخ کو انسانی زندگی کی اصلاح کا مضمون بنا دیا ہے۔

وہ انسانی معاشرے میں جدید تبدیلیاں پیدا کرنے کے خواہاں ہیں۔ ان کی تاریخ دانی ایک مقام پر پہنچ کر معاشرے کے لئے ایک اقتصادی اور معاشی ترقی کا ایجنڈا بن جاتی ہے۔ ایک منشور بن جاتی ہے۔ اس قسم کا معاشی فلسفہ ہمیشہ سوشلسٹ انقلابی رہنماؤں کے اقتدار میں دیکھنے میں آیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب پاکستانی معاشرے پر اپنی تحریر کی گئی ایک مختصر سی کتاب میں استحصالی معاشرے کی جعلی قسم کی حکمرانوں کی فلاح و بہبود کے پروگرام کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عوام کی اصلاح کی اصلی تبدیلی کے عمل کو روکنے کے لئے یعنی انقلابی تبدیلی کو روکنے کے لئے جو تبدیلی ہمہ گیر تبدیلی ہوتی ہے۔ ریاست اور حکمران اور استحصالی طبقوں کی جانب سے عوامی فلاح و بہبود کا کھوکھلا نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔

جس میں ریاست خیرات وصدقہ کے نام پر ایک معمولی رقم غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کرتی ہے وہ اس بے معنی پروگرام کی زندہ مثال پاکستان میں آجکل کی وفاقی حکومت کی بے نظیر انکم سپورٹ سے اور صوبہ پنجاب کی سستی روٹی سے دیتے ہیں۔ جن اسکیموں سے نہ تو غربت کا خاتمہ ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرے میں خوشحالی آتی ہے بلکہ یہ اسکیمیں بدنظمی کا شکار ہو کر اپنی اہمیت کھو جاتی ہیں۔ اسی طریقے سے ریاستی حکمران اور امراء اپنی نیک نامی اور شہرت حاصل کرنے کے لئے غریب لوگوں کے لئے لنگر کا نمائشی انتظام کرتے ہیں۔ لوگوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے کھانا دیا جاتا ہے۔ لوگوں کی عزتِ نفس کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ ان کو محنت کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا جاتا۔ وہ زندگی کی جدوجہد سے عاری بن جاتے ہیں۔ لوگ ایک طرح سے ایک حیوانی سطح پر آجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب کے چند شہروں میں بحریہ ٹاؤن کے ملک ریاض کا لنگر کوئی کہے کہ انسانی شرف کا حاصل ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب انسانی معاشرے میں انقلاب کے عمل کے بارے میں کہتے ہیں کہ لوگ کسی لیڈر کے انتظار میں رہتے ہیں کہ وہ آئے اور انقلاب لائے جبکہ یہ ایک غیر انقلابی عمل کی بات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انقلاب فرانس میں بہت پہلے عملی حصہ پیرس کے عوام نے لیا تھا۔ جب ایک مرتبہ عوامی طاقت نے ریاست کی طاقت سے ٹکر لے لی تو اس کے بعد انقلاب کے رہنما سامنے آئے تھے۔ اس لئے انقلاب پہلے آتا ہے رہنما بعد میں آتے ہیں۔ جو انقلابی صورت حال کو منظم کرتے ہیں۔ انقلاب میں

ذرائع پیداوار اور طبقاتی کش مکش سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ عوامی انقلاب اور پاکستانی معاشرے میں معاشی ترقی کی اور قومی معیشت کی یہ وہ باتیں ہیں جو پاکستان میں سیاست دان اور حکمران ہرگز نہیں کرتے جن باتوں کو ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کے حوالے سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ جو ایک نئی بات ہے۔

حکمرانوں کا معروف قدردان دانش ور میکاولی جس کو ایک عیار اور سفاک انسان خیال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اُس کا ذکر تعریف کے انداز میں کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ میکاولی نے تاریخ کو ایک سیکولر نقطہ نظر دیا۔ اس نے تاریخ کو مذہب اور اخلاق سے آزاد کرایا، اور اس کو سائنسی بنیادیں فراہم کیں۔ بقول ہیکلس میکاولی نے بتایا کہ انسان کیا ہے۔ جبکہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کو کیا ہونا چاہئے۔ میرے نزدیک میکاولی کا حکمرانوں سے ہی تعلق تھا اس کا عوام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب تاریخ اور انسانی شعور کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ تاریخ زمانہ قدیم سے لے کر زمانہ حال تک جو تبدیلیاں اور تغیرات ہوئے ہیں ان سے ایک ایک کر کے پردہ اٹھاتی چلی جاتی ہے۔ جس سے انسانی ذہن روشن ہو جاتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کو تاریخی شعور کہا جاتا ہے اور اسی شعور کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں سے نفرت تعصب تنگ نظری دور ہو جاتی ہے اور انسان روشن خیال بن جاتا ہے۔

## مسئلہ قوم پرستی

ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کی روشنی میں قوم پرستی کے مسئلے پر بڑی مفید اور سیر حاصل بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں چار قومیں ہیں جو اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنا تمدن، ثقافت، نسلی ہم آہنگی اور جغرافیائی حدود کی بنیاد پر اپنی شناخت بنائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ہے کہ قوم پرستی کے جذبات مثبت اور منفی دونوں قسم کے عمل کو موثر بناتے ہیں۔

وہ مثبت قوم پرستی کے بارے میں کہتے ہیں کہ قومیں ان جذبات کے تحت آزادی کی جنگ لڑتی ہیں۔ سامراج کے خلاف جدوجہد کرتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف جہاد کرتی ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کے لئے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ منفی قوم پرستی میں قوم پرستی کے جذبات کو انتہا پستی تک لے جایا جاتا ہے۔ نسلی برتری کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ تہذیبی فضیلت کو ذہنوں میں راسخ کیا جاتا ہے، اور ایک سطح پر جا کر یہ تمام



جذبات فاشزم اور صیہونیت کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

اب وہ قوم پرستی کی وضاحت کرتے ہوئے پاکستان میں قوم پرستی پر تحریر کرتے ہیں کہ پاکستان میں قومیت کی تحریکیں کون سا کردار ادا کر رہی ہیں اور ان کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ پاکستان میں ابتداء ہی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ مذہب کی بنیاد پر ایک قوم کا تصور پیدا کیا جائے۔ جبکہ پاکستان ایک ملک ہے ایک قوم نہیں ہے۔ پاکستان میں قومیتوں کے جذبات اور تحریکوں کی ابتداء کرکے وسیع اختیارات کی وجہ ہوتی ہے۔ پاکستان میں پنجاب کے حکمران طبقوں نے فوج اور بیوروکریسی نے اقتدار اور پیداواری وسائل پر صنعت وحرفت پر مکمل قبضہ کر لیا۔ چھوٹے صوبوں کے عوام کو اپنے اقتدار میں شریک ہی نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے قوم پرستی نے سر اٹھایا تھا۔

مگر پاکستان میں مفاد پرست حکمران طبقے قوم پرستی کو اپنے سیاسی مفادات اور اقتدار کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

قوم پرستی کی تحریک میں ان نعروں کو استعمال کیا جاتا ہے جس کا عوام کے بنیادی مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عوام کی غربت بے روزگاری مفلسی ناداری اور پسے ہوئے طبقوں کی فلاح و بہبود کے بجائے بحرانی اور وقتی مسائل کو ابھارا جاتا ہے۔ اس طریقے سے قوم پرستی کا نعرہ استعمال کرنے والے صوبوں کے حکمران، جاگیردار، سردار، وڈیرے مرکزی حکومت سے مراعات حاصل کر کے اس کے ساتھ مصالحت کرتے رہتے ہیں۔ جس میں عوام کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔

اس طرح کی حکمرانہ رجعت پسندی کے مفادات کی وجہ سے قومیتوں کی تحریکیں پاکستان میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کرتیں۔ جب تک طبقاتی کش مکش کے ذریعے عوام کے حقوق کی جنگ نہیں کی جائے گی۔ اس وقت تک ملک اور معاشرے کے نظام میں تبدیلی نہیں آسکے گی۔ پاکستان میں مصیبت یہ ہے کہ بلوچستان میں قوم پرستی کے نعروں سے بلوچستان کے قبائلی سرداروں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ سندھی قوم پرستی کا تمام فائدہ سندھ کے جاگیرداروں، وڈیروں، پیروں اور میروں کو پہنچایا ہے۔

اسی طریقے سے مہاجروں کی لسانی شناخت کی قوم پرستی کا فائدہ ان کے ایک مخصوص سیاسی گروہ کو پہنچتا ہے۔ صوبوں کی خودمختاری سے بھی صرف اس حکمران کلاس کو فائدہ ہوتا ہے۔ صوبوں کے عوام کا ان کے اقتدار میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ صوبوں کے یہ حکمران طبقے اپنی سیاست کو مقبول بنانے کے لئے اور ان میں طاقت پیدا کرنے کے لئے اپنی ثقافتوں اور اپنی تہذیب کے دل کش اور خوش کن نعرے لگاتے ہیں، اور غریب عوام کو ان کی زندگی کے اصل مسائل سے غافل بنا کر ان کو قوم پرستی اور ثقافت

کے نشہ میں مبتلا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ہر قوم میں اور ہر کلچر میں دو قومیں اور دو کلچر ہوتے ہیں۔ ایک اوپر والے حکمران طبقے کا کلچر اور قوم ہوتی ہے دوسری نیچے غریب عوام کی ایک قوم اور ان کی غربت کا کلچر ہوتا ہے۔ مگر قوم پرستی کی تحریکیں چلانے والے حکمران صاحبِ املاک اور زمین کے مالک ہوتے ہیں۔

جاگیردار اور برسرِ اقتدار سردار اور مراعات یافتہ لوگ قوم پرستی کی تحریک میں استحصالی نظام اور اداروں اور استحصالی روایات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔ غریب عوام کی بدحالی کی کوئی بات نہیں کرتے۔ اپنی ثقافتی اقدار کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ ثقافتی اقدار کی شان و شوکت کی بات کرتے ہیں۔ جاگیرداری وڈیرہ شاہی اور سرداری کو اور اپنی پیر پرستی کو اپنے مزاروں کے عرس کو ان کی سجادہ نشینی کو خاندانوں کی شرافت کو ان کی فضیلت کو مشائخ پرستی کو عوام کا ثقافتی ورثہ قرار دیتے ہیں۔

اس طریقے سے اپنے تمام استحصالی نظام کو عوام میں مقبول بنانے کی سازش کرتے ہیں۔ جس کا عوام کی ترقی اور خوشحالی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک وڈیرے جاگیردار کی زندگی اور اس کی ثقافت کا ایک کھیت مزدور کی زندگی کی ثقافت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام شہری کا اس قوم پرستی کی سیاست میں کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ اس طریقے سے قوم پرستی کی سیاست ایک استحصالی سیاست کی شکل اختیار کر جاتی ہے جو محض ایک دھوکا اور ایک سراب ہوتی ہے۔

## تاریخ اور دانش ور

میں نے ڈاکٹر مبارک علی پر اپنی تحریر کا عنوان ہی ''خرد افروزی'' رکھا تھا۔ ان کو خرد افروزی کا مورخ کہا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں اس انسان کو دنیا کا سب سے بڑا انسان تسلیم کیا گیا ہے جو انسان انسانوں کے لئے عقل و خرد کا کام کرتا ہے۔ جو انسانوں کی تعلیم کرتا ہے انسانوں کے لئے خرد افروزی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ انسانوں کو سوچنے اور سمجھنے کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ہر کتاب میں مختلف انداز میں انسانوں کی روشن خیالی میں اضافہ کرتے ہیں۔

ان کی ہر کتاب کے نام اور عنوان میں ہی خرد افروزی کا جوہر جھلک رہا ہوتا ہے۔ ان کی کتاب تاریخ اور دانش ور تو مکمل طور پر ذہنی کوشش سے اس کام کے لئے تحریر کی گئی ہے اس کے علاوہ ان کی کتاب تاریخ کے بدلتے نظریات میں انہوں نے یہی بات تاریخ اور روشن خیالی کے عنوان سے نہایت وضاحت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قوموں اور انسانوں میں روشن خیالی اور خرد افروزی کا
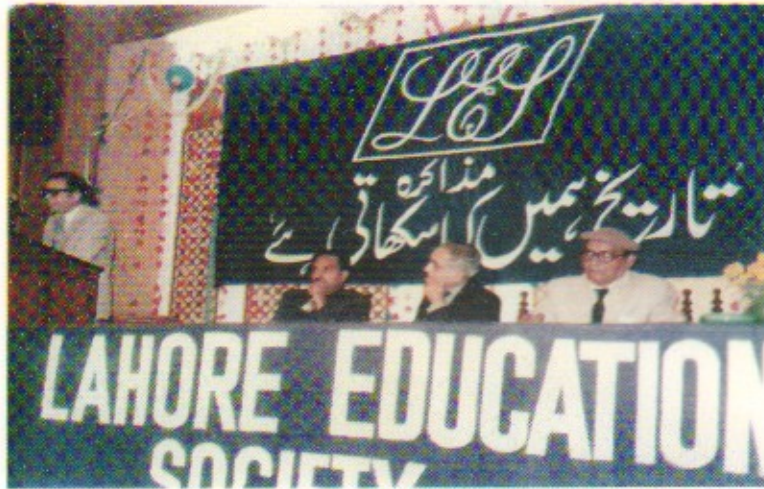
مذاکرے میں تقریر کرتے ہوئے

فرید (بھتیجا) اور اس کی فیملی کے ساتھ

شہلا کے ساتھ

عطیہ کے ساتھ

ناظر محمود اور صنوبر کے ساتھ
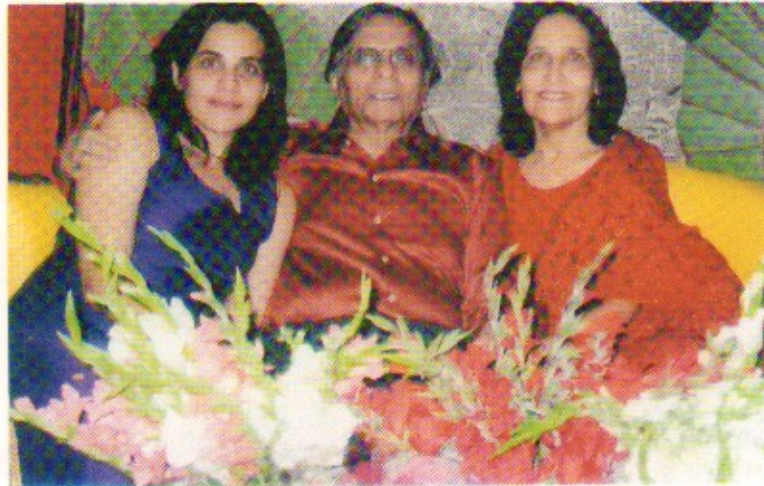
حمزہ علوی کے ڈرائنگ روم میں

مجسمہ ساز اعجاز ملک کے ساتھ
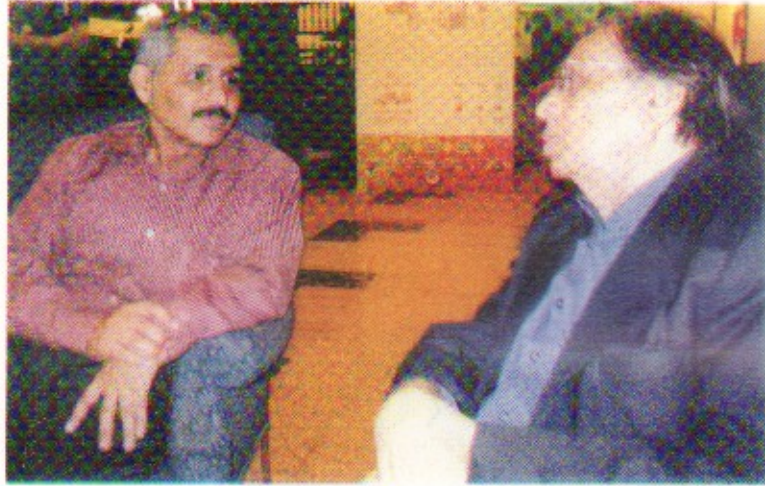
ڈاکٹر ریاض احمد شیخ کے ساتھ

ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ احمد اور ابوالفضل کے ساتھ

تسنیم صدی کے ساتھ

حفیظ کنبر کے ساتھ

نیویارک میں شہلا (بیٹی) کے ساتھ

ایمسٹرڈیم۔ ترکی کے دوست علی کے ساتھ

انور کمال کے ساتھ۔ موہنجودڑو میں

ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ احمد (راجہ) عطیہ کی پہلی سالگرہ پر

موئنجودڑو میں رضی عابدی کے ساتھ

ممبئی میں ہونے والی ایک کانفرنس میں

گلزار اور بیٹی عطیہ کے ساتھ

اورینٹل کالج لاہور کے مباحثہ میں پہلا انعام جیتنے پر

پکنک مناتے ہوئے

لندن۔ ہوسٹل کے کمرے میں

کام دانش وروں نے سرانجام دیا ہے۔

دنیا میں یہ دانش ور ہی تھے۔ جنھوں نے انسان کے ذہن میں سوال پیدا کیا کہ ''انسان کیا ہے'' ــــــ اس کا معاشرے میں کیا مقام ہے۔ ''سماج اور فطرت'' میں کیا تعلق ہے۔ نظریات وخیالات کیوں پیدا ہوتے ہیں، اور کیوں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہ کائنات کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ فرماتے ہیں جب یہ سوالات انسانوں کے ذہنوں میں آگئے تو کائنات انسانوں کی مٹھی میں آگئی۔ ان کا کہنا ہے کہ ان سوالوں کا جواب سب سے پہلے یورپ کے دانشوروں نے دینا شروع کیا۔

ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ یوں تو مذہب کا غلبہ دنیا میں ہر طرف ہی تھا مگر یورپ میں چرچ کا غلبہ بہت زیادہ تھا۔ یورپ کے تمام تعلیمی ادارے چرچ کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ جس نے انسان کے تخلیقی ذہن اور صلاحیتوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی فکر وشعور کے تمام دروازے بند کر رکھے تھے۔ ان پر قدغنیں اور پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ علم وتعلیم کا مقصد انسان اور سماج کی خدمت نہیں تھا بلکہ چرچ کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔

یورپی دانش وروں نے معاشرے میں ایک ایسے سماجی عمل کا آغاز کیا جس کے ذریعے مذہبی عقائد کا ذہن اور دماغ سے غلبہ ختم کرنا مقصود تھا۔ انہوں نے ریاضی کے اصولوں سے اور طبقاتی علوم کے ذریعے توہمات کو توڑا۔ انسانوں کے ذہنوں سے وہمات کی دھند کو صاف کیا اور یورپ کا معاشرہ اس گھٹن سے نکل کر آزاد فضا میں آگیا۔ لوگوں نے انسانیت کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔

دانش وروں نے عیسائی قوم اور غیر عیسائی قوم کا فاصلہ ختم کرنا شروع کردیا۔ جس طریقے سے ''والٹیر'' نے کہا تھا۔ ہمیں دوسری تہذیبوں کو اپنے نقطہ نظر سے نہیں دیکھنا اور پرکھنا چاہئے۔ یہ اس سلسلے میں ایک کارآمد بنیادی سوال تھا جس نے یورپ میں لوگوں کے ذہن اور تاریخ کے مطالعہ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ جرمنی کے مشہور مورخ ''ہوئے زر'' نے کہا کہ عیسائیت کی سچائی ہر شخص کو اس کی بات تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ اس لئے کہ ہر مذہب کا اپنا مقصد ہوتا ہے اس کی علیحدہ سچائی ہوتی ہے۔

ان کی اس تعلیم سے لوگوں میں اور معاشرے میں ایک دوسرے کے موقف اور مذہب کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوئی اور لوگوں کی سوچ میں آفاقیت اور پھیلاؤ آگیا۔ روشن خیالی کے دانش وروں نے اپنی دیانت اور جرات کے ساتھ ایک تحریک کی شکل میں اظہار رائے اور عمل کی آزادی پر زور دیا، اور انسانی عقل کو تمام نظریات اور مذہب کو جانچنے کا معیار بنایا۔

دانش ور ''روسو'' نے مطلق العنانی کے اقتدار کی سیاست پر اپنی فکر کی کاری ضرب لگاتے ہوئے

ٹرافلگر اسکوائر پر حامد زیدی کے ساتھ

جرمنی (میونک) میں حسین، موئی کے ساتھ

بوخم (جرمنی) عطیہ کے ساتھ

بادشاہت کے اس تصور کو چیلنج کیا۔ جس میں بادشاہ صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے مطلق العنانی اور عوام کے درمیان ایک عمرانی معاہدے کی بنیاد ڈالی۔ جس کی وجہ سے عوام بادشاہوں کے سامنے ایک فریق کی شکل میں ایک قوت بن گئے۔ جس کی وجہ سے انسانی معاشرے میں جمہوری اقدار اور روایات کو فروغ حاصل ہوا۔

دانش وروں نے عقائد کی فرسودہ روایات کے حصار کو توڑ کر لوگوں کو سیکولر سوچ اور سائنٹیفک سوچ سے ہمکنار کیا جس کی وجہ سے یورپ میں ترقی کی راہیں ہموار ہوگئیں، اور روشن خیالی کی یہی سوچ آج پوری دنیا پر کارفرما ہے۔

ڈاکٹر صاحب اسی طرزِ فکر میں سوچتے ہوئے پاکستانی دانشور اور معاشرے پر بات کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ پاکستان کا معاشرہ اس وقت جس انتشار، افراتفری، اور ٹوٹ پھوٹ اور مذہبی انتہا پسندی کا شکار ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے دانش وروں کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ معاشرے میں ذہنی تبدیلی پیدا کریں۔ خصوصیت سے مذہبی جنونیت، بنیاد پرستی، تعصبات، توہمات اور تنگ نظری کے خلاف فکری جہاد کریں۔ اپنی علمی کاوشوں کے ساتھ معاشرے میں وسیع النظری اور برداشت کی قوت پیدا کریں، اور لوگوں کے ذہنوں کو اپنی روشن خیالی سے منور کریں۔ پاکستان میں ریاستی فکر کے سرکاری اور نیم سرکاری دانش ور لوگوں کے ذہن میں روشن خیالی کی فکر پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ریاستی طرزِ فکر کئی ایک حوالوں سے استحصالی طرزِ فکر ہوا کرتی ہے۔ پاکستان میں پہلے دن سے ہی اسلام اور نظریہ ریاست کو مقتدر طبقوں کے مفادات کے تحفظ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں آزاد خیالی اور روشن خیالی اور قوت برداشت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

اس استدلالِ فکر نے آج پاکستان کو ایک بند گلی میں لا کر کھڑا کر دیا۔ آج پاکستان کے دانش وروں کو چاہئے کہ وہ اپنے حکومت سے علیحدہ خود مختار تنظیمیں اور ادارے بنائیں۔ ادیبوں کو روزی اور روزگار کی فکر سے آزاد کرائیں۔ تاکہ دانش ور حضرات اپنی ذہنی آزادی کے ساتھ اپنا کردار ادا کریں۔

ڈاکٹر صاحب اس علم کو ترجیح دیتے ہیں جس کی بنیاد انسانی تجربات اور مشاہدات پر ہو۔ ان کی اس تعریف سے علم کسی ایک طبقے کی اجارہ داری میں نہیں رہتا۔ بلکہ علم ہر طبقے کا علم بن جاتا ہے۔ علم کی اجارہ داری ہمیشہ حکمران طبقے پیدا کیا کرتے ہیں۔ حکمران طبقے اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے ایسے دانش وروں اور مفکروں کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں جو مالی مفادات اور منفعت حاصل کرنے کے لئے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ان طبقات کے نظامِ اقتدار کو جائز قرار دیتے ہیں۔



اس حکومتی قبیل کے دانش ور حکمرانوں کے ''اسٹیٹس کو'' کو برقرار رکھنے کی تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں کو تبدیلی پیدا کرنے سے غافل بنا دیتے ہیں۔ ان کو حال میں مست بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کی دانش وری میں مذہبی اسکالر پیش پیش ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کو قسمتوں اور تقدیروں پر قائل کرتے ہیں۔ ان کو راضی بارضا رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں حقیقی دانشوروں کو ان کی رجعت پسندی کی عوام دشمنی سوچ کی مزاحمت کرنی چاہئے۔ ان کے علمی تقدس اور مذہبی استحصال کا پردہ چاک کر کے لوگوں کو حقائق کے علم سے آگاہ کرنا چاہئے۔ سچے دانش وروں کو ان ظلم وستم کے استحصالی جابرانہ حکومتی خیالات کو بے نقاب کرنا چاہئے۔ عوام کی رہنمائی کرنی چاہئے۔

اس لئے کہ حقیقی دانش وروں اور مفکروں کا کام لوگوں کو باشعور بنانا ہوتا ہے۔ ہم ان دانش وروں کو ہی عظیم دانش ور اور مفکر کہیں گے جو اپنے خیال وفکر سے سماج کو بدلتے ہیں، انقلابات کو پیدا کرتے ہیں، اور لوگوں کو جبر وتشدد سے نجات دلاتے ہیں اس کے ذہنوں کو آزادی عطا کرتے ہیں اس لئے کہ علم وہی حقیقی علم ہوتا ہے جو بنی نوع انسان کو طاقت دیتا ہو۔ جس علم کو زندہ علم کہا جا سکتا ہے۔

قارئینِ مضمون اس مضمون میں اب تک آپ جتنی باتیں پڑھ چکے ہیں ان باتوں کا تمام علم وفلسفہ ڈاکٹر مبارک علی سے ہی ماخذ ہے ان میں میرا فکر وعلم بہت کم تھا۔ میرے ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ دو رشتے ہیں ایک رشتہ علم کا ہے دوسرا محبت کا رشتہ ہے۔ میرے دن کا آغاز ڈاکٹر صاحب سے ہر روز فون پر بات کرنے سے ہوتا ہے۔ جن دنوں میں کالم نویسی کرتا تھا۔ میں جس موضوع پر کالم تحریر کرنا چاہتا تھا اس پر ڈاکٹر صاحب سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے کالموں کو استدلالی کالم کہا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ایک بے حد بافیض دانشور ہیں۔ وہ علم کی تقسیم کو صدقہ جاریہ خیال کرتے ہیں۔ ان کی یہ عادت دنیا کے ان تمام مثالی اور اثاثی دانش وروں مفکروں اور فلاسفروں سے ملتی ہے۔ جو دنیا کی تاریخ میں اَمر ہو چکے ہیں۔ ان کا طریقہء تعلیم سقراط، افلاطون اور ارسطو سے ملتا جلتا ہے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے اپنے مطب ہوا کرتے تھے اپنے مکتب ہوا کرتے تھے۔ جن میں ہر سطح کا ہر طبقے کا انسان شریک ہوا کرتا تھا۔ ان کا یہ علم وتعلیم کا سلسلہ ایک صدقہ جاریہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی معلمی اور تعلیم دانی کی کسی سے کوئی قیمت وصول نہیں کیا کرتے تھے۔ یہی طریقہ ڈاکٹر مبارک علی کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آجکل لاہور نیرنگ گیلری میں ہر ہفتہ کے دن گیارہ بجے سے لے کر تین بجے تک اپنی علمی بیٹھک کرتے ہیں۔ جس کو میں بزمِ ڈاکٹر مبارک علی کہا کرتا ہوں۔

ان کی اس بزم میں لاہور سے اور لاہور سے باہر سے علم کے پیاسے لوگ علم کے طالب عالم فاضل دانش ور مفکر ادیب شاعر مورخ تعلیم دان پروفیسر حضرات شرکت کرتے ہیں۔ ان شرکت کرنے والوں میں مجھ جیسا کم علم طالب علم بھی باقاعدگی سے شرکت کرتا ہے۔ ان کی اس بزم میں کسی مقام و مرتبے کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ کسی کا نامور ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ ان کی یہ محفل نہایت اور خالصتاً علمی محفل ہوتی ہے۔ ان کی محفل میں اکثر اوقات ایک علمی موضوع مقرر کیا جاتا ہے جس موضوع پر تمام اہل محفل کھل کر بات کرتے ہیں۔

اس طریقے سے ان کی یہ محفل ایک سقراطی انداز کی استدلالی مجلس بن جاتی ہے۔ یہ طریقہء علم بے حد موثر اور مصدق طریقہ ہوتا ہے۔ اس طریقہء علم سے انسان کے ذہن کی پرتیں کھل جاتی ہیں۔ علم کی تمام باریکیاں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ خصوصاً جب اس علمی اور استدلالی موضوع پر تمام لوگوں کی بحث کے بعد ڈاکٹر صاحب جب خود اظہار خیال کرتے ہیں تو مزہ آ جاتا ہے۔

اس طرح ہم لوگوں کو علم حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر مبارک علی سقراط کی طرح مفت میسر آتے ہیں۔ ان کے بات کرنے کا انداز بہت سادہ اور بہت شفیق انداز ہے۔ اس پر ان کے علم کی بہتات سونے پر سہاگہ ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی موضوع ہو یا علم کا کوئی شعبہ ہو ان کو اس پر پوری دسترس ہوتی ہے۔ ان کے دلائل میں سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات بغیر کسی دلیل نہیں کرتے وہ باقاعدہ اپنی بات کی تصدیق کے لئے کسی ایک بڑے مستند دانش ور مفکر تاریخ دان کے بات کی سند پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی واقعتاً ان دانش وروں میں سے ایک ہیں جن کو دانش ور مفکر مورّخ اور تاریخ دان اور فلسفی کہا جاتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ان کی عمر دراز ہو اور وہ ہماری تعلیم کرتے رہیں۔



# ڈاکٹر مبارک علی ـــ ایک منفرد تاریخ نویس

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

معروف تاریخ نویس ہاورڈ زن (Howard Zinn) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب A People's History of the United States امریکی تاریخ اور امریکی معاشرے کے عہد بہ عہد ارتقاء میں وہاں کے عام انسانوں کے تخلیقی اور تعمیری کردار کو بڑی جاں فشانی سے اُجاگر کیا ہے۔ اُس نے عوام کو تاریخ کا موضوع کیوں بنایا، اس کا جواب اس ضخیم کتاب کے آخر میں انگریزی کے معروف شاعر، شیلے کے ایک بند (Stanza) کی صورت میں دیا ہے۔ عام لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے شیلے کہتا ہے:

Rise like lions after slumber
In unvanquishable number!
Which in sleep had fallen on you—
Ye are many; they are few!

خواب راحت سے اٹھو دوستو شیروں کی طرح
اتنی تعداد میں اٹھو کہ جو تسخیر کبھی ہو نہ سکے
اور زمیں پر بھی یہ زنجیریں گرا دو اپنی
اُن فنا ہوتے ہوئے اوس کے قطروں کی طرح
جو کہ اِس نیند میں گرتے رہے تم پر پیہم
تم بہت ہو، وہ فقط چند ہیں مائل بہ ستم

یہاں عام انسانوں کے نام ایک شاعر کا جو پیغام ہے، اُس کو ایک تاریخ نویس اپنی کاوشوں کا

مقصد قرار دے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ عام انسان، عام لوگ کون ہیں؟ یہ عام لوگ وہ ہیں جو سماج کے انجن کو ایندھن فراہم کرتے ہیں، جو آفرینش کے آغاز سے آج تک ارتقاء پذیر تہذیب کے سب سے بڑے معمار ثابت ہوئے ہیں، جن کے خونِ دل سے کھیت سیراب ہوتے اور فیکٹریاں سونا اُگلتی ہیں، جن کے مُوئے قلم سے تصویرِ کائنات میں رنگ بھرتے آئے ہیں، لیکن پھر یہی وہ لوگ بھی ہیں، جن سے تاریخ ایک عرصہ اغماض بھی برتتی رہی ہے، اس نے اپنے صفحات ان کے لئے بند رکھے ہیں۔ البتہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں تاریخ نویس، خاص طور سے مغربی دنیا میں، ماضی کی اپنی اس بہت بڑی فروگزاشت کی تلافی پر بھی آمادہ ہوئے ہیں۔

ہم تو مغرب اور اہلِ مغرب کو ایک عرصے سے نظروں سے گرائے بیٹھے ہیں۔ کبھی ہم 'فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب' کا وِرد کرتے ہیں اور کبھی مغربی گمراہیوں کی تاریخ مرتب کرنے کا شوق پال لیتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ ہر تہذیب کی طرح مغربی تہذیب بھی خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ مغرب میں برس ہا برس سے ایسے تاریخ نویس سامنے آرہے ہیں، جن کی لکھی ہوئی تاریخ عام لوگوں کو، اور معاشرے کے ہر حلقے اور گروہ کو تحقیق کا موضوع بناتی ہے۔ پھر یہ تاریخ لوگوں کے معاشرتی شعور کو پروان چڑھاتی ہے، اُن کو صحیح اور غلط کے درمیان تمیز قائم کرنے میں مدد دیتی ہے، انہیں خوابِ راحت سے بیدار کرتی اور معاشرے کی تعمیر پر کمربستہ کرتی ہے۔ ہاورڈ زن جس صف میں کھڑے ہیں، اس صف میں ای۔ پی۔ تھامپسن (E.P.Thompson)، ایرک ہابس بام (Eric Hobsbawm)، کرس ہارمن (Chris Harman) اور بیسیوں دوسرے تاریخ دان بھی شامل ہیں۔ ان سب تاریخ نویسوں کی کتابیں سُلانے کی دوا نہیں بلکہ جگانے کی صدا ثابت ہورہی ہیں۔

ادھر اپنی طرف دیکھیں اور اپنی صفوں میں ایسے تاریخ نویس تلاش کریں جو ماضی کی تحقیق کے ذریعے مستقبل کے راستوں کی نشان دہی کرتے ہوں یا عام لوگوں کو اُن کی اہمیت باور کراتے نظر آئیں، تو دُور دُور تک کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس خانہ ویرانی میں بس ایک تاریخ نویس ہے جو پچھلے تیس، پینتیس سال سے لوگوں کو جگانے کی مہم میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی عوام کی تاریخ کو اُن تک پہنچانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ کام وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ تین عشروں سے زائد عرصے سے کر رہے ہیں۔ اُن کے کام کا اعتراف ہمارے یہاں کے روایتی تاریخ دانوں کے حلقے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اندر تو اتنا نہیں ہے، لیکن ان کی مشقِ ستم رائیگاں بھی نہیں گئی ہے، بلکہ جن لوگوں کے لئے وہ



لکھتے ہیں، ان تک ان کی بات پہنچی بھی ہے اور سمجھی بھی گئی ہے۔ پاکستان کے دُور افتادہ علاقوں، چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی ان کی کتابیں پہنچ چکی ہیں۔ خیبر پختونخوا میں مانسہرہ کی ایک عام سی مارکیٹ، اسٹیشنری کی دکان، پنجاب کے ریلوے اسٹیشنوں کے اخباروں اور رسالوں کے اسٹالوں پر، تربت میں پرچون کی دکان کی الماری کے ایک خانے میں، نواب شاہ کے ایک فٹ پاتھ پر اخباروں کے بنڈلوں کے برابر رکھی ہوئی، مبارک صاحب کی کتابیں میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ اُن کو پڑھنے والے اب ایک وسیع اور ملک گیر حلقے کی شکل اختیار کرچکے ہیں۔ پاکستان میں روشن خیالی اور جمہوری قدروں کا پیغام شعری پیکر میں جس طرح حبیب جالب کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچا، اسی طرح یہ پیغام تاریخی کتب کی صورت میں مبارک صاحب کے ذریعے پہنچ رہا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کوئی 70 سے زیادہ کتابیں تحریر کرچکے ہیں، جن میں موضوعات کے حوالے سے غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ماضی کے حالات و واقعات ہی پر اپنی تحقیق کے نتائج قارئین تک نہیں پہنچائے، بلکہ تاریخ نویسی کے مختلف رجحانات اور فلسفۂ تاریخ پر بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ مبارک صاحب نے 1980ء کے عشرے کے اوائل میں جو چیزیں شائع کیں، وہ اتنی بے سروسامانی کے عالم میں کی گئیں کہ اُن کے پاس اپنی کتابوں کی کتابت کروانے کے لئے بھی وسائل موجود نہیں تھے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر اور اپنے ہی خط میں کتابیں شائع کیا کرتے تھے۔ اُن کی تعلیم اور تدریس کا بیشتر وقت سندھ یونیورسٹی میں گزرا تھا، لیکن بدقسمتی سے یہ تعلق اُن کے لئے کچھ زیادہ مہربان ثابت نہیں ہوا، انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ایک صبر آزما معاشی جدوجہد سے بھی گزرنا پڑا۔ اس کے باوجود ان کا تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا اور اب اس سب کو بہ یک نظر دیکھیں تو نظریں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔ ستر سے زیادہ کتابیں، ہزاروں مضامین، 'تاریخ' کے نام سے شائع ہونے والے ایک مستند اور وقیع تحقیقی مجلّے کے 45 شمارے، تاریخ کے مختلف موضوعات پر پندرہ بیس قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد، اپنے مقالات کی پیش کش کے لئے ملک کے چپّے چپّے اور بیرونی دنیا کے اَن گنت دورے، یہ سب کچھ کسی غیر معمولی جذبے اور عزم ہی کا حاصل ہوسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ عزم اور جذبہ ہے کیا؟

مبارک صاحب کی زندگی بھی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ کچھ سال پہلے انہوں نے 'دَر دَر ٹھوکر کھائے' کے نام سے ایک سوانحی کتاب تحریر کی تھی۔ پھر ان پر ایک مقدمے کی آزمائش آئی تو ایک کتاب اس کے نتیجے میں وجود میں آئی اور اب انہوں نے 'میری دنیا' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے۔ ان

دو تین تحریروں کو بغور دیکھیں تو اُس جذبہ محرکہ تک رسائی مشکل نہیں رہتی جو مبارک صاحب کو کام اور مسلسل کام پر آمادہ رکھتا ہے۔ وہ شیلے کے الفاظ میں اوس میں لت پت قوم کو غفلت کے خواب سے بیدار کرنے اور تقلید کی زندگی سے نکل کر تنقید اور تعمیر کی وادیوں میں قدم رکھوانے میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کے کام کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا تو یہی کہ انہوں نے عام لوگوں کو جن میں طالب علم، سیاسی ورکرز اور محنت کش شامل ہیں، اپنا مخاطب بنایا ہے۔ عام لوگوں کے لئے لکھنے کا تقاضا تھا کہ وہ آسان عبارت اور سادہ فہم انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچائیں۔ اُن کو اب اس انداز پر اتنی قدرت حاصل ہو چکی ہے کہ وہ بہت سہولت کے ساتھ مشکل سے مشکل موضوع پر بہت آسان عبارت میں اپنی بات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کی تازہ ترین کتاب 'میری دنیا' بہت مبسوط اور گندھی ہوئی تحریر ہے۔ اس میں بعض بہت پیچیدہ تصورات کو بھی شاملِ گفتگو کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود کتاب کی روانی متاثر نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر مبارک علی کے کام کا دوسرا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ اُنہوں نے سلاطین، حکمران خاندانوں، محلات اور اُن میں ہونے والی جانشینی کی سازشوں کے بجائے معاشروں کو اور عام باشندوں کو تاریخ کا محور بنایا ہے۔ انہوں نے نجی زندگی کی تاریخ لکھی ہے، انہوں نے مختلف نسلوں، طبقوں، خواتین مختلف پیشوں یہاں تک کہ ڈاکوؤں اور ڈکیتی جیسے موضوعات کو بھی تحقیق کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ ہر چند کہ مغل دور اور مغل دربار اُن کی ابتدائی تحقیقات کا موضوع تھا، لیکن بعد کے برسوں میں انہوں نے بہت کچھ مغل عہد کے معاشرے پر بھی لکھا۔

ڈاکٹر مبارک علی کی علمی کاوشوں کا ایک تیسرا میدان خود تاریخ نویسی کا موضوع ہے۔ وہ عہد وسطیٰ اور جدید دور کی تاریخ کو خود تاریخ نویسوں کے اپنے رجحانات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا بہت فکر انگیز کام قومی اور قومیتی تاریخ نویسی کے بارے میں ہے۔ خاص طور سے قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد سرکاری سطح پر جس قسم کی تاریخ نویسی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، وہ ریاست کی نظریاتی ضروریات کی روشنی میں طے پاتی ہے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ ایرک ہابس بام نے اسی سیاق و سباق میں تاریخ نویسوں کو Functionaries Ideology یا نظریے کو فروغ دینے والے عملے سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر مبارک علی ایسے Functionaries میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے آزاد خیالی اور خرد افروزی کا راستہ منتخب کرتے ہوئے تاریخ کو حتی الامکان معروضی نقطہء نظر سے لکھا ہے۔ انہوں نے خاص طور سے پاکستان میں تاریخ نویسی کے مسائل پر بحث



کی ہے، چنانچہ ان کی کتابیں 'تاریخ کی آواز' اور 'تاریخ کی تلاش' میں ان مسائل اور رجحانات سے بحث کی گئی ہے جو پاکستان میں تاریخ نویسی کے حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ ان کا واضح موقف ہے کہ ہم نے تاریخ کو نظریے کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ملک میں تاریخ نویسی کے امکانات کو معدوم کر دیا ہے۔

مبارک صاحب کے کام کا ایک چوتھا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے صرف کتابیں نہیں لکھیں اور صرف مقالات پر انحصار نہیں کیا، بلکہ ایک عوام دوست اور وسیع النظر تاریخ کے مقاصد کے حصول کے لئے مختلف دائروں میں کام کیا ہے۔ 'تاریخ' کے نام سے انہوں نے جو جریدہ شائع کرنا شروع کیا، اس کو اب بارہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس دوران، اسی جریدے کے پلیٹ فارم سے وہ کئی موضوعاتی کانفرنسیں منعقد کر چکے ہیں، جن میں 'سندھ کی تاریخ'، 'پنجاب کی تاریخ'، 'نیشنل ازم'، 'استعماریت'، 'تاریخ اور عورت'، 'تاریخ اور عوام'، 'سماجی علوم کی صورتِ حال'، غرض ایسے ہی موضوعات پر مختلف زاویوں سے گفتگو کی گئی۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مبارک صاحب تاریخ نویسی کے ایک غیر سرکاری اور غیر متعصب تصور کے فروغ کے حوالے سے جو کام کئی سال سے کر رہے ہیں، وہ اب ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اُن کا حلقہء قارئین ملک کے طول و عرض میں پھیل چکا ہے اور طالب علموں اور تاریخ نویسی کی طرف آنے والے نئے لوگوں میں بھی اُن کے طرزِ فکر کو قبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ رجحان اگر یوں ہی فروغ پاتا رہا تو ہمیں اُمید رکھنی چاہئے کہ مستقبل میں ہم ماضی اور حال کے مقابلے میں زیادہ بہتر تاریخ پڑھ رہے ہوں گے۔ وہ دن جب بھی آیا، خواہ وہ ہماری زندگیوں میں آئے یا ہمارے بعد، پاکستان میں اچھی اور قابلِ اعتبار تاریخ پڑھنے والے، ڈاکٹر مبارک علی کے ضرور مشکور ہوں گے، جنہوں نے حکم عدولی میں پہل کی تھی۔

# ڈاکٹر مبارک علی اور دانشوری کی روایت

ایوب ملک

پاکستانی ریاست نے جب سے نظریاتی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس نے عوام دوست دانشوروں کے لئے بہت سی مشکلات کھڑی کردی ہیں کیونکہ اس میں دوسرے نظریات سے سیکھنے کا عمل ممکن ہی نہیں رہتا اور یوں نئے خیالات ونظریات معاشرے میں ظہور پذیر نہیں ہو پاتے اور قدامت پرستی کی جڑیں مزید گہری ہوتی جاتی ہیں۔ تقریباً یہی حال ایک زمانہ میں یورپی معاشرے کا بھی تھا جب چرچ اور ریاستی اداروں نے مل کر معاشرے کو پس ماندہ رکھا ہوا تھا لیکن وہاں شاعروں، دانشوروں، سائنسدانوں، ادیبوں، مصوروں اور دوسرے باشعور اور آگاہ لوگوں کا کردار ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ جن کی قربانیوں نے یورپین معاشرے کو قدامت پرستی سے آزاد کرایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر دانشور سنت سقراط کا امین ہوتا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

اس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں
ورنہ سقراط مر گیا ہوتا

فیض صاحب نے بھی سماجی تبدیلی کا محرک دانشوروں اور شاعروں کو ٹھہرایا ہے اور ایک جگہ لکھا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کے لئے صرف مشاہدہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ انہیں مجاہدہ بھی کرنا ہوگا۔ صاف ظاہر ہے سماجی تبدیلی کے لئے معاشرے کے سب سے زیادہ آگاہ طبقہ ہی کو قربانی دینا ہوگی۔ لاطینی امریکہ کے معروف انقلابی Jose Marty جس نے کولونیل پاور کے خلاف لوگوں کو منظم کیا، جنگ لڑی اور اگلی صفوں میں پہلی ہی جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا، وہ دراصل ایک شاعر تھا۔ پورے لاطینی امریکہ میں آزادی کے متوالوں میں Jose Marty کا نام سائمن بولیور Saimon Bolivier کے ساتھ آج بھی زندہ ہے۔



ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

مجھے پاکستانی معاشرے میں ڈاکٹر مبارک علی ریاست اور سوسائٹی کے جبر سے برسرپیکار نظر آتے ہیں۔ سن 2005ء کے اوائل میں جب ڈاکٹر صاحب امریکہ سے واپس آئے تو ان کے جہاز کو کراچی میں رک کر لاہور جانا تھا۔ مجھے اپنی سرکاری حیثیت میں ائیرپورٹ کے اندر جانے کی سہولت حاصل تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کراچی میں اتر جانے پر مجبور کیا جس پر وہ مجھ سے بہت ناراض ہوئے اور راستہ بھر کوستے رہے۔ میں ائیرپورٹ سے انہیں سندھ ہائی کورٹ لے گیا۔ جہاں ہمارے سینئر وکلاء احباب جن میں ڈاکٹر حسن ناصر کے ماموں مظہر جمیل، مسلم شمیم اور دیگر شامل ہیں نے ڈاکٹر صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کا اہتمام کیا۔ میں نے ان کو بتایا کہ لاہور ائیرپورٹ پر پنجاب پولیس ان کی گرفتاری کے لئے کھڑی ہے اور ہم انہیں ضمانت دلوائے بغیر لاہور جانے نہیں دیں گے۔ لاہور میں پچھلے کچھ دنوں سے مختلف تھانوں کی پولیس ان کے گھر پر چھاپے مار رہی تھی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف لاہور کے چار تھانوں میں مختلف ججوں اور وکلاء کی درخواستوں پر ایف آئی آر درج تھیں۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی کچھ کتابوں کو ریاستی اداروں اور ان کے پروردہ دانشوروں نے لاہور شہر کے تمام بک اسٹالوں سے غائب کر کے اس میں کچھ صفحات کا اضافہ کر دیا ہے۔ جن میں عدلیہ کو برا بھلا کہا گیا تھا بعض وکلاء نے ان ججوں کو وہ کتابیں پیش کی ہیں جس کے باعث ان لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کے خلاف پرچے کٹوانے کا بہانہ مل گیا۔ پولیس کے چھاپوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ شدید پریشانی اور تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

بہر حال ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کروا کر انہیں لاہور روانہ کیا اور پھر مختلف عدالتوں میں ڈاکٹر صاحب کی پیشیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں میں ایک عدالتی پیشی کا احوال ضرور لکھنا چاہوں گا۔ جب ایک گواہ نے ڈاکٹر صاحب کی ایک تحریف شدہ کتاب عدالت میں پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس گواہ سے پوچھا کہ تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے؟ اس کے جواب پر ڈاکٹر صاحب نے عدالت کو اصلی کتاب دکھاتے ہوئے بتایا کہ یہ کتاب میں نے گواہ کی پیدائش سے پہلے لکھی تھی۔ اس پر عدالت میں ایک قہقہہ لگا اور گواہ کا جھوٹ بھی سامنے آ گیا۔

اسی سلسلہ میں ایک دن جب میں ڈاکٹر صاحب کے گھر پر موجود تھا تو ایک ایس ایچ او کا فون آیا جو کہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو تھانہ میں حاضر ہونے کا کہہ رہا تھا۔ میں یہاں اس ایس ایچ او کے بعض جملے

نقل کر رہا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک دانشور کے خیالات کو ریاستی جبر کے ذریعے کس طرح تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایس ایچ او:

''اوڈاکٹر' اوے میں تینوں کنی واری بلایا اے۔ اوئے توں تھانے کیوں نہیں آوندا''

ڈاکٹر صاحب: ''جناب میری اس کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری ہو چکی ہے اور میں نے اپنا مفصل تحریری جواب آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا ہے''۔

ایس ایچ او:

''اوڈاکٹر میں سنیا اے توں سٹھ کتاباں لکھیاں نیں' اوے میں اس توں زیادہ ایف آئی آراں لکھیاں نیں اور جیہڑا گھیو سیدھیاں انگلاں نال نہیں نکلدا میں اوہنوں ڈنگیاں انگلاں نال وی کڈھ لیناواں''۔

یہ الفاظ اور دھمکیاں ڈاکٹر صاحب جیسے حساس طبیعت دانشور کے لئے کتنی گراں ہو سکتی ہیں۔ مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔

نجم سیٹھی نے اس دوران ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں ایک مفصل اداریہ لکھا کہ کس طرح تیسری دنیا میں ریاستی ادارے' دانشوروں کو اپنے نظریات کا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو گورنر ہاؤس بلوایا۔ گورنر ہاؤس جانے سے پہلے میں نے خاص طور پر ڈاکٹر صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ وہ گورنر کے سامنے اپنے نظریات کا پرچار نہ کریں بلکہ صرف ان مقدمات کو ختم کروانے کی کوشش کریں۔ اس موقع پر گورنر نے آئی جی پولیس کو بلوا کر پوچھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک دانشور' پروفیسر کے خلاف چار ایف آئی آر کٹی ہوئی ہیں جبکہ میرے اپنے گاؤں میں ایک قتل کے خلاف میرے کہنے کے باوجود ایک ایف آئی آر درج نہیں ہو سکی۔ آئی جی پولیس نے تمام تفصیلات معلوم کر کے گورنر کے سامنے پولیس کو ڈاکٹر صاحب کے خلاف مزید کارروائی سے منع کرنے کا وعدہ کیا۔ آئی جی کے جانے کے بعد گورنر نے ڈاکٹر صاحب سے مختلف موضوعات پر بات چیت کی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے میرے مشورے کے باوجود اپنے اوریجنل خیالات کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات سن کر گورنر بہت پریشان ہوا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کو ایک برادرانہ مشورہ دیا جو یہ تھا کہ ''ان خیالات کے ساتھ آپ پاکستانی معاشرے میں نہیں رہ سکتے اور یہ کہ وہ پاکستان سے چلے جائیں۔ ورنہ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے۔''

میں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا اثر سندھ اور بلوچستان میں جا کر دیکھا ہے۔ 90ء کی دہائی



میں ہم انہیں بلوچستان اور سندھ کے دور دراز علاقوں کے دورے پر لے کر گئے۔ بلوچستان میں ہم انہیں تربت اور گوادر لے کر گئے۔ ہمارے میزبان ڈاکٹر مالک صاحب تھے جو کہ خود بھی ڈاکٹر صاحب کے بہت معتقد تھے۔ میں محمود باویجہ اور ہدایت حسین بس کے ذریعے تربت روانہ ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کو ہوائی جہاز کے ذریعے روانہ کیا۔ مجھے آج بھی کراچی سے تربت کا وہ سفر یاد ہے جب ہم 24 گھنٹوں میں تربت پہنچے تو میں تقریباً نیم زخمی حالت میں تھا۔ ساری رات بس نے جس طرح سڑک نہ ہونے کی وجہ سے جھٹکے کھائے وہ صرف بلوچی عوام ہی برداشت کر سکتے تھے۔ سڑک نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور کئی دفعہ تو بس نے اتنے اونچے نیچے جھٹکے کھائے کہ میرا سر کبھی سامنے والی سیٹوں سے یا کبھی سیٹوں کے ساتھ لگے' لوہے کے پائپ کے ساتھ ٹکرایا۔ یہی حال باقی سواریوں کا بھی تھا۔ شاید بلوچوں کو اس کی عادت ہو گئی تھی لیکن ہم جیسے پہلی دفعہ بس سے بلوچستان کا سفر کرنے والوں کی حالت غیر تھی۔ میں راستے بھر سوچتا رہا کہ اس پاکستانی ریاست نے بلوچوں کو کیا دیا اور آج علیحدگی کی تحریک چل رہی ہے اس کی اہم وجہ یہی ریاستی جبر ہے۔ میرے خیالات کو اس وقت تقویت ملی جب تربت سے گوادر جاتے ہوئے ایک چیک پوسٹ پر ایک سپاہی نے ہمیں روک لیا۔ تمام سواریوں کو نیچے اتارا اور سب کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر مالک جو کہ دو تین دفعہ صوبائی وزیر رہ چکے تھے بالکل بے بس نظر آئے اور جب تک اس سپاہی نے اطمینان نہ کر لیا ہم وہاں سے ہل نہ سکے۔ جب ہم نے چیک پوسٹ کراس کی تو دوسری طرف دیکھا کہ بہت سی بلوچی عورتیں بیٹھی ہیں پتہ چلا کہ وہ جس گاڑی میں آئی تھیں سیکورٹی والے اس گاڑی پر راؤنڈ لگانے کے لئے گئے ہیں اور جب تک وہ واپس نہیں آئے گی یہ عورتیں یونہی ان کا انتظار کرتی رہیں گی۔ ڈاکٹر مالک نے بتایا کہ اس سیکورٹی چیک پوسٹ پر تمام پنجابی سپاہی ہیں جو کہ نفرت کا باعث بن رہے ہیں اور انہوں نے کئی بار اعلیٰ فوجی افسران سے کہا ہے کہ یہاں کم از کم بلوچی سپاہی ہی تعینات کر دیں جو ہماری تہذیبی روایات سے واقف ہوں اور یوں شاید پاک فوج سے نفرت میں کمی آ سکے۔ لیکن ان کی تجویز پر کبھی توجہ نہیں دی گئی۔

مجھے تربت' گوادر اور اندرون سندھ ڈاکٹر صاحب کو لے جانے پر اندازہ ہوا کہ وہاں نوجوانوں میں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوبے جو مرکز اور ریاست کے جبر کا شکار ہیں وہاں ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو بہت پذیرائی حاصل ہے۔ حالانکہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے کبھی بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی مخصوص علاقے یا لوگوں کیلئے لکھتے ہوں بلکہ وہ تو عوام میں تاریخی شعور کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے تربت کا ایک واقع یاد آ گیا جب لیکچر کے دوران خفیہ ایجنسی کے

بہت سارے لوگ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے لیکچر کے بعد جب ہم لوگ ایک کمرے میں چائے پی رہے تھے تو ہمیں ایک مقامی لیڈر نے بتایا کہ ایجنسیوں کے اہلکار ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ انہوں نے اس لیکچر میں کیا کہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات پر تھوڑے غصہ میں بھی آئے اور کہا کہ تم لوگ تو لیکچر میں موجود تھے لیکن انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں ایک دو پیراگراف لکھوا دیجئے تاکہ ہم اپنے اعلیٰ افسران تک پہنچا سکیں کیونکہ یہ ہماری نوکری کا حصہ ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیکچر کا خلاصہ ہو بہو بیان کر دیا۔ دراصل جس سے ایجنسیوں والے ایک پیغام دینا چاہتے تھے کہ آپ کو ہم واچ کر رہے ہیں۔

بہر حال مجھے تربت اور گوادر کے نوجوانوں کے تجسس اور علمی پیاس نے بہت متاثر کیا، اور خاص طور پر نوجوانوں کا وہ تجسس جوان میں نیشنل ازم، طبقاتی شعور اور ریاستی جبر کے نتیجہ میں ابھرا وہ دیدنی تھا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی جو اپنی سوچ اور فکر کے لحاظ سے روایت شکن لبرل ترقی پسند اور قدامت پرستی کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں اس لئے وہ نا صرف یہ کہ ریاست کے لئے قابل قبول نہیں بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی بھی اپنی تنزل پذیر روایت کی وجہ سے شرف قبولیت نہیں بخشتی۔ فرد کا ریاست سے لڑنا قدرے آسان ہوتا ہے لیکن جب معاشرہ آپ کا دشمن ہو جائے تو یہ لڑائی دانشور کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے دانشور ہیں جو روایت پرستی اور قدامت پسندی کو مختلف توجیہات کے ذریعے زندہ رکھے ہوئے ہیں اور وہی دانشور مقبول عام بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ 90ء کی دہائی میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک دفعہ ٹیلی فون پر بتایا کہ ''آغا خان فاؤنڈیشن کی مدد سے گلگت میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ ہے اور یہ تجویز دی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فاؤنڈیشن کے لوگوں کو بتایا کہ مجھ جیسے لوگ ریاست کے لئے قابل قبول نہیں ہیں اور میری شمولیت آپ کے قیمتی ادارے کے لئے نیک فال نہیں ہوگی'' لیکن آغا خان والوں کا اصرار تھا کہ چونکہ اس ادارہ میں حکومت پاکستان کا نہیں بلکہ ان کا پیسہ لگ رہا ہے۔ اس لئے ریاست کو ہماری پسند کے لوگوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خدشات کے باوجود مجھے حکم دیا کہ اگر میں وہاں وائس چانسلر بنوں گا تو تم میرے ساتھ رجسٹرار کے فرائض دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔۔ اس کے لئے تم کو اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دینا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے حکم کے سامنے میں نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا آج تک اس پراجیکٹ کا ہمیں کچھ پتہ نہ چلا۔



ڈاکٹر صاحب نے سماج میں حملہ آوروں کے بارے میں نیا شعور پیدا کیا انہوں نے بتایا کہ یہ حملہ آور چاہے کسی ملک قوم مذہب یا نسل سے ہوں وہ تاریخ میں مجرم کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے بغیر کسی وجہ کے مال و دولت کے لالچ یا اپنی سلطنت کو بڑھانے کے لئے دوسرے ملکوں پر حملہ کیا اور لوگوں کا قتل عام کیا۔ ڈاکٹر صاحب سکندر اعظم کو اعظم لکھنے پر شدید اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ہمارے سماج کا مجرم ہے حملہ آور ہے اس کو اعظم لکھ کر عظمت نہیں دینی چاہیے۔ وہ سکندر، محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور محمد غوری کو بھی اس صف میں شامل کرتے ہیں۔

جاگیرداری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کالونیل دور میں اس ادارے کو حیثیت ملی انگریز حکومت نے ان لوگوں کو مستقل جائیدادیں دے کر ان کے سماجی رتبے کو استحکام دیا اور یوں انہوں نے عام رعایا کو کنٹرول کیا۔ موجودہ دور کے جاگیردار بھی انہی کی اولادیں ہیں اور برسر اقتدار جماعت کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد یہ جاگیردار طبقہ اور مضبوط ہوا۔ ریاست نے دیہی علاقوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جہاں یہ ایس ایچ اوز، تحصیلدار اور مجسٹریٹ کے ذریعے عوام پر مسلط ہیں۔ ریاست اور عوام میں تمام رشتے ختم ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے نصاب کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نصاب کے ذریعے قومی شعور اور قومی تفاخر کے احساسات کو ابھار کر عوام کے مائنڈ کو کنٹرول کرنے کا تصور قومی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد سے شروع ہوا۔ یوں قومی ریاستیں نصابی کتابوں کے بارے میں بڑی حساس ہو گئیں۔ چونکہ پاکستان کو ایک نظریاتی ملک قرار دیا گیا لہٰذا نصاب کی کتابوں کے ذریعے ان نظریات کا فروغ ہوا اور ہمارے طالب علموں میں تنگ نظری اور نفرت کے جذبات پیدا ہوئے جس کا اثر پورے معاشرے کے ماحول پر پڑ رہا ہے۔ جس کا شاخسانہ دہشت گردی کا فروغ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں طالب علموں کے لئے تاریخ کی نصابی کتابیں تہذیب کی کہانی لکھیں جو کہ ''تہذیب'' کے عنوان سے تین حصوں میں شائع ہوئیں۔ یعنی پتھر کا زمانہ، کانسی کا زمانہ اور لوہے کا زمانہ، دوسری جلد میں قدیم ہندوستان، عہد وسطیٰ کا ہندوستان اور برطانوی ہندوستان ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ کتابیں سرکاری یا غیر سرکاری اسکولوں کے نصاب کا حصہ نہ بن سکیں۔ اگر ان کتابوں کو نصابی کتب میں شامل کیا جاتا اور عام طالب علموں تک ان کی رسائی ہوتی تو ان کے نتائج مختلف ہوتے۔ لیکن پاکستان کے نصاب پر ریاست کا قبضہ ہے اس لئے یہاں نفرت پر مبنی نصاب پڑھایا

جارہا ہے جس کا منطقی انجام دہشت گردی کی شکل میں بھی ابھر کر سامنے آرہا ہے اور یوں ہمارے معاشرے پران لوگوں کا قبضہ ہوگیا جو ہر طرح کی تہذیب کے دشمن ہیں۔ دہشت گردی کی فضا بنانے میں کتب کا حصہ ہے۔ جس کی سرپرستی ریاستی مشینری نے کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہمیں ہمیشہ ہیروورشپ سے منع کرتے رہے بلکہ انہوں نے ہمیں کہا کہ بزرگوں کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ جب انہوں نے یہ بات تلہ گنگ کے ایک لیکچر میں کی تو لوگوں نے پہلے تو بہت برا منہ بنایا لیکن جب انہوں نے اس کے خدوخال تاریخ کی نسبت سے واضح کیے تو لوگوں میں کچھ اطمینان آیا۔ انہوں نے کہا "رول ماڈل" کا تصور تقلید پر مبنی ہے اور یہ تخلیق کے جذبات کو معدوم کر دیتا ہے۔ بنے بنائے راستوں پر چلنا آسان اور سہل ہوتا ہے۔ مگر اپنے راستے کو تعمیر کرنا محنت طلب کام ہے اور ہیروورشپ لوگوں کے اپنے اندر لیڈرشپ کی صلاحیتیں ختم کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ پاکستانی ریاست کے پاس دو ہیرو ہیں اقبال اور محمد علی جناح اور وہ بڑی محنت سے جناح صاحب کو مذہبی شخصیت بنانے پر تلی ہوئی ہے حالانکہ جناح صاحب ایک لبرل اور مذہب کے بارے میں غیر جانبداری کا رویہ رکھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ اقبال کی شاعری کو بھی نظریہ پاکستان کو اجاگر کرنے کے لئے ریاست نے استعمال کیا اور اس کی آڑ میں اپنے مفادات پورے کرتی ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ ڈاکٹر مبارک علی، خالد علیگ اور تسلیم صدیقی کے ساتھ گزارہ ہے جس کی بدولت مجھے اپنے اندر کے تضادات کو سمجھنے اور سلجھانے کا موقع ملا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ ہر مشکل وقت میں ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ کھڑا رہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنے مخلص دوستوں کا تعاون بھی حاصل رہا جن میں خاص طور پر محمود باویجہ، خالد محمود، لیاقت ملک اور مجیب شیخ، پروفیسر توصیف اور سرور جاوید قابل ذکر ہیں۔ یہاں میں خاص طور پر مرحوم حسین بن خامس اور مرحوم مستحسن خان کو یاد کروں گا جن کی بے وقت موت نے ہمارے پُرخلوص دوستوں کے گروپ کو منتشر کر دیا۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے دانشور سماج کا بہت بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے جن نظریات کی آدرش میں زندگی گزاری ہے اس کے لئے قربانیاں ہی دینی پڑتی ہیں اور آج سے سو سال بعد جب ایک نیوٹرل مورخ پاکستانی سماج کی تاریخ لکھے گا تو اس میں ڈاکٹر مبارک علی کی سماجی تبدیلی کی کاوشوں کو سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ خالد بھائی نے کیا خوب کہا ہے۔ ے

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

سہیل راہی، سردار عظیم اللہ خاں میو اور ہمراز کے ساتھ

سہیل راہی، ظہور احمد خاں اور ہمراز کے ساتھ

لاہور الحمرا ہال میں تقریب سے خطاب کرتے ہوئے

ظہور احمد خاں کے بیٹے کی دعوت ولیمہ پر (بائیں سے دائیں) رفاقت علی، شہزاد، ریاض ظہور خاں، ذکیہ مبارک، نین تارا، اسلم گورداسپوری، ظہور احمد خاں، شعیب عادل کے ساتھ

غافر شہزاد اور ظفر علی خان کے ساتھ

ڈاکٹر روبینہ سہگل کے ساتھ

امر سندھو، منصور قادر جونیجو، بدر سومرو، اعجاز قریشی اور حفیظ کنبر کے ساتھ

حمزہ علوی کی کتاب ''جاگیرداری اور سامراج'' کی تقریب رونمائی میں ڈاکٹر مبارک علی اور طاہرہ مظاہر علی

قصور نظام لوہار کی قبر پر۔ظہور احمد خاں اور اقبال قیصر کے ساتھ

بطور لیکچرر سندھ یونیورسٹی 64-1965ء



# ڈاکٹر مبارک علی اور ان کا فن تاریخ نویسی

## ایک طائرانہ جائزہ

فاروق بلوچ
کوئٹہ

پاکستان کے ترقی پسند حلقہ میں بے شمار ایسے نام ہیں کہ جن کی ادبی، سیاسی وسماجی خدمات قابل تعریف ہیں۔ خصوصاً ادب کے میدان میں کئی ایسے اعلیٰ اسماً ملتے ہیں کہ جن کی ادبی خدمات کے نتیجہ میں پاکستان میں ترقی پسند، قوم دوست، وطن دوست اور سامراج دشمن سیاسی رجحانات کو کافی پذیرائی اور شہرت ملی۔ بورژوازی، فیوڈل اور سامراج دوست عناصر ہمیشہ پاکستان کی سیاسی گدیوں پر براجمان رہے اور ترقی پسند زیرِ عتاب، مگر اس کے باوجود علم کی پیاس بجھانے والے یہ سرفروش اپنے کارِ عظیم سے نہ رکنے والے تھے اور نہ رکے۔ ادب کے ذریعے انقلابی اور ترقی پسند شعوری سوچ پھیلانے میں ان مصنفین نے لازوال کردار ادا کیا۔ ایسے کئی نام ہیں کہ جنھوں نے اپنے زورِ قلم سے بالادست اور حاکم طبقات کے ظلم، جبر، معاشرتی عدم مساوات اور تمام تر امورِ سلطنت پر قبضہ کے خلاف آواز اُٹھائی اور عام لوگوں میں ان مظالم اور عدم مساوات کے خلاف شعور کو بیدار کیا۔ ان بے شمار ادیبوں، مورخوں، مصنفوں، تنقید نگاروں اور شاعروں کی طرح ایک اہم ترین نام جناب ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا بھی ہے کہ جو جدید مورخین کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی سے راقم الحروف کی شناسائی عشروں پرانی ہے مگر حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ راقم الحروف کو کبھی بھی ڈاکٹر مبارک علی کا دیدار نصیب نہ ہوا اور نہ کبھی ان سے ملاقات ہوئی اور نہ ہی بالمقابل کبھی ان کی قیمتی علمی گفتگو سننے کا موقع ملا مگر اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب سے ایک ایسا رشتہ قائم

ہے کہ جس کی نسبت روح کے ساتھ ہوتی ہے اور جہاں روحانی تعلق کی بات ہوتی ہے تو وہاں ذاتی تعلقات اور ملاقات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے، اور یقیناً مجھ جیسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ ہوں گے کہ جو ڈاکٹر صاحب سے کبھی ملے نہیں اور نہ ہی کبھی ان سے گفتگو کی مگر ان کا روحانی تعلق انہیں ہمیشہ جدید دور کے ترقی پسند اور منفرد اندازِ تحریر رکھنے والے عظیم دانشور ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ راقم الحروف کی گرویدگی کا سبب یقیناً کوئی عام انسان نہیں ہے بلکہ ایک ایسے استاد کا مرتبہ ہے کہ جن کو دیکھے بغیر اُن سے اتنا کچھ سیکھا کہ خود لکھنے کے قابل بنا تو اگر بالمشافہ ملتا اور شاگرد ہونے کا شرف حاصل کرتا تو شاید میرا روحانی تعلق جنون میں بدل جاتا۔ ان کی تحریریں ہی تھیں کہ جنہوں نے راقم الحروف ناچیز کو نہ صرف تاریخ پڑھنے، سمجھنے، لکھنے اور بدلنے پر راغب کیا بلکہ وہی راستہ اختیار کرنے میں بھی راہنمائی کی کہ جو بذاتِ خود ڈاکٹر مبارک علی کا راستہ ہے یعنی استاد ہونا، کہ جو انسانوں کے روپ میں فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ دنیا کا پہلا استاد بھی تو جبرائیل تھا کہ جس نے عظیم ترین انسانوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا اور یقیناً ایک اچھا استاد ہی کارِ جبرائیل سرانجام دے سکتا ہے اور استاد اچھا ہی ہوتا ہے بشرطیکہ وہ استاد ہو اور اپنے حاصل کردہ علوم سے دنیا کو ایسے روشناس و آشنا کردے، جیسا کہ ڈاکٹر مبارک علی نے کیا ہے یعنی اپنے علم کو رضا کارانہ طور پر قرطاس پر نوشتہ کر کے اس سے پوری دنیا کو مستفید کرنا۔

راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں ڈاکٹر مبارک علی کی پچپن کتابیں ہیں جبکہ ان کی کتابوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ماضی میں تاریخ کا موضوع عموماً شاہی خاندان، بادشاہ، اس کے کارنامے، اس کی فوجی مہمات وفتوحات اور اس کے کردار و عمل پر مشتمل ہوتا تھا اور اسے ہی تاریخ کہا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ کو ماضی کی قصیدہ گوئی ہی کہا جا سکتا ہے کہ جس میں طاقتور اقلیت اور ان کی سرگرمیاں موضوعِ تحریر ہوتے تھے جبکہ اکثریت کا ذکر تاریخ سے یکسر غائب ہوتا۔ بابائے تاریخ ہیروڈوٹس کی کتاب بھی شاہانِ ایران کے فوجی کارناموں اور سینکڑوں آزاد اور خودمختار اقوام پر ان کے غلبہ کی داستان بیان کرتا ہے۔ اسی طرح بابائے مسلم تاریخ نویسی اور بابائے عمرانیات عبدالرحمٰن ابن خلدون کی کئی جلدوں پر مشتمل تاریخ بھی صرف اور صرف مسلمان حکمرانوں کی فتوحات، جنگوں اور شاہی خاندانوں کی صفت وثناء تک محدود ہے اور جن اقوام نے ان مسلمان خلفاء کے مظالم اور جابرانہ اقدامات کے خلاف مزاحمت کی یا ان کی مخالفت کی تو وہ اقوام مردود، ملحد، خوارج اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پائے۔ مسلمان مورخین میں شاید ہی کوئی ایسا مورخ گذرا ہو کہ جس نے اپنی تاریخ کا موضوع



شاہوں کی بجائے عام انسانوں کو بنایا ہو اور کبھی ان کے مسائل اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر کیا ہو۔ امام محمد بن جریر طبری، عبداللہ یاقوت یا دیگر مورخین وجغرافیہ نویسوں نے کبھی بھی مسلم معاشرے کی پسماندگی اور دیگر کمزوریوں کی نشاندہی نہیں کی بلکہ صرف اور صرف خلفاء وسلاطین کے مظالم اور جابرانہ نظام کو الفاظ کے خوبصورت پیرائے میں لا کر ان کے عظیم کارنامے قرار دیا۔ لہٰذا آج کا قاری بھی یہی سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کا ماضی صرف اور صرف کارناموں سے بھرا ہوا ہے اور اس شاہی طبقے میں عام انسان تھے ہی نہیں بلکہ وہ اپنے ہر عمل میں عام انسانوں سے مختلف تھے یعنی وہی دیومالائی اور اساطیری داستانیں کہ جو ماضی قدیم کی عظیم تہذیبوں میسوپوٹیمیا، مصر، یونان، ہندوستان وغیرہ کی طرح کہ جہاں بادشاہ ہمیشہ خدا کا بیٹا تصور ہوتا تھا۔

مغربی مورخین نے بھی ترقی پسند تاریخ نویسی کے بجائے ماضی میں وہی قصیدہ گوئی والی روایت برقرار رکھی اور ان کے ماضی کی تاریخ بھی شہنشاہوں اور ان کے فوجی کارناموں کے گرد گھومتی ہے۔ وہ بھی ان حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں کہ جن کے نتیجے میں آزاد، خودمختار اور الگ جغرافیائی حدود رکھنے والی اقوام خاک وخون میں لوٹا دیئے گئے، ان کے گھر وآشیاں جلا دیئے گئے اور انہیں غلامی ومحکومی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ ان کی عزتیں پامال کر کے ان کے خطوں پر قبضہ کیا گیا مگر اس کے باوجود مورّخ کی نظر میں یہ تمام مذموم حرکات بادشاہ یا شہنشاہ کے عظیم کارنامے شمار ہوئے۔ یہی اسلوب تاریخ نویسی پچھلی صدی تک رہا اور دورِ جدید میں بھی تاریخ کو اعلیٰ اور مقتدر طبقات کی مصروفیات اور غالب اکثریت پر اپنی مرضی کے فیصلے اور احکامات کی تحریر وتعمیل تک محدود رکھا گیا ہے۔

یہی سلسلہ برصغیر میں بھی نظر آتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ برصغیر کی تمام تر مسلم یا غیر مسلم تاریخ نویسی دراصل قصیدہ گوئی اور ثناء خوانی کے زمرے میں آتی ہے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ مسلم دور کے بعد جو تاریخ نویسی کی گئی وہ بادشاہوں اور سلاطین کی ننگی شمشیروں کے سائے میں کی گئی اور جو تاریخ لکھی گئی وہ دراصل لکھی نہیں گئی بلکہ لکھوائی گئی اور ان میں مورخ نے کسی بھی طرح کی ریاستی کمزوریوں یا سلطان یا بادشاہ کی ذاتی کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ سلطان یا بادشاہ کی بعض کمزوریوں کو بھی اس کی خوبیوں میں شمار کیا گیا۔ مورخ کو بادشاہ کا جمعہ کے روز مسجد جانا اور اپنی رعایا کو نماز پڑھانا تو یاد ہوتا تھا مگر اس کا حرم اسے کبھی نظر نہ آیا کہ جہاں بھانت بھانت کی سینکڑوں دوشیزائیں مسلمان حاکم کے حرم میں اس کو نفسانی سکون وراحت دیتی تھیں اور اس کی حیوانی جنسی خواہشات کی تکمیل کرتی تھیں۔ درباری مورخ نے بادشاہ کے اس فعل کو بھی شریعت کے عین مطابق قرار دیا اور اسی طرح ہند اور

آس پاس کی دیگر آزاد و خود مختار خطوں کے حریت پسند حقیقی باشندوں کی مزاحمت قابلِ تعزیر ٹھہرتی تھی اوران کا قتلِ عام بھی شریعت کی نظر میں حرام سہی مگر درباری مورخ اسے بھی بادشاہ کے مذہبی کارناموں میں شمار کرتا تھا اور ہندو کے خلاف لشکرکشی اور قتال وجدال سب سے زیادہ کارِثواب ہوتا تھا۔ مورخ ایسے کارناموں کو خصوصی طور پر اپنی تحریروں میں جگہ دیتے تھے۔ بلاشبہ سابقہ ادوار میں مذہبی تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ نویسی کو ہمیشہ جانبدارانہ انداز دیا گیا اور حقیقت سے ہمیشہ انحراف کیا گیا۔ تاریخ نویسی میں یہ گھٹن صدیوں تک رہی۔ حتیٰ کہ صدیاں بیت گئیں اور ہر آنے والا دن نئی امیدیں لے کر آتا مگر رات کی سیاہی ان امیدوں کو ایک بار پھر ناقابل تکمیل خواہشات میں بدل دیتی تھیں۔

اس انتظار میں، کہ کوئی تو وقت کا نقیب بن کر اُٹھے اور تاریخ نویسی کو حقیقت کا روپ دے اور اسے چاپلوسی اور قصیدہ گوئی کے چنگل سے آزاد کردے، صدیاں بیت گئیں اور بالآخر تاریخ نویسی پر پڑی صدیوں کی قصیدہ گوئی، چاپلوسی، جانبداری اور تنگ نظری کے گرد کی جمی ہوئی گہری تہہ ہٹ گئی اور علم کا یہ سب سے اہم ترین موضوع اور تمام تر سماجی علوم کی ماں بالآخر درست اور صحیح راستے پر گامزن ہوگئی اور یقیناً یہ اقرار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ کارِ عظیم سرانجام دینے والے عظیم انسان دورِ جدید کے سب سے بڑے مورخ جناب ڈاکٹر مبارک علی ہیں کہ جن کے اسلوب تاریخ نویسی کی وجہ سے ایسی روشنی پھوٹ پڑی کہ جس کی روشن کرنوں نے علم تاریخ کے وسیع ترین علم کے وسیع وعریض جہان کو منور کردیا اور اسے شاہوں کے محلات سے نکال کر عوامی گلی کوچوں تک پہنچا دیا اور بلاشبہ ایک عام انسان کہ جس کے لیے تاریخ ایک نابلد سا مضمون تھا اور وہ کارِ ریاست اور کردار سیاست سے ناآشنا تھا اور نہ ہی اسے اس بات کا علم تھا کہ وہ جن کو اپنے زعم میں اپنا رکھوالا، حاکم اور رہبر و رہنما سمجھتا تھا اور جن کی قصیدہ گوئی کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا وہی دراصل اس کے تمام تر انسانی حقوق کی پائمالی اور غصب کرنے کے ذمہ دار ہیں، مگر جب ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی تاریخ نویسی کا آغاز کیا تو ایک عام انسان بھی ان تمام تر چالاکیوں اور مکاریوں سے آشنا ہوا کہ جن کو تاریخ میں سیاست کا نام دیا گیا۔

ڈاکٹر مبارک علی نے دراصل تاریخ کو خیالات اور افسانوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت کا رخ دیا اور اسے خاص طبقات کے تذکروں کے بجائے عوام کی پتا بنادی اور یہ پیغام دیا کہ تاریخ تمام انسانوں کی ہوتی ہے اور سیاست و ریاست میں ہر شخص اور ہر گروہ حصہ دار ہوتا ہے، وفاداری یا قربانی خاص لوگ نہیں دیتے بلکہ ریاست کا دفاع ہمیشہ وہ لوگ کرتے ہیں کہ جو تاریخ میں گمنام ہیں۔ انہوں نے اپنی تاریخ نویسی میں یہ پیغام دیا ہے کہ ہر شخص معاشرے میں معتبر ہے اور ہر ایک میں اتنی صلاحیتیں ہوتی



ہیں کہ وہ کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دے سکے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس عام آدمی کی صلاحیتوں سے بااختیار لوگ ریاست کے لیے استفادہ کرسکیں اور اسے تاریخ میں جگہ بنانے کا موقع فراہم کرسکیں۔ انہوں نے تاریخ کو شاہی گرداب سے نکال کر عوامی مجالس کی زینت بنادیا اور عام لوگوں کو بھی یہ پیغام دیا کہ وہ تاریخ میں اپنا کردار ادا کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع پیدا کریں اور ان مواقعوں سے استفادہ کریں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے ماضی میں لکھی گئی تاریخ کے بہت سے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے اور ہر دور میں تاریخ میں ان لوگوں کے کردار کو اجاگر کرنے پر زور دیا ہے کہ جو پس پردہ رہ کر تاریخ بناتے رہے۔ انہوں نے ان کرداروں کی مذمت کی ہے کہ جو گمنام تاریخ سازوں کے کارناموں پر اپنی کامیابیوں کے محل تعمیر کرتے ہیں اور تاریخ میں نام پیدا کرتے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے کوئی کارنامے ہوتے ہیں۔ دراصل ایسے شاطر اور مکار لوگ کہ جو کچھ کیے بغیر تاریخ پر قابض ہوتے ہیں ڈاکٹر مبارک علی انہیں قابل تعزیر سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ نویسی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخ نویسی میں معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کے اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ماضی کے مورخین چونکہ تاریخ کو صرف شاہی خاندانوں کے فوجی کارناموں اور فتوحات تک محدود کردیتے ہیں اور ہر عمل کے روشن پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں لہٰذا ان کمزوریوں کی وجہ سے قاری کے سامنے یکطرفہ تاریخ آتی ہے اور ہمیشہ وہ شاہی خانوادہ ایک ماورائی اور پاکیزہ ترین روپ میں اس کے سامنے آتا ہے۔ اس کی ریاست مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے بھلے وہ چند سو میل تک کے خطہ کا حکمران ہی کیوں نہ ہو، اس کا انصاف مثالی ہوتا ہے چاہے وہ دن بھر مظلوم ومحکوم انسانوں کے خون کی ہولی کھیلتا رہا ہو، اس کے عدل کے چرچے چار سو پھیلے ہوتے، بھلے اس نے اپنے باپ کو ہی کیوں نہ قید کرلیا ہو، اور ماضی کے مورخ کے لیے اس کا ہیرو دنیا کا مومن ترین اور انتہائی پرہیزگار انسان ہوتا تھا جبکہ اس پرہیزگار اور مومن بادشاہ کا حرم ہزاروں عورتوں سے بھرا ہوتا کہ جو سب بادشاہ کے لیے مذہباً و شرعاً جائز قرار دیئے گئے تھے۔ ماضی کی اس یکطرفہ تاریخ نویسی نے تاریخ نویسی کو شدید نقصان پہنچایا اور بہت سارے حقائق مورخ کے تعصبات اور جانبداری کی وجہ سے منظر عام پر نہ آسکے یا پھر غلط طور پر پیش کیے گئے۔ یقیناً ایسے عمل اور تاریخ نویسی سے معاشروں کے بارے میں زیادہ تر حقائق پوشیدہ رہے جس کی وجہ سے تاریخ کا مضمون مستقبل کے لیے نہ تو کارآمد رہا اور نہ ہی اس سے کوئی رہنمائی لی جاسکی۔ ہر

دور میں پرانے ادوار کی غلطیاں صرف اس لیے دھرائی جاتی رہی ہیں کیونکہ ماضی کی تاریخ میں اکثر حقائق پوشیدہ رکھے گئے اور ان کے بیان کرنے میں جانبداری کا مظاہرہ کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی غلط بیانیاں مستقبل کے لیے کبھی کارآمد نہیں ہوسکتیں لہٰذا اسی وجہ سے مستقبل ہمیشہ زیادہ سے زیادہ پریشانیاں لے کر آیا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ماضی کی اس یکطرفہ اور جانبدارانہ تاریخ نویسی کے اسلوب پر ایک بھرپور چوٹ لگائی اور تاریخ نویسی کو اصل حقائق اور سچائیوں کے ساتھ تحریر کرنے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے شاہی خانوادوں کی الوہیت کے راز کی پردہ کشائی کی اور معاشرے کو یہ بتایا کہ دراصل یہ حکمران جو خدا کے بیٹے کہلاتے ہیں اصل میں انسان ہی ہیں اور طاقت کے نشے میں چور ہو کر خدا بن بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے محکوم اور مقہور انسانوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے درسِ انقلاب دیا اور انہیں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کے خلاف لڑنے کا حوصلہ دیا۔ انہوں نے بتایا کہ شاہی محل جو پاکیزگی اور جلال کی علامت سمجھے جاتے ہیں دراصل آماجگاہِ شیاطین ہیں۔ ان محلوں میں اتنی برائیاں اور کمزوریاں ہیں کہ جنہیں عوامی سیلاب ایک ہی ریلے میں بہا کر لے جاسکتا ہے مگر حاکموں نے عیاری و مکاری، دھن دولت اور طاقت کے ذریعے ان کا دفاع کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ حاکموں کی دھن دولت اور طاقت کا اصل ذریعہ بذاتِ خود عوام ہیں کہ جو ہمیشہ تاریخ میں پس پردہ رہے ہیں اور ان کے کردار سے بالادست اور صاحبِ اقتدار طبقات نے فائدہ اُٹھایا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے ہر موضوع اور ہر کردار کو اپنا موضوعِ سخن بنایا اور ان کے قلم نے ہر ایک موضوع کے ساتھ مکمل انصاف کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جب تاریخ نویسی کو اپنا موضوع بنایا تو اس میں تاریخ نویسی کی تمام تر باریک بینیوں پر اختصار کے ساتھ سہی مگر جامع بحث کی اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف انفرادی کارناموں اور تعریف و ثناء کا نام ہی تاریخ نہیں بلکہ تاریخ میں وہ تمام حالات و واقعات رقم ہونے چاہئیں کہ جن کے اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ جو کردار صرف صاحب اقتدار ادا کرتے ہوں وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں بلکہ معاشروں کی تبدیلی ہمیشہ نچلے اور متوسط طبقات کی جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجے میں آتی ہے مگر ذکر صرف بالادست طبقات کا ہی کیا جاتا ہے کہ جس سے تاریخ مکمل نہیں ہوتی اور نہ صرف ادھوری رہ جاتی ہے بلکہ ایسی تاریخ سے مستقبل کے لیے کوئی رہنمائی بھی نہیں لی جاسکتی۔ اسی طرح اگر اُن کا موضوع شاہی دربار رہا تو انہوں نے اس کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کو خیرہ نہ ہونے دیا اور نہ ہی



ماضی کے درباری اور سرکاری مورخ کی طرح ان کے قلم نے اس عمارت اور اس کے مکینوں کے بارے میں تعریف و توصیف اور حمد و ثناء تحریر کی، بلکہ انہوں نے اُن رازوں کی پردہ کشائی کی کہ جنہیں سابقہ روایتی مورخین نے یا تو چھپا رکھا تھا یا پھر خوبصورت الفاظ کے لبادے میں ان کے اصل روپ کو پوشیدہ رکھا تھا۔ ان شاہی محلوں کے دن رات اور ان کے اندر ہونے والی سرگرمیوں کی خوب خوب اور سچے پیرائیوں میں تشریح کی۔

ڈاکٹر مبارک علی نے پوری دنیا کی تاریخ پر قلم اُٹھایا ہے اور خصوصاً سندھ و ہند کے بارے میں ان کی تصانیف بلاشبہ ادبی دنیا کے لیے کسی انمول خزانے سے کم نہیں۔ یہ راہبر کتابیں محققین کی رہنمائی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ سندھ و ہند کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں، مثلاً ''سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ''، ''سندھ کی تاریخ کیا کہتی ہے''، ''سندھ خاموشی کی آواز''، ''اکبر کا ہندوستان''، ''جہانگیر کا ہندوستان''، ''علماء اور سیاست''، ''آخری عہدِ مغلیہ کا ہندوستان''، ''تاریخ اور مذہبی تحریکیں'' وغیرہ ایسے انمول تاریخی نسخے ہیں کہ جن کی قدر و قیمت ایک محقق ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ ان کتابوں سے کئی طرح کی علمی رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ اولاً تو یہ کتابیں غیر جانبدارانہ تاریخ کے بہترین نمونے ہیں، اور ثانیاً یہ اس خطہ کے بارے میں معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں کہ جو ماضی کی نسبت بالکل مختلف طرز پر تحریر ہوئی ہیں، اور ثالثاً تاریخ کے کسی بھی موضوع پر کام کرنے اور کسی عنوان پر تحقیق کرنے کے لیے یہ کتابیں بہتر رہنمائی کرتی ہیں اور ان کے مطالعہ کرنے سے طریقہ تحقیق سمجھ میں باآسانی آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کتابوں میں سندھ و ہند کے نچلے اور متوسط طبقات کے ابتدائی اور موجودہ مسائل پر بھی انتہائی محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے تاریخ ہند و سندھ کے کئی خفیہ گوشے نمایاں ہوجاتے ہیں کہ جن کے بارے میں ماضی کے مورخین نے مکمل خاموشی اختیار کی یا پھر ان کو تقاضہ وقت قرار دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ان تصنیفات میں نہ صرف سندھ و ہند کے ماضی اور حال کے تذکرے کیے اور مسائل و مصائب بیان کیے بلکہ کھل کر ان کرداروں کا بھی تعین کیا کہ جو ان خطوں کی تہذیبوں کی تباہی کے اصل ذمہ دار ہیں اور ساتھ ہی انہوں نے نچلے طبقات کو بالادست اور غاصب طبقات کے خلاف جدوجہد کا بھی درس دیا تاکہ وہ اپنے انسانی حقوق کے حصول میں کامیاب ہوں۔

ان کی تاریخ نویسی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے واقعات کا بغور مطالعہ کرنے، ایک واقعہ کی کڑی دوسرے واقعات سے ملانے کے لیے عمیق و دقیق غور و خوض کرنے اور اصل محرکات کو تلاش کرنے کے بعد تاریخ رقم کی ہے اور سطحی انداز میں تاریخ لکھنے سے یکسر اجتناب کیا ہے۔

انہوں نے صرف واقعات نہیں لکھے بلکہ ان کے اسباب واثرات کا بھی انتہائی گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان طبقات کا تذکرہ کیا ہے کہ جو ان واقعات کی وجہ سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں جبکہ ماضی کے مؤرخین چونکہ آزادانہ یا غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی سے اجتناب کرتے تھے اور کئی وجوہات کی بناء پر بہر حال تاریخ کو جانبداری کا لبادہ پہناتے تھے اور تاریخ کو صرف واقعات کے تسلسل کا نام دے کر تحریر کرتے اور اسے ہی تاریخ کا نام دیتے تھے اور ان میں واقعات کے اسباب واثرات کو یکسر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ لہٰذا تاریخ صرف ایک مخصوص طبقہ کی تعریف وتوصیف تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور عام لوگوں کی اس میں دلچسپی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے طرزِ تحریر سے تاریخ کو ایک نئی جہت عطا کی اور اسے ایک نئے راستے پر گامزن کیا۔ انہوں نے تاریخی واقعات کا انتہائی خوردبینی کے ساتھ مطالعہ کیا اور ان واقعات کے تمام تر علل واسباب پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی ان واقعات کے اثرات کو بھی آشکارا کیا۔ انہوں نے ماضی کی تاریخ نویسی سے ہٹ کر کہ جس میں ہر واقعہ کو حاکم کے کارناموں کی فہرست میں شامل کیا گیا، واقعات کا صحیح صحیح ادراک کر لینے کے بعد ان کے اصل کرداروں کو واضح کیا۔ انہوں نے ایسے واقعات کے اثرات کا بھی گہری نظروں کے ساتھ جائزہ لیا کہ جن سے متاثر تو ایک بڑی خلقت ہوئی تھی مگر مؤرخین نے ان کے اثرات کو بھی کہ جن سے بڑی بڑی تباہیاں آئی تھیں کو فاتح کے کارناموں کی فہرست میں شامل کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی مثالوں سے ایسے واقعات کے حقائق کو بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے اور ان کے نتیجے میں ہندوستانی عوام کی صدیوں تک بربادی اور عدم استحکام کو بھی مسلمان مؤرخین محمود کے کارناموں میں شامل کرتے ہیں جبکہ ایسے واقعات ڈاکٹر مبارک علی کی نظروں میں قابلِ گرفت ہیں کہ جن کی وجہ سے اگر ایک طرف ایک چھوٹی اقلیت مستفید ہوئی تو دوسری طرف ایک بڑی اکثریت ان واقعات کے بعد شدید تباہی سے دوچار ہوئی۔ اس طرح کے لاتعداد واقعات کی مثالیں اُن کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ جن سے واقعات کے اصل حقائق اور محرکات سمجھ میں بآسانی آجاتے ہیں کہ جن پر ماضی میں کبھی بھی غور نہیں کیا گیا یا پھر انہیں شدید تعصبات کی وجہ سے موضوعِ بحث ہی نہیں بنایا گیا۔

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ نویسی میں تنقیدی طریقہ کار واضح نظر آتا ہے۔ تنقیدی طریقہ تحقیق وہ ذریعہ ہے کہ جس سے حقائق کی پوری طرح چھان پھٹک کے بعد حالات و واقعات کو ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے اور یقینی امر ہے کہ تنقیدی طریقہ سے تاریخ کی اصلاح بہتر طور پر کی جاسکتی ہے اور اس طرح غلطیوں کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ اس طریقہ تحقیق سے اصل حقائق بھی سامنے آجاتے



ہیں اور مبالغہ آرائی کے ساتھ ساتھ جانبداری کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ نویسی کے لیے جو طریقہ کار منتخب کیا ہے وہ یقیناً حالات وواقعات اور حقائق کے تجزیہ کرنے اور ان کی پوری طرح غیر جانبداری سے جانچ پڑتال کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس طریقہ تحقیق سے معاشرے کا اصل چہرہ اور اس کو کامیاب یا ناکام کرنے والے کردار کُھل کر سامنے آجاتے ہیں کہ جس سے مستقبل کے لیے رہنمائی لینا آسان ہو جاتا ہے اور ان مسائل کا مستقبل میں تدارک ممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی اس طریقہ تحقیق کو اختیار کرنے کی وجہ سے تاریخ نویسی میں نئے رجحانات نے جنم لیا اور سطحی طور پر تاریخ نویسی اور تاریخ پڑھنے کا رواج آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونے لگا۔ دورِ جدید میں کئی لکھنے والوں نے اب اسی طریقہ کار کی پیروی شروع کی ہے کیونکہ اس طرح حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اپنے دلائل میں زیادہ وزن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی تصنیفات کو بہت زیادہ استناد حاصل ہو جاتا ہے اور چونکہ ڈاکٹر مبارک علی حوالہ جاتی انداز میں تاریخ نویسی کرتے ہیں اور ہر واقعہ کے لیے مستند اور غیر جانبدار کتب اور دیگر تحریری مواد کا سہارا لیتے ہیں لہٰذا ایسی تحریر کہ جس میں مستند کتب اور تحریروں کے مواد شامل ہوں اور بعد ازاں ان کی اصل حقیقت پر طویل اور مدلل بحث مباحثے ہوں تو ایسی تحریر کے مستند ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

انہوں نے تہذیبی زوال اور معاشرتی مسائل کا جائزہ اندرونی اور بیرونی عوامل کو مدِنظر رکھ کر کیا اور تنقید کے داخلی اور خارجی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے واقعات کا جائزہ لیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کسی بھی تاریخی واقعہ کے اصل حقائق کو سمجھنے اور پرکھنے میں آسانی ہوئی وگرنہ حالات وواقعات کو سطحی طور پر بیان کرنا تاریخ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی تاریخ نویسی میں تاریخ کے قوانین اور اصولوں کو مدِنظر رکھ کر تحقیق کرتے ہیں تاکہ تاریخی واقعات غلط یا یکطرفہ طور پر بیان نہ ہوں اور نہ ہی ان میں جانبداری ابھرتی جائے۔ کیونکہ ایسی تاریخ پھر قصیدہ گوئی اور عصبیت کے زمرے میں آتی ہے۔ ایسی تاریخ نویسی کہ جس میں تاریخ کے بنیادی قوانین اور اصولوں کو نظر انداز کیا جائے اور واقعات یا اقدامات پر تنقید کے دوران داخلی اور خارجی عوامل کو بالائے طاق رکھا جائے تو اس سے تاریخ میں بڑی پیچیدگیاں اور کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور تاریخ کبھی بھی صحیح سمت اختیار نہیں کرسکتی اور نہ ہی اس سے کوئی رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنی تحریروں کے انداز سے ہی یہ ثابت کرتے ہیں کہ موصوف کو تاریخ نویسی کے تمام تر قوانین وقواعد پر عبور حاصل ہے اور وہ اپنی تحریروں سے معاشرے میں ارتعاش پیدا کرسکتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر مبارک علی تاریخ نویسی میں تاریخ کے امدادی اور ذیلی علوم کی مدد بھی لیتے ہیں کہ جو تاریخ نویسی کے لیے سب سے زیادہ اہم طریقہ تحقیق ہے کہ جس میں دیگر علوم کہ جن میں بعض تاریخ نویسی میں امدادی علوم کے طور پر معاون ہوتے ہیں جبکہ ذیلی علوم علم تاریخ کا ہی کسی نہ کسی طرح حصہ ہی ہوتے ہیں اور ان کی مدد حاصل کیے اور انہیں شامل تحقیق کیے بغیر تاریخ نویسی بے مقصد اور بے نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر مبارک علی نے خصوصی طور پر اپنی تحریروں میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ تاریخ کے ذیلی اور امدادی علوم کہیں پر بھی نظرانداز نہ ہوں تا کہ ان کی تحریر جامعیت کا روپ اختیار کر سکے۔ اسی طرح انہوں نے واقعات وحالات کی چھان بین کے لیے تاریخ کے پرائمری اور سیکنڈری ذرائع کا بھی ماہرانہ انداز میں استعمال کیا ہے اور تمام مستند مواد سے خوبی کے ساتھ استفادہ کیا ہے اور ان ہی ذرائع کی مدد سے تاویلات اور تجزیے پیش کیے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریریں بہ نسبت ان تحریروں کے کہ جن میں تاریخی اصول وقوانین اور طریقہ کے مطابق تحقیق نہیں کی گئی، بہت زیادہ استناد رکھتے ہیں اور محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں۔

موصوف ماضی کے روایتی مورخین کی طرح اس مباحثہ میں نہیں پڑتے کہ فلاں واقعہ کب پیش آیا، جیسا کہ اکثر مورخین کسی بھی اہم اور پُر اثر واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے وقت کے بارے میں بلاوجہ مباحث میں پڑ جاتے ہیں اور موضوع کو طوالت دیتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر مبارک علی اس چیز کو اہمیت نہیں دیتے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا بلکہ موصوف اُس واقعہ کے محرکات، اسباب اور اثرات کا جائزہ لیتے ہیں اور تنقیدی انداز سے اصل معاملات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار تفتیشی ہے اور تمام تر واقعات کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں اور بعدازاں انہیں ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ اس طرح واقعہ کا نہ صرف وقت کا صحیح تعین ہوجاتا ہے بلکہ اس کے محرکات، اسباب اور اثرات بھی سمجھ میں آجاتے ہیں جو کہ مستقبل میں معاشرتی سدھار اور تاریخ سے سبق حاصل کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔

انہوں نے اپنی تحریروں میں دورِ قدیم کے ساتھ ساتھ جدید دور کی بھی تاریخ لکھی ہے اور ماضی اور حال کا انتہائی گہرائی اور مکمل سچائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد ان اسباب وعلل کا جائزہ لیا ہے کہ جس کی وجہ سے مشرق میں ارتقائی عمل یا تو مفقود ہوا یا سست روی کا شکار ہوا۔ خصوصاً برصغیر کے حوالے سے ان کے تاریخی معاشرتی جائزے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے اس قدیم تہذیب کے پورے ادوار کو نہ صرف سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس تہذیب کے ارتقاء سے زوال تک کی پوری کہانی اصل حقائق کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان کی تحریروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کو حال کے ساتھ



مشابہہ کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں اور بیباکی کے ساتھ ان ذمہ داروں کا تعین بھی کرتے ہیں کہ جو اس تہذیبی بدحالی اور زوال کے اصل ذمہ دار تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ڈاکٹر مبارک علی تاریخ میں معاشروں کی کمزوریاں بیان کرتے ہیں اور ان کمزوریوں پر تنقید کرتے ہیں بلکہ جہاں تہذیبوں اور خصوصاً سندھ وہند کی قدیم تہذیب یا پاکستان کی جدید تاریخ کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور ان میں پائی جانے والی کمزوریوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو دوسری جانب موصوف ان کے حل کے لیے تجاویز وطریقہ کار بھی بتاتے ہیں تا کہ ان کی تاریخ نویسی اپنے اصل مقاصد پورے کر سکے اور مستقبل کے لیے رہنما بن سکے اس سے معاشرتی اصلاح ممکن ہو سکے اور ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر مستقبل میں ایسے اقدامات کیے جائیں کہ جن کی وجہ سے معاشرہ ترقی کر سکے اور زوال سے بچ سکے۔

انہوں نے پاکستان میں معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنی تحریروں میں ان مسائل پر طویل اور پُر اثر تحریریں لکھیں۔ انہوں نے پاکستانی معاشرے کے مسائل کا بھی تنقیدی انداز میں جائزہ لیا گو کہ ان میں بعض مسائل کا تذکرہ موجود نہیں ہے اور پاکستانی معاشرے کے زوال کے کچھ اسباب بیان نہیں ہوئے مگر جتنے اسباب پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے وہ تمام تر حقائق پر مبنی ہیں اور ان سے انکار کسی طور نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے سندھ وہند اور بعض دیگر تہذیبوں کے بارے میں انتہائی گرانقدر تصنیفات رقم کی ہیں کہ جن سے ایک تشنہ لب کی ساری تشنگی دور ہوسکتی ہے اور ڈاکٹر مبارک علی کی تحریریں تو تحقیق وتاریخ کا دریا ہیں کہ جس سے ایک بڑی خلقت کی پیاس بجھ سکتی ہے۔ ان کا ترقی پسندانہ مارکسی نقطہ نظر طبقاتی تاریخ کو سمجھنے اور طبقاتی جدوجہد میں حصہ دار بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان کا پیغام یقیناً مظلوم ومقہور اور مجبور ومحکوم اقوام اور طبقات کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان کا تنقیدی نقطہ نگاہ اصلاحی ہے۔ ان کا معاشروں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل کے بیانات حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان کے جائزے قابل غور اور تجاویز قابل عمل ہیں۔ ان کا تحقیقی طریقہ کار قابلِ تقلید ہے اور ان کی معلومات بلاشبہ قابلِ ثناء ہیں اور ان کا علم ایک بحر کی مانند وسیع ہے اور مطالعہ قابلِ توصیف ہے۔ مگر ایک کمی جو شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے دریائے سندھ کے مشرق کی تاریخ وتہذیب پر تو بہت تحقیق کی اور جامع معلومات فراہم کیں مگر انہوں نے دریائے سندھ کے مغرب کو یکسر نظرانداز کیا حالانکہ جہاں انڈس کے مشرق میں میلوہا (سندھ) کی عظیم تہذیب موجود تھی تو اس کے مشرق میں قدیم بلوچستان کی قبل از تاریخ اور جدید حجری دور کی ایک وسیع دیہات سسٹم کے آثار پائے جاتے ہیں اور بلاشبہ اس خطہ

کی تہذیب دنیا کے قدیم ترین ثقافتوں میں شمار ہوتی ہے۔ بعدازاں اب تک اس خطہ میں ایک قدیم نظام اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ موجود ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا اگلا موضوع بلوچستان کی تہذیب وثقافت ہوگی کہ جس سے بلوچستان میں موجود ڈاکٹر مبارک علی کے روحانی شاگرد اپنے خطہ کے بارے میں اپنے روحانی استاد کے قلم سے مستفید ہوسکیں گے۔ یقیناً اہلِ بلوچستان اور بلوچستان کی تہذیب وثقافت سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے یہ ایک گرانقدر تحفہ ہوگا۔

یقیناً ڈاکٹر مبارک علی کی تصنیفات 70 سے زائد ہیں اور ہر کتاب ایک شاہکار کتاب ہے کہ جنہیں علم کے تمام تر اصولوں اور ضروریات کو مدِنظر رکھ کر ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ یہ تصنیفات آنے والے محققین کے لیے بہت بڑا سہارا ہیں کہ جن سے کافی حد تک مستفید ہوا جاسکتا ہے۔ یقیناً ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں پر تبصرہ کرنا، ان کا جائزہ لینا اور ان پر بحث کرنا ان چند سطور یا اوراق میں ممکن نہیں۔ ان کی علمی کاوشیں اتنی زیادہ ہیں اور تحریریں اتنی جامع ہیں کہ راقم الحروف ناچیز اپنے ٹوٹے پھوٹے اور نامکمل الفاظ میں ان کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ یہ تحریریں یقیناً انمول ہیں اور یہ امید کی جاتی ہے ڈاکٹر مبارک علی کا حقیقت پسند قلم قرطاس ابیض پر ہمیشہ سنہرے الفاظ میں سچائی بکھیرتا جائے گا۔



# ڈاکٹر مبارک علی: ایک عہد ساز شخصیت

ڈاکٹر خالد اشرف
دہلی یونیورسٹی انڈیا

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے زمانے، اپنے اطراف اور اپنے ماحول سے الگ تھلگ ہوتے ہیں، لیکن الگ ہوتے ہوتے بھی اپنے اطراف اور اپنے ماحول کو متاثر کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ کامیابی ان کو کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ یہ دراصل ان بڑے ذہنوں کی وسعتِ ذہنی اور ذاتی دیانت داری ہوتی ہے جو اپنے آس پاس کے لوگوں پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔

پروفیسر مبارک علی ایک ایسی ہی نایاب شخصیت ہیں جو زمانے کی حرص وہوس اور جوڑ توڑ کی سیاست سے دور گوشہ تنہائی میں عملی کام کرتے رہے ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے معاشرے، اپنے سماج اور اپنے لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مبارک علی صاحب اصلاً ونسلاً روہیل کھنڈ کے پٹھان ہیں اور پٹھانوں والی خودداری اور راست گوئی ان کے کردار کا بنیادی وصف ہے۔ ان کی پیدائش 21 اپریل 1941ء کو راجستھان کے تاریخی قصبے ٹونک میں ہوئی تھی۔ ریاست ٹونک کے بانی امیر خاں تھے جنہوں نے کرائے کے سپاہی منظم کرکے لوٹ مار کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ بعد میں انگریزوں نے ان سے مصالحت کرلی اور ٹونک کی زمین دے کر ان کو آباد کردیا۔ مبارک علی صاحب کا خاندان پشین سے آیا تھا اور ان کے قبیلے کا نام طور ترین تھا۔ ان کے دادا سنبھل سے ٹونک آکر آباد ہوئے تھے۔ 1952ء میں جب مبارک علی صاحب کے دادا کا انتقال ہوا تو ان کے والد مسعود علی خاں پاکستان چلے آئے جہاں ان کے دو بھائی قبل ہی سے موجود تھے۔

ٹونک کا ماحول نیم جاگیردارانہ اور نیم کاشتکارانہ تھا۔ بیاس دریا کے کنارے پیدا ہونے والے خربوزے نہایت میٹھے ہوتے تھے اور ہر خاص وعام کو دستیاب تھے۔ پتنگ بازی اور شکار لوگوں

کے خاص مشغلے تھے۔ لیکن ہندو علاقوں میں شکار کی ممانعت تھی۔ ایک بار جب علاقے میں قحط پڑا تو اس کے سماجی اثرات کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

''عام لوگوں کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ انہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر اپنے بچوں تک کو فروخت کر دیا تھا۔ امراء اور پیسے والوں نے ہمیشہ کی طرح غریبوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کے بچوں کو خرید کر انہیں بطور غلام یا کنیز اپنی ملکیت بنالیا۔ میری والدہ کا کہنا تھا کہ ان کی دادی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چند لڑکیوں کو خرید لیا تھا، جنہیں وہ نیلے رنگ کے موٹے کپڑے پہنایا کرتی تھیں۔ یہ غریب لڑکیاں گھر کا سارا کام کاج کیا کرتی تھیں۔ یہ اسی گھر میں جوان ہوئیں اور پھر بوڑھی ہو کر مریں۔ نہ ان کی شادی ہوئی اور نہ ہی اپنے بچھڑے ماں باپ سے ملیں۔''

یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب عورتوں کو کوئی جمہوری حق حاصل نہ تھا اور گھر کی عورتوں کی حالت بھی ملازماؤں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی تھی۔ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ قرآن شریف پڑھایا جاتا تھا اور انگریزی تعلیم کو عورتوں کے کردار کے لئے خطرناک تصور کیا جاتا تھا۔ ٹونک میں جب عورتیں کہیں جاتی تھیں تو بیل گاڑی کے چاروں طرف چادر تان کر پردہ میں لے جایا جاتا تھا۔ ٹونک میں عید میلاد النبیؐ کے موقعے پر بڑا جشن منایا جاتا تھا جو قصبے کی خاموش اور بے کیف زندگی میں کچھ دلچسپی اور رونق پیدا کرتا تھا۔ یہ میلہ بارہ دن تک لگتا تھا۔

ریاست کا نوابی کتب خانہ تھا، جہاں سے مبارک علی صاحب کے والد طلسم ہوش ربا اور داستانِ امیر حمزہ وغیرہ کلاسیکی تصانیف لاتے تھے اور ان کو مبارک صاحب بھی پڑھ کر حظ اٹھاتے تھے۔ آجکل اسی کتب خانے کو حکومتِ ہندوستان نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنادیا ہے۔

ٹونک میں عید کے دن ریاست کی طرف سے شاندار جلوس نکالا جاتا تھا جس میں سپاہی بندوقیں اور ننگی تلواریں لے کر عیدگاہ تک مارچ کیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں مبارک علی صاحب اپنی سوانح حیات ''در در ٹھوکر کھائے'' میں تبصرہ کرتے ہیں:

''اب اندازہ ہوا کہ کیوں بادشاہوں اور حکمرانوں کو جلوسوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے ذریعے وہ اپنی طاقت و قوت، دولت اور شان و شوکت کو ظاہر کرتے تھے تاکہ دیکھنے والے ان سے مرعوب ہو جائیں۔ لیکن جہاں



لوگوں میں حکمراں کی طاقت کا ڈر اور خوف بیٹھتا تھا، ان میں فخر و مباہات کے احساسات بھی پیدا ہوتے تھے کہ ان کا حکمراں کس قدر عظیم و طاقت ور اور دولت مند ہے۔''

ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبارک علی صاحب نوابوں، امیروں اور جاگیرداروں کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ کمزور طبقوں کا استحصال کرتے تھے۔ یوں تو ٹونک میں مشاعرے اکثر ہوا کرتے تھے اور کچھ شاعر قسم کے لوگ بھی ''جعلی شاعری'' کیا کرتے تھے لیکن یہاں گانے کا خاص طریقہ ''چار بیت'' میں مروج تھا جو کچھ قوالی کے نزدیک ہے اور پارٹیاں دف بجا کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ گایا کرتی ہیں۔ یہ صنف افغانستان سے پٹھانوں کے ذریعے روہیل کھنڈ میں متعارف ہوئی اور آج بھی رام پور، بھوپال، امروہہ، مراد آباد، بچھرایوں، چاند پور وغیرہ شہروں میں جاری ہے، لیکن چار بیت کا بڑا مرکز ٹونک ہے۔ مبارک علی کے چچازاد بھائی چار بیت لکھا کرتے تھے جو موقعے کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔

مبارک صاحب کچھ عرصہ مدرسے میں پڑھے جہاں مولوی حضرات طلباء کو ڈنڈے سے پیٹنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے اور جن کو سبق یاد نہ ہو، ان کا کھانا بند کرنا اور ان کے پیروں میں زنجیریں باندھنا بھی مروج تھا۔ اس لئے مدرسے کا تصور عقوبت خانے یا جیل جیسا تھا۔ ویسے بھی ان مدرسوں میں طالبعلم گھر گھر جا کر کھانا مانگتے تھے جو باعزت طریقہ نہیں تھا۔

ٹونک میں نوابین کی حکومت 1947ء تک جاری رہی، جب کہ دیسی ریاستوں کو انڈین یونین یا پاکستان میں ضم کر دیا گیا تھا۔ نواب کے بیٹے ''صاحبزادے'' کہلاتے تھے، جو اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ مبارک علی لکھتے ہیں:

''نواب کے خاندان کے مرد حضرات صاحبزادے کہلاتے تھے۔ یہ لفظ بھی اپنے اصل معنی کھو چکا تھا اور اب اس سے ناکارہ، نکمے اور عیاش مراد لی جاتی تھی۔ معاشرے میں ان صاحبزادوں کی کوئی عزت بھی نہیں رہی تھی۔ ان کا گزارہ اپنی جائیدادوں کی آمدن پر ہوتا تھا جو کم ہو کر بڑھتے ہوئے خاندانوں کے لئے ناکافی ہو رہی تھی۔ اس لئے ان کی حویلیاں ان ہی کی طرح اندر باہر سے خستہ اور بوسیدہ ہو کر آسیب زدہ ہو گئی تھیں۔ حالات کی تبدیلی نے ان صاحبزادوں کو اس طرح سے اپنے بہاؤ میں لیا کہ یہ اس کے دھارے میں گم ہو گئے۔''

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبارک علی نوابوں، جاگیرداروں اور ان کے مفت خور خاندانوں کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ یہ طبقہ دوسروں کی محنت پر پلتا ہے۔ مبارک علی اور ان کے بزرگ 1952ء میں کھوکھراپار کے ذریعے سندھ پہنچے تو یہاں انہوں نے کئی پرانی روایات کو وقت کے تقاضوں کے تحت ٹوٹتے بکھرتے دیکھا، ان میں سے ایک پردے کی روایت تھی۔ یہ وقت پرانی اور مصنوعی عظمتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا وقت تھا۔ سندھ کے ریگزار میں جب انہوں نے بطور مہاجر خیموں میں وقت گزارا اور پھر مال گاڑیوں کے ڈبے میں مویشی کی طرح میرپور خاص پہنچے تو کچھ زندگی اور تہذیب کے آثار نظر آئے۔ حیدرآباد میں کسی طرح سر چھپانے کی جگہ ملی تو نظر آیا کہ یہ گھر اکثر ہندو حضرات کے تھے اور بڑے منقش وصاف ستھرے تھے، لیکن ان کو تقسیم کر کے Slum میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن بااثر اور رشوت دہندگان نے بڑے عالی شان مکانات اور دوکانیں الاٹ کرالی تھیں۔ تعلیم یافتہ عامل سندھیوں کے مکانوں میں اب قصائیوں کی بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ حیدرآباد کے صاف ستھرے پارک، باغ اور کلچرل ادارے ختم ہوئے اور ہر طرف مکان، دوکان اور دفتر بننے لگے۔ آہستہ آہستہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں ادیبوں، شاعروں کی نشستیں جمنے لگیں۔ اختر انصاری، اکبرآبادی کا رسالہ ''نئی قدریں'' ایک ہوٹل سے ہی شائع ہوتا تھا۔ گھروں کی تنگی کو شہر کے ہوٹلوں نے دور کیا تو فضا میں کچھ خوشگواری پیدا ہوئی۔ حیدرآباد کے مشاعروں میں جگر، جوش، فراق، جذبی اور سرور بارہ بنکوی جیسے شاعر انڈیا سے آتے اور داد وتحسین پاتے تھے۔

مبارک علی غریبی اور پسماندگی کے حالات میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ جماعت اسلامی کے دفتر میں ان کو آفس سکریٹری کی ملازمت مل گئی، لیکن تین ماہ تک بیگار کرنے اور تنخواہ کا مطالبہ کرنے پر ملازمت سے نکال دیئے گئے ___ یہ پاکستان میں استحصال کا ان کا پہلا تجربہ تھا۔ انہوں نے کالج میں مباحثوں Debates میں شرکت شروع کی تو ان کی شخصیت میں اپنی بات لوگوں کے سامنے کہنے کی صلاحیت بڑھی۔ ابتدائی پاکستان میں مباحثے سیاسی وسماجی موضوعات پر ہوتے تھے لیکن ایوب خان کے مارشل لاء میں جب خوف کا ماحول پیدا ہوا تو مباحثے بھی بے جان اور موضوع بھی محدود ہونے لگے۔ پھر جب فوجی حکومت نے طلباء یونین پر پابندی لگائی تو جمہوریت کا ایک اور ادارہ ختم ہو گیا۔ مبارک علی اپنی سوانح میں لکھتے ہیں:

''طالب علموں کی مخالفت کی وجہ سے ایوب خاں نے تعلیمی اداروں سے یونین کا خاتمہ کر دیا۔ جب طالب علموں کے لئے جمہوری راستے بند کر



دیئے گئے تو آہستہ آہستہ انہوں نے تشدد کو اپنایا۔ آج جو تعلیمی اداروں میں طالب علموں کا تشدد اختیار کرنا ہے، اس کی ابتداء ایوب خاں سے ہوئی تھی۔ انہوں نے درحقیقت طالب علموں کو غیر سیاسی بنا کر جمہوری روایات پر کاری ضرب لگائی۔ المیہ یہ ہے کہ بعد میں آنے والی حکومتوں نے بھی چاہے وہ آمرانہ ہوں یا جمہوری، اس کو اپنے حق میں پایا، اسی لئے آج تک تعلیمی اداروں میں انتخاب نہیں ہوتے۔''

اس علم دشمن ماحول میں سٹی کالج حیدرآباد (ایوننگ) کے استاد تفضل داؤد جیسے اسکالر بھی تھے جو بجلی جانے کی صورت میں گھر سے لائی ہوئی موم بتی کی روشنی میں کلاسز پڑھاتے تھے۔ داؤد صاحب نے جادوناتھ سرکار کی فرقہ پرستانہ کتاب ''شیواجی دی گریٹ'' کے جواب میں ''رئیل شیواجی'' لکھی اور اس کا نسخہ جادوناتھ سرکار کو دینے کلکتہ گئے تو تعارف ہونے پر سرکار صاحب اٹھ کر گھر کے اندر غائب ہو گئے تھے۔ اس وقت الہ آباد قوم پرستانہ تاریخ نویسی کا گڑھ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ فرقہ پرستی نے تاریخ کو بھی زہر آلود کر دیا اور نتیجہ تقسیم کی شکل میں سامنے آیا۔ داؤد صاحب نے کئی کتابیں لکھیں جو مسودات ہی میں ختم ہو گئیں، وہ کہا کرتے تھے:

''مبارک علی خاں! ہم نے زندگی میں ایک بڑی غلطی کی اور وہ یہ کہ شہرت کی کبھی خواہش نہیں کی۔''

اس لئے مبارک علی لکھتے ہیں کہ خاکساری اپنی جگہ مگر اپنی صلاحیت کو منوانے کے لئے شہرت بھی ضروری ہے۔ داؤد صاحب ہی کی طرح کے طلباء نواز پرنسپل مرزا عابد عباس تھے جو طلباء کی ضروریات کے لئے جیب سے خرچ کیا کرتے تھے۔ سٹی کالج میں مباحثوں اور مشاعروں میں مبارک علی صاحب سرگرمی سے حصہ لیتے تھے اور ایک بار ''دلی کا آخری یادگار مشاعرہ'' کے شو میں انہوں نے مصحفی کا کردار بھی ادا کیا تھا۔

1961ء میں ایس کے رحیم ہائی اسکول میں مبارک علی کا تقرر بطور استاد ہوا، لیکن چھٹیوں میں انہیں ملازمت سے نکال دیا گیا تو وکیل کے ذریعے انہوں نے چھٹیوں کی تنخواہ وصول کی۔ اس کے بعد سندھ یونیورسٹی سے انہوں نے جنرل ہسٹری میں ایم۔اے کیا، جہاں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی احمد بشیر جیسے کشادہ ذہن استاد ملے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی گھر نہیں بنایا اور رات دن مطالعہ وتدریس میں غرق رہتے تھے۔ پبلشروں کے استحصال کو برداشت نہیں کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے

مسودے کتابی شکل حاصل نہ کر سکے۔ بشیر صاحب نے عہدِ واجد علی شاہ کی بی جان طوائف پر ایک ناول لکھا تو ایک مولانا نے جو کتابت کرتے تھے، یہ کہہ کر کتابت کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اتنی فحش کتابت نہیں کر سکتے! ایوب خاں کے نام سے شائع شدہ کتاب Friends Not Master منظر عام پر آئی تو بہت سے پروفیسروں نے خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ریڈیو پر اس کتاب کی ''ادبی فلسفیانہ سیاسی اور تاریخی توضیحات'' شروع کر دیں لیکن بشیر صاحب اس موقع پرستی سے دور رہے۔ اس ماحول کے مضر اثرات پر مبارک علی لکھتے ہیں:

''لوگ ایوب خاں کی آمریت سے ڈر گئے اور اس کی خوشامد و چاپلوسی میں مصروف ہو گئے۔ اس کا فائدہ آنے والے آمروں کو ہوا کہ جنہوں نے معاشرے کی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خوشامدیوں کی ایک فوج تیار کر لی۔ اس سے معاشرے میں افراد کا کردار بدلتا چلا گیا۔ لوگوں میں مزاحمت کے جذبات کم ہوتے چلے گئے اور خوشامد کے عوض اپنی قیمت لگا کر خود کو فروخت کیا جانے لگا۔ مزاحمت کی جگہ سمجھوتے نے لے لی۔''

مبارک علی دیکھ رہے تھے کہ ملک میں آہستہ آہستہ ذہنی وسعت اور فکری کشادگی کے لئے ماحول مخالف ہوتا جا رہا تھا اور اسی لئے سڑکوں، بازاروں اور دینی اداروں میں بھی تشدد کی کارفرمائی نظر آنے لگی تھی۔ اسی گھٹن کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بشیر صاحب جمہوری حکومت کے زمانے میں ملازمت سے نکالے گئے اور خراب وخستہ اپنے وطن قصور میں موت سے ہمکنار ہوئے۔ دوسری طرف ڈاکٹر یار محمد جیسے استاد تھے جو ترقی حاصل کرتے کرتے ڈین فیکلٹی تک ہی گئے، نہ معلوم کیوں وائس چانسلر نہ بن سکے، حالانکہ خاصے تیز طرار آدمی تھے۔ معاشرے اور شعبۂ تعلیم کی بدنصیبی یہ کہ پاکستان میں داؤد صاحب اور بشیر صاحبان کم ہوتے گئے اور ڈاکٹر یار محمدوں کی اکثریت ہو گئی۔

مبارک علی نے 1963ء میں فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے کیا۔ وائس چانسلر نے اس شرط پر ان کو جونیئر لیکچرر مقرر کیا کہ:

''ایک تو کینٹین میں بیٹھنا چھوڑ دو، دوسرے، طالب علموں کو میرے خلاف مت بھڑکانا۔''

شعبے کے سینئر استاد رتبے کا بڑا خیال رکھتے اور نو واردان کو دور دور ہی رکھتے تھے۔ وائس چانسلر بھی پروفیسروں سے پورے ہاتھ کا، ریڈروں سے آدھے ہاتھ کا اور جونیئر لیکچرر سے دور کا مصافحہ کرتے تھے



اور اساتذہ سے انتظار کرا کر ہی ملا کرتے تھے۔ ایک سرکلر ان کے دفتر سے جاری ہوا کہ سالانہ ترقی کے وقت اساتذہ ان کے سامنے پیش ہوں، جس پر سندھی کے پروفیسر جتوئی نے شعر لکھ کر واپس کر دیا۔

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

چونکہ زمانہ ایوب خان کی آمریت کا تھا اس لئے یونیورسٹیوں میں بیوروکریسی کا عمل دخل بڑھنے لگا اور فوج کا کنٹرول بھی۔ نتیجتاً اچھے اسکالر ملک کے باہر نکل گئے یا گمنامی میں بسر کرنے لگے۔ مبارک علی کے ذہن کی تشکیل و تربیت جبر کے اسی ماحول میں ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس دوران میں نے نہ صرف تاریخ پڑھی، بلکہ ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ تاریخ اور ادب کے اس مطالعے سے ہی مجھ میں تاریخ کا شعور پیدا ہوا۔ آج بھی، جب رات کی خاموشی میں لیٹا ہوا میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو ان لمحات کی خوشی و مسرت کو آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ٹالسٹائی کی ''War and Peace'' سردیوں میں پڑھی تھی۔ رات کی خاموشی اور چاند کی ٹھنڈی روشنی کے ماحول میں اس ناول کو پڑھتے ہوئے میرے تخیلات مجھے کہیں کا کہیں لے جاتے تھے۔ دوستوفسکی کی ''Crime and Punishment'' اور ''برادر کرامازوف'' نے ذہن پر گہرے اثر ڈالے۔ ان ناولوں کے ذریعے مجھے انسان کے دکھ کا احساس ہوا۔ اس لئے جب بھی میں نے ''تاریخ پڑھی تو اس میں مجھے ان ناول نگاروں کے احساسات وجذبات کی گہرائی'' نظر آئی۔''

مبارک علی کو کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا شوق ابتداء ہی سے تھا، اس زمانے کے پاکستان میں یوروپ، امریکہ، روس اور بھارت سے کتابیں بغیر روک ٹوک آتی تھیں۔ اردو کے اسکالر احسن فاروقی کے ساتھ یہ بے انصافی ہوئی کہ سندھ یونیورسٹی سے نکالے گئے، پھر کراچی جامع میں ملازمت کی جہاں حکام سے نہ بنی تو دوبارہ سندھ یونیورسٹی میں لیکچرر کے عہدے پر تقرر ہوا جبکہ ان کے شاگرد پروفیسر بن چکے تھے۔ اس ذلت سے مفر حاصل کرنے کے لئے وہ روز ایک افسانہ یا احباب کے خاکے لکھا کرتے اور انہیں سنایا کرتے تھے۔

1963-70ء کے سات سال مبارک علی صاحب سندھ یونیورسٹی میں رہے۔ پی ایچ ڈی کے

لئے اسپین کا وظیفہ ملا مگر وائس چانسلر نے اجازت نہ دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پولیس اور رینجرز آئے دن طلباء اور اساتذہ کے ہاسٹلوں کی تلاشی لیتے رہتے تھے، تا کہ نئی نسل اور اس کے معماروں کو خوف زدہ کر کے احتجاج کے جذبے کو مٹا دیا جائے۔ غلام مصطفیٰ شاہ وائس چانسلر بنے تو انہوں نے سندھی اور مہاجر اساتذہ کی الگ الگ میٹنگیں بلا کر علاقائیت کو بڑھاوا دیا۔ ان سے ملاقات کا ایک منظر:

> ''مجھے یاد ہے کہ میں ظفر حسن شاہ کے ساتھ وائس چانسلر سے ملنے گیا تا کہ ان سے درخواست کی جائے کہ وہ میری ٹریول گرانٹ کے کاغذات بھجوا دیں۔ جب ان کے سامنے پیش ہوئے تو میں نے دیکھا کہ بڑی بڑی مونچھوں والی شخصیت میرے سامنے ہے، یہ وی سی سے زیادہ مجھے تھانیدار لگے۔ میں نے بڑے ادب سے اپنی بات کہی تو کڑک کر انگریزی میں ارشاد ہوا کہ ''اب کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔''

بعد میں یہی شاہ صاحب وزیر تعلیم بنے، اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وزارت میں انہوں نے کتنوں کو بے عزت و بے روزگار و بے وقار کیا ہوگا۔ شاہ صاحب جیسے متعصب افسران کی رکاوٹوں کے باوجود مبارک علی کسی طرح اکتوبر 1970ء میں لندن کے کوئین میری کالج پہنچ گئے۔ یہاں تعلیم کا معیار اور مواقع بہت بہتر تھے، نسلی تعصب بھی تھا، لیکن دنیا بھر کے مخلص دوست بھی۔ بی بی سی (اردو سروس) پر کچھ پروگرام ملنے لگے تو آمدنی کا سہارا ہاتھ آیا۔ ڈبل روٹی کی ایک فیکٹری میں بھی ویک اینڈ پر کام ملا، پھر کرسمس کے موقعے پر بڑے اسٹوروں پر کام کیا، سیل لگتی تھی جو دراصل گھٹیا مال ہوتا تھا۔ یہاں خود محنت کرتے اور اپنے دوستوں کو محنت کرتے دیکھ کر مبارک علی کے دل میں محنت کا وقار اور محنت کش کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔

یہ زمانے یحییٰ خاں کی آمریت کا تھا اور پاکستان (مغربی) کے باشندوں میں بنگالیوں کے بارے میں ناپسندیدگی بلکہ نفرت پائی جاتی تھی، اسی نفرت کا نتیجہ 1971ء کے قتلِ عام اور بنگلہ دیش کی آزادی کی شکل میں ہوا، جس پر فیض نے کہا تھا۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد



لندن میں علمی فضا بڑی موافق تھی لیکن فیس کا بوجھ برداشت نہ کر پانے کی بناء پر مبارک صاحب کو جرمنی کی Rohr یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا اور برطانیہ کا ڈیڑھ سالہ قیام ختم ہوا۔ یہ فروری 1972ء تھی جب وہ جرمنی پہنچے اور ایک نوجوان سے دلچسپ مکالمہ ہوا:

> ''کہنے لگا کہ تم جرمنوں کو کیسا سمجھتے ہو؟'' میں نے کہا، ''وہاں تو جرمنی کے بارے میں ایک ہی بات معلوم ہے اور وہ یہ کہ ہٹلر یہاں کا تھا اور ہمارے ایک شاعر جوشؔ نے تو اسے ''ہٹلر اعظم'' کا خطاب دے دیا تھا۔'' اُس نے چلتے چلتے سر پکڑ لیا اور کہنے لگا ''کیا کوئی بیتھوون، گوئٹے اور شلر کو نہیں جانتا؟'' میں نے کہا جانتے ہوں گے مگر مشہور نہیں ہیں، جرمنی کی پہچان تو اب صرف ہٹلر رہ گیا ہے۔''

بہر حال پارٹ ٹائم کام اور چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے مبارک علی بوخم شہر میں پڑھتے رہے اور 1974ء میں والدین سے ملنے پاکستان گئے تو ذکیہ آپا سے شادی بھی کر لی۔ واپسی جرمنی گئے تو شادی شدگان کا ہاسٹل ملا۔ جرمنی اور یوروپ ان دنوں بائیں بازو کی تحریک کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ ہپی ازم، ویت نام، نکسل باڑی، ایوب خاں کا زوال اور پھر بنگلہ دیش ___ ایسا لگ رہا تھا کہ دنیا سرمایہ داری سے اکتا چکی ہے اور نوجوان اب پرانے نظام کو تبدیل کرنے والے ہیں۔

کون پابندِ جنوں فصلِ بہاراں میں نہ تھا
اس برس ننگِ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

مبارک علی اور بیگم کو تو ہاسٹل یونین نے کمرہ ہی اس شرط پر دیا تھا کہ وہ یونین کی ہڑتالوں اور جلسے جلوسوں میں شامل رہیں گے اور یہی مبارک علی چاہتے بھی تھے۔ یہاں ڈاکٹریٹ کرنے والے کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور نگراں کو ''ڈاکٹر فاٹر یعنی ڈاکٹر باپ'' کہا جاتا ہے اور وہ سلوک بھی مشفقانہ ہی کرتے ہیں، جیسے اپنی اولادوں سے۔ جرمنی کی روایت ہے کہ جب پروفیسر کسی دوسری یونیورسٹی جاتا ہے تو اپنے ریسرچ اسکالروں اور اسسٹنٹ کو ساتھ رکھتا ہے تا کہ وہ بھی نئی معلومات و تجربات سے بہرہ ور ہوسکیں، ہمارے یہاں تو زیادہ تر استاد اپنے شاگردوں سے فاصلے رکھتے ہیں، مگر اپنی نالائق اولادوں کے لئے دس طرح کی بے ایمانی اور حکام کی چاپلوسی کرتے ہیں۔ بقول مبارک علی جرمن نسل پرست Racist تو ہیں لیکن کام کے دھنی اور ایمان دار بھی ہیں۔ اسی لئے لینن نے کہا تھا کہ اگر جرمن کسی ریلوے اسٹیشن پر حملہ بھی کریں گے تو پلیٹ فارم ٹکٹ ضرور خریدیں گے!

1976ء میں مبارک صاحب جب ڈاکٹریٹ کرکے وطن لوٹے تو دو بیٹیوں عطیہ اور شہلا کا اضافہ ہو چکا تھا، دونوں آجکل امریکہ میں والدین کا نام روشن کر رہی ہیں۔

## (2)

ستمبر 1976ء ____ وطن عزیز واپسی، پہلے کراچی ایئر پورٹ، پھر حیدرآباد، سڑکوں پر ڈھول، بجلی ناقابلِ اعتبار، شور شرابہ اور سندھ کی گرمی لیکن گھر تو گھر ہوتا ہے۔

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
در بدر تھے تو یاد آتا تھا

اگلے دن جام شورو یونیورسٹی پہنچے ____ یہ سوچ کر کہ یونیورسٹی اور شعبے کے اساتذہ مبارک باد دیں گے، استقبال کریں گے اور طالب علم پی۔ایچ۔ڈی (جرمنی) کا احترام کریں گے۔ بھٹو شاہی کا زمانہ تھا۔ وائس چانسلر شاعر و دانش ور شیخ ایاز تھے جو دربار سجانے کے شوقین تھے، صدر شعبہ حمیدہ کھوڑو، جنہوں نے مبارک علی کو نہ معلوم کس کمزور لمحے میں دوبارہ جوائن کرا لیا ورنہ بہت سے قوم پرست تو ان کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ شیخ ایاز سے ملاقات کا منظر:

''ہم سب حاضرین دم بخود، خاموشی سے ان کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب شیخ صاحب نہا دھو کر آئے تو سب نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ احمد سلیم نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے ادب کے ساتھ اپنے تھیسس کی ایک کاپی، جو چھپ چکی تھی، ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس کو پلٹ کر اِدھر اُدھر سے دیکھا، پھر پوچھنے لگے ____ ''آپ نے تاج محل دیکھا ہے؟'' میں نے کہا ''جی نہیں۔''
بولے۔ ''پھر مغلوں پر تاج محل دیکھے بغیر کتاب کیسے لکھ دی؟''
سوچا، کہوں کہ غلطی ہوئی، لیکن اب تو ایسا ہو چکا۔ اس کے بعد اُن کی توجہ دوسرے امور پر ہو گئی۔ میں مصاحبوں کے درمیان آدھا گھنٹہ باادب بیٹھا رہا، پھر اجازت چاہی۔''

دسمبر تک تنخواہ نہ ملی، پھر جاگیردار دانش ور شاعر وائس چانسلر نے معطل ہی کر دیا: الزام تھا کہ مبارک علی نے ان سے بدکلامی کی ہے، جرم یہ تھا کہ پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرنے میں زیادہ عرصہ کیوں



لگایا؟ پھر ایک وزیر کی مہربانی سے بحالی کے آثار پیدا ہوئے:
''تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ ایک معافی نامہ لکھ دو۔ باقی میں سنڈیکیٹ سے کرالوں گا۔''
میں نے کہا۔ ''کیسا معافی نامہ؟''
بولے۔ ''یہی کہ تم نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔''
مگر میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔
''بھئی ٹھیک ہے مگر یہ معافی نامہ نہیں ہوگا تو بات مجھ پر آئے گی کہ تمہیں کیوں معطل کیا؟''
میں نے کہا۔ ''یہ آپ کا درد سر ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق؟ اور اگر معافی نامہ دینا ہوتا تو یہ شروع ہی میں دے دیتا۔''

مبارک علی نے معافی نامہ نہ دیا، بس تمام صورتحال لکھ دی۔ شیخ ایاز نے سنڈیکیٹ میں جھوٹ بول دیا کہ مبارک علی نے ان سے معافی مانگ لی ہے اور ملازمت بحال کر دی گئی مگر بقایا جات ضبط کر لئے گئے۔

تاریخ کے ساتھ یک طرفہ تماشا یہ ہوا کہ اسے: ''مسلم تاریخ'' اور ''جنرل تاریخ'' میں تقسیم کر دیا گیا ورنہ ساری دنیا میں تاریخ کو قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید کے زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

مبارک علی ملازمت کی بحالی سے نبرد آزما ہوئے تو اپنے کمرے میں گوشہ نشین ہو کر کام کرنے لگے۔ اس دوران ڈاکٹر احمد بشیر اور دوسرے اہم اساتذہ بھی معطل ہو چکے تھے۔ پھر جب ضیاء الحق کی آمریت آئی تو نظامِ مصطفیٰ بھی اپنے جلو میں لائی۔ پاکستانی لبرل و سیکولر دانش وروں اور سیاسی ورکروں کے لئے یہ دور ابتلا اور عذاب کی سیاہ رات کی طرح تھا۔ اس دفعہ مبارک علی پر الزام لگا کہ انہوں نے مذہبی کتابیں جلائی ہیں۔ مبارک علی نے جواب دیا کہ تاریخ گواہ ہے کہ کتابیں جلانے کا کام ہمیشہ اور ہر ملک میں پابندِ مذہب لوگوں نے کیا ہے ____ لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی اور کمرہ چھین لیا گیا۔ شیخ ایاز نے رنگ بدلا اور اپنے کمرے کے باہر باجماعت نمازیں پڑھنے لگے۔

روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

لیکن نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی۔ اساتذہ اور طلباء نے ان کے خلاف محاذ بنایا اور ہر ممکن الزام لگایا اور حیدرآباد ریجن کے مارشل لاء حاکم کے سامنے شیخ صاحب کو بے عزت کیا گیا۔

منصور کے پردے میں 'خدا' بول رہا تھا

نئے وائس چانسلر ابڑو صاحب بنے تو مبارک علی بمشکل صدر شعبہ بنے اور حمیدہ کھوڑو جو کہ یونیورسٹی کم آتی تھیں، مہینے میں صرف چھ دن حاضری کی تنخواہ پانے لگیں۔

جرمنی سے واپس آ کر مبارک علی نے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر ''علمی وادبی کلب'' کی تجدید کی اور ایک اشاعتی ادارہ 'آگہی' شروع کیا۔ ان کی اولین کتاب ''تاریخ کیا ہے'' اسی ادارے نے شائع کی، لیکن فروخت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ زیادہ تر بک سیلر نادہندہ نکلے۔ کتابت میں اغلاط دکھائی دیں تو مبارک صاحب نے خود کتابت شروع کر دی اور چار کتابیں: ''تاریخ اور شعور''، ''آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان''، ''سندھ کی تاریخ کیسے لکھنی چاہئے'' اور ''تاریخ کے نظریات'' اپنی کتابت سے شائع کیں۔ کتابت کا مرحلہ تو طے کیا لیکن بک سیلروں سے ہار ماننی پڑی۔ اپنی کتابوں کے حوالے سے مبارک علی لکھتے ہیں کہ پنجاب میں ان کی کتابوں کو زیادہ پسند نہیں کیا گیا لیکن سندھ کے چھوٹے شہروں اور دیہات میں ان کی تحریروں کی پذیرائی زیادہ ہوئی اور ان کو لیکچرز کے لئے بلایا جانے لگا۔ لیکن جب 1986ء سے ایم کیو ایم کا اثر بڑھا تو سندھ کی ترقی پسند سیاست بھی سندھی/مہاجر کے سوال پر تقسیم ہو گئی۔

سندھ یونیورسٹی میں مبارک صاحب کو ملازمت تو ملی لیکن کسی اہم کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان کے ساتھ کوئی اسکالر پی۔ ایچ۔ ڈی کر سکا کیونکہ جو موضوع مبارک علی ریسرچ کے لئے تجویز کرتے تھے، یونیورسٹی ان کو مسترد کر دیتی تھی۔

فروری 1985ء میں ایک لیکچر کی دعوت پر مبارک علی لاہور گئے تو نگارشات پبلشرز نے ان کی کتابیں شائع کرنے کی آفر دی۔ یہ رشتہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور رائلٹی کے سوال پر قطع تعلق ہو گیا۔

یونیورسٹی میں گھٹن اور تعصب کی فضا تو پہلے ہی سے تھی، ایک دن حاضری کے سوال پر ایک سیاسی کارندے نے مبارک علی کے ساتھ بدکلامی کی۔ پھر حیدر آباد میں مائٹرنگ، قتل، کرفیو اور جرائم کے واقعات بھی بڑھنے لگے تھے۔ چنانچہ تبادلہ نہ ہو پانے پر انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور لاہور آ گئے۔ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی پانچ سالہ مدت کو سروس سے منہا کر دیا اور ان کو پنشن میں نقصان اٹھانا پڑا۔ بجائے اس کے کہ ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تحسین کی جاتی، یہ ڈگری مبارک علی کے لئے سزا کی وجہ بنا دی گئی۔ لاہور میں اشاعتی ادارے ''مشعل'' کے لئے کام کر رہے تھے کہ جرمن سفارت خانے کے ''گوئٹے انسٹی ٹیوٹ'' کی لاہور شاخ کے ڈائریکٹر بن گئے، کیونکہ جرمن زبان اچھی جانتے ہیں۔ یہاں بھی ماحول سازگار نہ تھا۔ مبارک علی اس عجیب وغریب چویشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمارے معاشرے میں اب تک گورے لوگوں کا بڑا رعب ہے اور ان کا شکار عام طور پر ہمارا طبقۂ امرا اور اس کی خواتین ہیں۔ کیونکہ میں جب بھی



جرمنوں کے ساتھ کسی محفل میں گیا، لوگوں کی ساری توجہ انہی کی طرف ہوتی تھی اور ان کی خوشامد میں سب پیش پیش رہتے تھے۔ اس لئے مجھے یہاں دو قسم کے تعصبات سے واسطہ پڑا: ایک، اپنے لوگوں سے اور دوسرا، جرمنوں سے، جو مجھے اپنے برابر کا درجہ دینے پر تیار نہ تھے۔''

مبارک صاحب گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے بھارت گئے لیکن 1992ء میں انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ I.C.H.R کی دعوت پر اکبر سیمینار میں انہیں بطور تاریخ داں دہلی میں مدعو کیا گیا تو ہندوستان میں بھی ان کی شناخت قائم ہونے لگی۔ 1995ء میں وہ دونوں ممالک کی دوستی کے فروغ کے سلسلے میں ایک گروپ کے ساتھ پھر ہندوستان آئے اور یہاں بہت سے لوگوں سے مراسم قائم ہوئے۔ دہلی میں ان کو بہت سے لوگ ملے جو 1947ء میں ہجرت کر کے مغرب سے آئے تھے اور اپنے وطن اور اپنی زمین کے دیدار کو ترستے تھے، لیکن ویزا کی پابندیاں آڑے آتی ہیں۔ یہی حال مبارک علی صاحب کا بھی تھا جو ہندوستان تو کئی دفعہ آ چکے تھے، لیکن اپنی آبائی سرزمین ٹونک جانے کے لئے ترس رہے تھے۔

پھر مئی 1996ء میں یہ موقعہ بھی نصیب ہوا کہ ٹونک واپس جا سکے۔ یہاں ان کی حالت انتظار حسین کے کرداروں کی طرح ہوئی جو لاہور کے شہر میں رہ کر یو۔ پی کے آم کے باغوں، کوئل کی آواز اور خاموش و پُرسکون گلیوں وقصباتی بازاروں کو یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔ پُرانی یادوں کا ایک خوشگوار منظر مبارک علی کی زبانی:

''میں بس میں جیسے ہی بیٹھا اچانک میرے ذہن میں آیا کہ جن بزرگ خاتون سے بات ہوئی تھی، وہ تو بچپن کی تھیں۔ ایک دم ماضی کی تصویر ذہن میں آ گئی۔ میں چھوٹا سا تھا، اُس وقت بھی کتابوں سے دلچسپی تھی، ہم نے ان کے گھر کے ایک کمرے میں لائبریری بنائی تھی۔ ایک دن میں سر جھکائے کتابیں اٹھائے جا رہا تھا، یہ چبوترے پر کھڑی تھیں، ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا: خوبصورت اور حسین۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''ارے! ذرا نظریں اٹھا کر ہمیں بھی تو دیکھ لیا کرو۔''

میں نے چاہا کہ میں بس سے اتر کر فوراً ان کے پاس جاؤں اور کہوں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی اور بس ترنت جے پور کی

طرف جا رہی تھی۔''

ٹونک کے آبائی مکان اور بچپن کی گلیوں میں چالیس سال بعد جا کر جو حالت مبارک علی کی ہوئی، اس پر جوش ملیح آبادی نے کیا خوب کہا تھا ۔

اپنے کبھی کے رنگ محل میں جو ہم گئے
آنسو نکل پڑے در و دیوار دیکھ کر

(3)

ڈاکٹر مبارک علی اور ان کی اہلیہ ذکیہ آپا مع تین صاحبزادیوں کے 1989ء سے لاہور شہر میں مقیم ہیں اور برصغیر کے تمام شہروں کی طرح یہ مغل شہر اپنی پرانی شناخت کو فراموش کر کے نئی پہچان قائم کر رہا ہے اور شاید یہی تاریخ کا بہاؤ بھی ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا ۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نوید جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی میں قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

مبارک علی گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی رہنمائی اچھے ڈھنگ سے کر رہے تھے کہ جرمنی سے نیا ڈائریکٹر آ گیا اور مبارک علی کو تو برخواست کیا ہی گیا، انسٹی ٹیوٹ بھی بند کر دیا گیا۔ یہ تمام واقعات انہوں نے اپنی خودنوشت ''در در ٹھوکر کھائے'' میں لکھے ہیں اور بڑی ایمان داری و حوصلے سے لکھے ہیں۔ پچھلے سال اس سوانح کا دوسرا حصہ ''میری دنیا'' (فکشن ہاؤس لاہور) کے عنوان سے چھوٹی بیٹی نین تارا کی فرمائش پر لکھا اور شائع ہوا ہے۔ بڑی بیٹی عطیہ امریکہ میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہیں، ان کا داخلہ مشہور گاندھیائی خاتون مرحومہ نرملا دیش پانڈے نے دہلی کی جواہر لعل نہرو یونیوسٹی میں وزیر اعظم اندر کمار گجرال کے خاص حکم سے کرایا تھا۔ شہلا نے وکالت کا امتحان کیا تھا اور وہ فی الحال امریکہ ہی میں وکالت کر رہی ہیں۔ چھوٹی بیٹی نین تارا نے ٹیکسٹائل ڈیزائنر کا کورس کیا ہے اور وہ لاہور میں والدین کے ساتھ رہ کر ہی کام کر رہی ہے۔

''در در ٹھوکر کھائے'' میں اگر واقعات زیادہ تھے تو ''میری دنیا'' میں خیالات و تجربات کی تفصیل زیادہ ہے۔



مبارک علی لکھتے ہیں کہ ملازم اور ملزم میں زیادہ فرق نہیں ہے اور ملازمت کرنا ایسا ہی ہے جیسے غلامی کی زندگی گزارنا۔ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے آخری دنوں میں پاکستان حکومت کا اشتہار سامنے آیا کہ ہائیڈل برگ (جرمنی) میں پاکستان اسٹڈی چیئر کے لئے ایکسپرٹ کی ضرورت ہے۔ مبارک صاحب پُر اعتماد کہ جرمنی سے ڈاکٹریٹ یافتہ اور جرمن زبان سے واقف۔ لیکن تقرر کسی اور صاحب کا ہوا ۔

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ سے برطرفی کے بعد بے روزگاری کے عفریت سے جدال ان کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ کچھ دن C.S.S کے کورس پڑھائے، پھر ''عورت فاؤنڈیشن'' کا آفر ملا کہ ڈائریکٹر کے عہدے پر نصاب تشکیل دیں۔ چھ ماہ کام کر کے ایک سیمینار میں بھارت گئے تو واپسی پر عہدہ چھن چکا تھا۔ پھر جرمنی کے Heinrich Beol Foundation میں ملازمت ملی اور تیسری بار جرمنی جانا ہوا، جو پہلے ہی کی طرح صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ 1996ء کے اس دورے میں پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر 1998ء میں جرمنی جانا ہوا جہاں اسلام پر ایک کانفرنس کا اہتمام فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔ اس دفعہ انہوں نے دیوار برلن کے انہدام کے بعد کے جرمنی کے دونوں حصوں کا اتحاد دیکھا جہاں دولت کی تقسیم نے ہنوز ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے کہ مشرقی جرمنی میں دولت اور چمک دمک نہیں ہے۔ یہ ملازمت بھی زیادہ نہ چل سکی کیونکہ جرمنوں کی نسل پرستی مبارک علی کی انانیت کو برداشت نہ کر سکی۔

ایک نیا سلسلہ یہ نکلا کہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کی پرنسپل ساجدہ وندل نے تاریخ کا ایک کورس پڑھانے کی پیشکش دی۔ مبارک علی نے پڑھانا شروع کیا تو والدین کی مخالفتیں ہونے لگیں کہ یہ صاحب نظریۂ پاکستان ہی کے خلاف ہیں، لیکن ساجدہ وندل مستحکم رہیں اور راولپنڈی کیمپس میں بھی مبارک علی سے ہی کورس پڑھواتی رہیں۔ نئی پرنسپل آئیں تو مطلع کیا کہ راولپنڈی میں کسی صاحب کا انتظام کر لیا ہے، مبارک علی نے کہا کہ NCA لاہور کے لئے بھی کسی اور کو تلاش کر لیں۔ پھر بابر علی انسٹی ٹیوٹ میں ایڈوائزر مقرر ہوئے تو ایک دن مالکن دربار لگانے آ گئیں، چنانچہ یہاں سے بھی رخصت لے لی۔ اس صورتحال پر تبصرہ بزبانِ مبارک علی:

''دراصل نجی اداروں کو ان کے مالک اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور کام کرنے والوں کو مزارع۔ ان کے نزدیک کسی کے علم و فضل کی کوئی عزت نہیں ہے۔

جب چاہیں کسی کا تقرر کردیں اور جب چاہیں اسے فارغ کردیں۔ ملازم
اس ذلت کو اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ یہ ان کے روزگار کا مسئلہ ہوتا
ہے۔ نجی اداروں میں تو یہ سلسلہ ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کے اداروں میں لوگ
اس لئے کام نہیں کرتے کہ ان کی ملازمت پکی ہوتی ہے اور نکالے جانے کا
خطرہ نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔''

ملازمتوں سے تقریباً ایک درجن بار نکالے جانے کے باوجود مبارک علی نے نہ کبھی کسی کی خوشامد
کی اور نہ ہی کسی کا تحکم برداشت کیا۔

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر اسے عیب جانئے یا کہ ہنر
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

اب لکھنا مبارک علی کا شوق بھی تھا اور مجبوری بھی بن گیا تھا۔ انہوں نے روزنامہ ''جنگ'' میں پندرہ بیس
مضامین شائع کرائے لیکن معاوضہ صفر۔ پھر خالد احمد کی ادارت میں ''The Frontier Post'' کے
لئے ہفتہ وار کالم لکھے جو کافی مقبول ہوئے پھر خالد احمد نے اخبار چھوڑا تو مبارک علی نے بھی کالم
لکھنا چھوڑ دیا۔ پھر کچھ دن روزنامہ ''آجکل'' اردو میں کالم لکھے۔ انگریزی کالم کتابی شکل میں
''Historian's Dispute'' اور ''In the Shadow of History'' کے عنوان سے شائع
ہوئے۔ آجکل ''ڈیلی ڈان'' کے لئے کالم لکھ رہے ہیں۔

پاکستان کے ٹیلی وژن چینل بھی مفت امداد یعنی پروگرام میں یقین رکھتے ہیں سوائے سرکاری
PTV کے۔ اسٹار ایشیا چینل کے لئے اقبال سندھو نے چار ہزار روپے فی پروگرام کے حساب سے تیرہ
پروگرام کرائے اور ایک پیسہ نہ دیا۔ ایک تجربہ PTV کا رہا کہ وزیر اطلاعات قمر الزماں کائرہ ملنے آئے
اور پروگراموں کی آفر کی اور یہ شرط بھی مان لی کہ پروگرام سنسر نہیں کئے جائیں گے۔ ''تاریخ اور آج کی دنیا''
کے عنوان سے پروگرام شروع کیا مگر وہاں تو اندر ہی اندر لاوا پکتا رہا، آئے دن مبارک علی کے پروگرام
کے ٹائم بدلے جانے لگے، پھر نہ وزیر ہی رہا اور نہ مبارک علی کا پروگرام ہی۔ مبارک علی لکھتے ہیں:

''اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے لئے روزگار کے تمام دروازے بند ہو
چکے ہیں۔ لیکن حالات انسان کو زندہ رہنا سکھاتے ہیں۔ یونان کے فلسفی
اپی کیورس (Epicurus) نے کہا تھا کہ انسان کو اپنی ضروریات کم کرنی
چاہئیں اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر مطمئن ہو کر خوشی و مسرت کے



ساتھ زندگی بسر کرنی چاہئے۔''

مبارک علی اسی اصول پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ذکیہ آپا اور ان کی تینوں بیٹیاں ان کا بڑا سہارا
ہیں۔ باہر کی دنیا میں تشدد نفرت اور جنون ہے لیکن ان کا گھر گہوارۂ امن ہے۔

## (4)

ڈاکٹر مبارک علی کے ذہن وفکر کو سمجھنے کے لئے ان کی کتابوں اور لیکچروں کا تجزیہ وتشریح ایک
مناسب طریق کار ہوسکتا ہے۔ ان کی اہم کتابوں کی فہرست اس طرح ہے:

تاریخ کی باتیں، پاکستانی معاشرہ، تاریخ کے نئے زاویے، تاریخ کی آگہی، گمشدہ تاریخ، تاریخ
اور آج کی دنیا، تاریخ تحقیق کے نئے رجحانات، سندھ کی تاریخ کیا ہے، تاریخ کی آواز، تاریخ کی
تلاش، انٹرویو اور تاثرات، سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ، تاریخ وتحقیق، تاریخ اور مورخ، جدید تاریخ،
یورپ کا عروج، برطانوی راج، بدلتی ہوئی تاریخ، جاگیرداری، مغل دربار، تاریخ اور سیاست، نجی زندگی
کی تاریخ، تاریخ اور معاشرہ، تاریخ اور دانش ور، سندھ: خاموشی کی آواز، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان،
برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ، علماء اور سیاست، تاریخ اور عورت، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، تاریخ کی
روشنی، المیہ تاریخ، اچھوت لوگوں کا ادب، تاریخ کے بدلتے نظریات، غلامی اور نسل پرستی، تاریخ کیا
کہتی ہے، اکبر کا ہندوستان، جہانگیر کا ہندوستان، تاریخ اور مذہبی تحریکیں، لطف اللہ کی آپ بیتی،
شاہی محل، تاریخ شناسی، تاریخ ٹھگ اور ڈاکو، تاریخ کھانا کھانے کے آداب، کیتھارینا بلوم کی کھوئی
ہوئی عزت، ملحد کا اوورکوٹ، قائداعظم۔ اس طویل فہرست میں دو اردو کتابوں ''در در ٹھوکر کھائے
(سوانح)، اور میری دنیا'' کے علاوہ ان کی انگریزی کتابوں: What History Tells Us اور
Dimensions of History - Pakistan Insearch of Identity کو بھی اس فہرست
میں شامل کر لیا جائے تو مبارک علی صاحب کی وسعت ذہنی اور فکری تنوع اور ذہنی ڈسپلن کا
اندازہ ہوتا ہے۔

مبارک علی تاریخ نویسی کے ترقی پسند دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان وپاکستان وبنگلہ دیش
کی تہذیب وثقافت کو ایک بڑی سیکولر وحدت قرار دیتے ہیں اور برصغیر میں اسلحہ کی دوڑ اور سرحدی
تنازعات کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ ایک سیکولر تاریخ داں ہیں اس لئے ان کی
ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی جریدہ ''تاریخ'' پاکستان وہندوستان کے علمی اداروں اور کشادہ ذہن

دانش وروں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

مبارک علی نے اپنا علمی سفر شرر اور صادق سردھنوی اور نسیم حجازی سے گزر کر پرل ایس بک، تیرتھ رام فیروز پوری، رائڈر ہگرڈ، نذیر احمد، دستوئیفسکی، گوگول، چیخوف، ترگنیف، ٹالسٹائی، گورکی، سولزنسن، وکٹر ہیوگو، بالزاک، فلوبیر، زولا، ڈکنس، جوائس، برانٹے سسٹرز، لارنس اور ہارڈی تک پہنچے۔ پھر بریخت، کپلنگ، جوزف کونراڈ وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ تاریخ تو ان کا موضوع ہی تھا، کالونیل تاریخ بھی پڑھی، قوم پرستانہ تاریخ بھی، پاکستان پرست تاریخ بھی اور ہندوستان کے ترقی پسند تاریخ نویسوں کو بھی، بپن چندرا، رومیلا تھاپر، عرفان حبیب، کنور سحر اشرف، مشیر الحسن، ہربنس کھیا، گیان پانڈے اور شاہد امین کا مطالعہ کیا۔ ہیگل، مارکس، ایڈورڈ سعید، ہرڈر اور ابن خلدون سے انہوں نے گہرے اثرات قبول کئے۔ مبارک علی، خلیق احمد نظامی اور آئی ایچ قریشی کے نظریات سے کبھی متفق نہ ہو سکے۔ اردو میں میر، غالب، اقبال، پریم چند اور قرۃ العین حیدر تک کی تخلیقات کا خاصا مطالعہ کیا اور ایک ڈرامے میں مصحفی کا کردار بھی انہوں نے ادا کیا تھا۔ مغل تاریخ کے علاوہ مبارک علی نے سندھ کی تاریخ اور کلچر پر بھی کافی کام کیا ہے، اسی لئے سندھ کے قصبوں اور گاؤں تک میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ’’ ’چچ نامہ‘ یا ’فتح نامہ‘ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ عربوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں شکست خوردہ داہر اور اس کے ساتھی غائب ہیں۔ یہ ’چچ نامہ‘ ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جب بھی فاتح اپنی تاریخ تحریر کراتے تھے تو اس میں شکست خوردہ غائب ہو جاتے تھے یا ان کا تذکرہ منفی طور پر آتا ہے کہ وہ ظالم، عیاش اور اپنی رعایا میں غیر مقبول تھے، اس لئے ان کی شکست پر عوام نے سکون کا سانس لیا اور فاتحین کو خوش آمدید کہا۔ عربوں کے حملوں کے تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کے حملے اسلام کے ابتدائی زمانے سے شروع ہو گئے تھے جو اُمیّہ حکومت میں جا کر کامیاب ہوئے۔ اس لئے یہ حملے اور سندھ پر قبضہ، یہ امپیریل ازم کا حصہ تھے جب وسط ایشیا اور اسپین میں بھی اسی دور میں قبضے کئے گئے۔ لہٰذا میں نے تاریخ کو مذہب سے نکال کر اس کو سیاسی تناظر میں دیکھا۔‘‘

یہاں مبارک علی کا نقطۂ نظر صاف نظر آتا ہے کہ وہ تاریخ کو مذاہب کے جدال



(Clash of Religions) کے بجائے سامراج کی توسیع کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ اکبر کے عہد میں صرف چار برس فعال رہے اور جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ ان کے خطوط و مکاتیب سے مسلمانوں اور مذہبی حلقوں میں سخت غصہ تھا۔ ان کی تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوؤں اور شیعہ فرقے کو کافر اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ مبارک علی مزید لکھتے ہیں کہ شیخ احمد ہندو۔ مسلم اشتراک کے سخت مخالف تھے اور شریعت کے علم کے حصول کے لئے جدید علوم کو بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ان کے خیالات دوقومی نظریئے کو مستحکم کرتے ہیں، اس لئے پاکستان کے نصاب میں ان کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

ہندوستان و پاکستان کے سیکولر حلقے اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ صوفیاء کی تعلیم معاشرے میں فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کا سدباب کر سکتی ہے۔ لیکن مبارک علی کا خیال ہے کہ تاریخ میں تحریکوں کی پیدائش اور ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس عہد کی سیاسی و معاشی اور سماجی قوتوں پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صوفیاء کے سلسلے اس لئے مقبول ہوئے کہ یہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور حکمرانوں کو اس کی ضرورت تھی کہ کش مکش اور تضادات کو ابھارنے کے بجائے رعایا میں ہم آہنگی اور اشتراک ہو۔ اس لئے انہوں نے بھی ان سلسلوں کی حمایت کی، صوفیاء کو خانقاہیں بنا کر دیں اور ان کے گزارے کے لئے عطیات دیئے۔ صوفیاء نے کبھی حکمرانوں کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کی تعلیم نہیں دی۔ مبارک علی کی دلیل یہ ہے کہ جب صوفیاء اپنے مریدوں کو صبر، قناعت اور شاکر ہونے کی تلقین کریں گے تو اس صورت میں حکومت کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائے گا۔

پاکستان کی سرکاری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو طلباء کو تنگ نظری اور فرقہ بندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ وہ ہندوستان کے روشن خیال تاریخ نویسوں کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ تاریخ مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن آمدورفت کی رکاوٹوں کی بنا پر یہ منصوبہ پروان نہ چڑھ سکا۔ ان کی لکھی ہوئی متوازی تواریخ پاکستان میں کافی مقبول ہیں لیکن حکومتی سطح پر ان کو راندۂ درگاہ ہی رکھا جاتا رہا ہے، چاہے جمہوریت ہو یا مارشل لاء۔

خواتین کی آزادی کے متعلق سے مبارک علی نے کہا ہے کہ آج کے بدلتے ہوئے معاشرے جب کہ ہر شعبے اور ہر پہلو میں تبدیلی آ رہی ہے، عورت کو بھی روایتی زنجیروں سے آزاد ہونا ہے اور یہ کام حالات کر رہے ہیں۔ تحریک نسواں، جو یورپ سے چلی تھی اور وہاں تبدیلی کا باعث ہوئی تھی، اب ہمارے معاشرے میں بھی اس کے اثرات آ رہے ہیں۔ مبارک علی صرف آزادی نسواں

کے علمی پیرو کار نہیں، عملی طور پر بھی انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو بھی مکمل آزادی دے کر تعلیم و تربیت دی ہے، اسی لئے وہ آج اپنے والدین کا نام روشن کر رہی ہیں اور اپنی زندگی کے فیصلے از خود کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

مبارک علی نے ایک کتاب پاکستانی معاشرے پر لکھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے سماج کی پسماندگی کا تجزیہ کیا جائے۔ اس کا ایک دلچسپ مگر منطقی تجزیہ ملاحظہ ہو:

> ''مثلاً اب عام گفتگو میں کہا جانے لگا ہے کہ 'دعاؤں میں یاد رکھنا' اگر آپ کسی کی کامیابی پر مبارکباد دیں تو اس کا جواب ہوگا 'خدا کا فضل یا خدا کا کرم ہے۔' اگر کسی نے رشوت اور بدعنوانی سے دولت اکٹھی کی ہے تو وہ بھی اسے خدا کا فضل ٹھہرا کر اسے پاک صاف کر لیتا ہے۔ اب ہر بات کو خدا سے منسوب کر کے فرد تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔
>
> مثلاً دشمن کے دانت کھٹے کر دیں گے، قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے، قومی مفاد کے لئے جان دے دیں گے، ہم محبِ وطن پاکستانی ہیں، ہمیں اپنے ملک سے محبت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اب لوگ ان جملوں کو، ان کے مفہوم کو سمجھے بغیر بولتے ہیں اور یہ سلسلہ رسماً ہو گیا ہے اور یہ رسمی جملے اب ہماری زبان اور کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔''

مبارک علی صرف سنجیدہ تاریخ داں ہی نہیں، ایک مہذب قسم کی حسِ مزاح Sense of Humour بھی رکھتے ہیں۔ مغل تاریخ کا ایک دلچسپ قصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اکبر نے چار سے زیادہ شادیاں کر لی تھیں اور ان کو شرعی طور پر جائز کرنا چاہتا تھا جبکہ عام تصور یہ ہے کہ اسلام میں (صرف) چار شادیوں تک اجازت ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ ایک رات اکبر نے علماء اور امراء کے سامنے اپنا عائلی مقدمہ بیان کیا۔ اس پر کسی عالم نے تاویل کی کہ شرع میں ''دو دو۔ تین تین۔ چار چار'' شادیاں جائز ہیں جو کل ملا کر اٹھارہ (18) ہو جاتی ہیں! ایک دوسرے عالم نے حساب لگا کر یہ تعداد نو (9) قرار دی۔ بدایونی نے کہا کہ مالکی فقہ میں متعہ جائز ہے۔ اس لئے اسی وقت مالکی فقہ کے قاضی سے فتویٰ طلب کیا گیا۔ اس نے آناً فاناً فتویٰ دے کر اکبر کی شادیاں جائز قرار دے دیں۔ مگر اکبر نے احسان مند ہونے کے بجائے اس قاضی کو عہدے سے برطرف کر دیا تا کہ دوسرے لوگ قاضی کی عطا کردہ رعایت سے فیض یاب نہ ہو سکیں!



## (5)

ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں اور سوانح (اوّل) کے عنوان ''در در ٹھوکر کھائے'' سے شاید کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک تنہا، آدم بیزار، ناپسندیدہ اور روکھے پھیکے انسان ہیں۔ میرا ان سے تعارف شاید 1997ء میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، دہلی کے پارٹیشن سیمینار میں ہوا تھا۔ میں ان کی سوانح پڑھ چکا تھا اور ان کے لئے پسندیدگی اور عقیدت کا جذبہ دل میں پیدا ہو چکا تھا کیونکہ میں ایسے دانش وروں کو پسند کرتا ہوں جو Non-Conformist اور روایت شکن ہوں۔ خود میرے استاد ڈاکٹر قمر رئیس اسی طرح کے ایک عالم تھے۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں سیمینار کانفرنس ہو اور ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ مجھے مرزا حامد بیگ کا ایک جملہ ہمیشہ یاد رہتا ہے جو انہوں نے میرے کالج میں ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اب ہمارے پاس ایک ہی تاریخ داں ہے اور وہ ہیں مبارک علی۔''

مبارک صاحب ہم جیسے خوردوں سے اس درجہ شفقت اور محبت رکھتے ہیں کہ 2010ء میں جب عالمی صوفی کانفرنس میں اسلام آباد گیا تو واپسی میں لاہور ائیر پورٹ پر مجھ سے ملنے آئے، کیونکہ میرے پاس لاہور کا ویزا نہیں تھا۔ اسی تعلق سے وہ خالد علوی، غلام عباس، ظہور خاں (فکشن ہاؤس، لاہور) اور ان کے بچوں سے بھی محبت اور انسیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں احباب کے نام اگر گنوانے شروع کروں تو فہرست لامتناہی ہو جائے گی۔ پھر بھی مبارک علی صاحب کے احباب کے کچھ نام لکھتا ہوں: ظفر حسن شاہ، نایاب حسین، زبید فردوس، شکیل پٹھان، سبط حسن، زاہدہ حنا، اصغر علی انجینئر، اقبال خاں، حامد زیدی، مظہر علی خاں، طاہرہ مظہر علی، قاضی جاوید، علی عباس جلال پوری، اسلم گورداس پوری، نصیر اے شیخ، عبداللہ ملک، عزیز سندھی، ڈاکٹر کمال حسین، حمزہ علوی، پروفیسر ہربنس مکھیا، ڈاکٹر عرفان حبیب، پروفیسر امتیاز احمد، پروفیسر امریک سنگھ، غافر شہزاد، پروفیسر احسن رضا خاں، پروفیسر ستیش سبھروال، پروفیسر گیان پانڈے، رومیلا تھاپر، کے این پانیکر، پروفیسر چپن چندرا، شمس الاسلام، ڈاکٹر انل سیٹھی وغیرہ وہ لوگ ہیں جو مبارک صاحب کے دوست اور عقیدت مند تھے یا ہیں۔ ان میں دو مرحومین ___ نرملا دیش پانڈے (دیدی) اور ڈاکٹر امریک سنگھ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں مبارک علی صاحب کے سرپرست اور بزرگ تھے، نرملا دیدی تو ان کی بیٹی عطیہ کی بھی سرپرست تھیں کیونکہ انہی کی کوششوں سے عطیہ کا داخلہ اور پھر ویزا کا مسئلہ حل ہو سکا تھا ورنہ وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

میں تعلیم حاصل نہ کرپاتی۔

مبارک علی صاحب کے معتقدین میں میرے علاوہ عبدالمعبود، ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہ آباد) اور ڈاکٹر خالد علوی بھی شامل ہیں۔ مبارک علی صاحب ہم پر اس درجہ مہربان ہیں کہ ہماری فرمائش پر لاہور سے بھاری بھرکم کتابیں لانے میں بھی تکلف نہیں برتتے ہیں۔

اور اب آخری سوال ___ کیا مبارک علی ایک کامیاب انسان ہیں؟ اس مشکل سوال کے دو جوابات ہو سکتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک ناکام، تلخ مزاج اور قنوطی انسان ہیں، بلکہ کچھ لوگ تو ان کو سوویت روس اور ہندوستان کا ایجنٹ تک قرار دے ڈالتے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مبارک علی کو ایک بے باک، پھر مصلحت پسند اور راست گو دانش ور سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے سچ بول کر بڑے نقصان اٹھائے ہیں اور آج بھی اٹھا رہے ہیں۔

مبارک علی خود اپنی زندگی کے سود و زیاں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی سوانح ''میری دنیا'' کے آخری صفحات میں لکھتے ہیں:

> ''حبیب جالب کہا کرتے تھے کہ شاعروں نے انہیں موچی دروازے پر اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس سے ان کی حیثیت متاثر نہیں ہوئی بلکہ جنہوں نے انہیں اکیلا چھوڑا تھا، وہ آج کہیں نظر نہیں آتے۔
>
> اب میں سوچتا ہوں کہ کیا میں نے کتابیں لکھ کر اپنی عمر کا بڑا حصہ ضائع کیا؟ ہمارے دوست اسلم گورداس پوری کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ تحریر کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ وہ حوصلہ دیتے ہیں تو سوچتا ہوں کہ لکھتے رہنا چاہیے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میں بالکل تنہا ہوں۔ دوست اور احباب ساتھ ہی ہیں، چاہے ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، ان کے سہارے زندگی گزر رہی ہے۔''

مبارک علی صاحب کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ کتنے لوگ، جن سے ان کا تعارف ممکن ہی نہیں ہے، ان کی تحریریں پڑھ کر ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کی تحریک حاصل کرتے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو مبارک علی کے خیالات سے قوت حاصل کر کے مستقبل کے سماج کو بہتر بنانے کے خواب دیکھتے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو سماج کو جاگیرداری کے اندھیروں میں واپس لے جانا چاہتے ہیں مگر مبارک علی کی پھیلائی ہوئی روشن خیالی سے خوف زدہ ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی، صرف ذکیہ آپا، عطیہ، شہلا اور نینی ہی آپ کے ساتھ نہیں ہیں، مجھ جیسے



سیکڑوں عقیدت مند اور آپ کی تحریروں کے لاکھوں قارئین آپ کے ساتھ ہیں اور آپ نے اپنے لئے عزت اور احترام کی جو جائیداد تعمیر کی ہے وہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

جب برصغیر کی روشن خیال دانش وری کی تاریخ مرتب ہوگی تو آپ کا نام فیض احمد فیض، حبیب جالب، نرملا دیش پانڈے، امریک سنگھ، سبط حسن، سردار جعفری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، حمزہ علوی، ڈاکٹر قمر رئیس، احمد فراز، پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر ہربنس مکھیا اور پروفیسر امتیاز احمد کے ساتھ سنہرے حروف میں شائع کیا جائے گا۔

# ربع صدی کا قصہ

ڈاکٹر ناظر محمود

کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے ایک دن راحت بھائی (راحت سعید) کا فون آیا کہ ڈاکٹر مبارک علی سے رابطہ کرو، وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں حیران کہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریریں پڑھ پڑھ کر تو ہم نے تاریخ کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنا شروع کیا ہے مگر میری ذاتی طور پر نہ اُن سے جان نہ پہچان آخر یہ اچانک مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتے ہیں۔ عقدہ کھلا تو معلوم ہوا کہ اُن دنوں ڈاکٹر مبارک علی لاہور میں ایک اشاعتی ادارے مشعل فاؤنڈیشن کے مدیر تھے اور انہوں نے ارتقاء کتابی سلسلے میں میرا کیا ہوا ایک ترجمہ پڑھا تھا جو مشہور سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) کی کتاب کا پہلا باب تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ ترجمہ خاصا پسند آیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے اس سلسلے میں بات کریں۔ میں نے اُنہیں فون کیا تو انہوں نے مجھے فوراً اس بات پر آمادہ کرلیا کہ میں اسٹیفن ہاکنگ کی کتاب ''A Brief History of Time'' کا ترجمہ مشعل فاؤنڈیشن کے لئے کروں اور مجھے اس کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ اُس وقت میں اردو اخبارات میں فی سبیل اللہ مضامین لکھا کرتا تھا اور جیسا کہ ہمارے اکثر اخبارات کی روایت ہے کہ لکھنے والوں کو بمشکل ہی کچھ معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ پیش کش فوری قبول کرلی اور پھر وہ کتاب ''وقت کا سفر'' کے نام سے نہ صرف شائع ہوئی بلکہ اس کے کئی ایڈیشن بھی آتے رہے اور مجھے معقول معاوضہ بھی ملا جو میری ملازمت کے علاوہ میری کسی تحریر کا پہلا معاوضہ تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر مبارک علی میرے لئے مبارک بھائی ہو گئے جنھوں نے نہ صرف مجھ سے کئی کتابوں کے تراجم کرائے مجھے مسلسل لکھنے پر مائل کرتے رہے۔

مبارک بھائی بہت کم گو ہونے کے باوجود اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ اُن کے پاس بیٹھئے تو



اُنہیں بولنے پر اُکسانا پڑتا ہے۔ بہت وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود میں نے کبھی اُنہیں اپنی علمیت کا رُعب جھاڑتے نہیں دیکھا۔ جب مشعل فاؤنڈیشن کے مدیر بنے تو بہترین کتابیں ترجمہ کر کے چھپوائیں۔ جب گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کے ڈائریکٹر بنے تو اس ادارے کو علم و فن کی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا مگر ان کی صاف گوئی نے اکثر اُنہیں نقصان پہنچایا۔ یہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں جو صحیح سمجھتے ہیں بول دیتے ہیں۔ جو سوچ درست پاتے ہیں اُسے قلم بند کردیتے ہیں اور پاکستانی معاشرے میں نہ پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔ اسی لئے اکثر معاشی پریشانی کا شکار رہے لیکن اصولوں پر سمجھوتہ کرنا انہوں نے نہیں سیکھا اور نہ ہی لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے خاموش رہنا۔

ویسے تو اکثر خاموش رہتے ہیں لیکن جب بولنے پہ آتے ہیں تو تاریخ، ادب، فلسفے اور سماجیات کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی علم کا سیلاب بہہ نکلتا ہے۔ ان کا قلم بے تکان چلتا ہے اور تاریخ و تاریخ نویسی کے نت نئے پہلو اُجاگر کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے برصغیر کی تاریخ کو پاکستان کے ریاستی نقطۂ نظر سے ہٹ کر دیکھا اور دکھایا ہے۔ سید سبطِ حسن کے بعد اگر کسی نے تاریخ کو اتنے بھرپور انداز میں مارکسی نقطۂ نظر کے ساتھ اردو میں لکھا تو وہ ڈاکٹر مبارک علی ہی ہیں۔ ویسے تو علی عباس جلال پوری اور ابنِ حنیف نے بھی اردو میں تاریخ کو خاصا کھنگالا ہے لیکن مبارک بھائی کا اپنا انداز ہے جس نے سیاسی کارکنوں اور سماجی شعور رکھنے والوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔

مبارک بھائی جب سندھ یونیورسٹی چھوڑ کر لاہور منتقل ہوئے تو میرا اور میرے گھر والوں کا لاہور میں ٹھکانہ مبارک بھائی کا گھر ہی بن گیا۔ جب بھی لاہور میں ہوتا تو کسی بھی ہوٹل پر اُن کے گھر کو ترجیح دیتا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مبارک بھائی ہمیشہ کتابیں بانٹ کر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں سے نہ لکھنے کا گلہ بھی کرتے رہتے ہیں لیکن میں نے کبھی بھی انہیں اپنی سوچ یا خیالات یا زندگی گذارنے کے انداز کو دوسروں پر مسلط کرتے نہیں دیکھا۔ مبارک بھائی نے اپنی بچیوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دلوائی اور اُنہیں اپنے فیصلوں میں آزاد رکھا۔ جب میں 1992ء میں اپنی شادی کے بعد صنوبر (میری اہلیہ) کے ساتھ پہلی بار لاہور گیا اور ہم اُن کے گھر ٹھہرے تو اُن کی تینوں بچیوں سے میری اور صنوبر کی اچھی دوستی ہوگئی اور پھر اگلے دس سال میں ہم خود بھی تین بچیوں کے والدین بن گئے۔ ہمیں قدم قدم پر اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت میں مبارک بھائی اور ذکیہ بھابھی کی مثال لینی پڑی۔

مبارک بھائی نے پچھلے پچیس تیس سال میں جو پچاس ساٹھ کتابیں لکھی ہیں اُن میں ذکیہ بھابھی کی معاونت ہمارے سامنے ہے۔ مالی پریشانیوں کے باوجود ذکیہ بھابھی اور اُن کی بچیوں نے جس

طرح مبارک بھائی کو مواقع فراہم کئے کہ وہ سکون سے کتابیں لکھ سکیں اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ایک فلیٹ اور ایک گاڑی پر پچھلے پچیس سال سے گذارہ ہو رہا ہے۔ پچھلے دس برس میں مبارک بھائی کی چھوٹی بیٹی ہی اُن کے ساتھ رہی ہے جبکہ بڑی دونوں بیٹیاں امریکا منتقل ہوگئی ہیں۔ نین تارا (نینی) ہی مبارک بھائی کے لئے آڈیو کتابیں ڈاؤن لوڈ کرتی ہے۔ اُن کی ای میلز دیکھتی ہے۔ اُن کے لئے فون پر نمبر ملاتی ہے اور اپنے پاپا کے لئے ہر دم تیار رہتی ہے۔

یہ ہمارے تعلیمی اداروں کی بدقسمتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے عالم اور تاریخ دان سے پاکستان کا کوئی تعلیمی ادارہ استفادہ نہیں کر رہا۔ جب سے انہوں نے سندھ یونیورسٹی چھوڑی پاکستان کے کسی سرکاری، نیم سرکاری یا نجی تعلیمی ادارے نے مبارک بھائی کو مستقل بنیادوں پر اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ پروفیسر ساجدہ وندل جب تک نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کی سربراہ رہیں انہوں نے ضرور مبارک بھائی کو اپنے ادارے میں لیکچر دینے پر لگائے رکھا مگر یہ سلسلہ بھی اُن کی سربراہی ختم ہونے کے بعد منقطع ہوگیا۔

مبارک بھائی کی زندگی کا شاید سب سے پریشان کن دور وہ تھا جب اُن پر مختلف مقدمات قائم کردیئے گئے اور اُنہیں بلاوجہ کئی سال تک پیشیاں بھگتنی پڑیں۔ پھر ان مقدموں سے بڑی مشکلوں سے چھٹکارا ملا۔ اس دوران مبارک بھائی کو بہت سے لوگوں کو پرکھنے کا موقع ملا جس پر وہ اپنی پہلی آپ بیتی ''در در ٹھوکر کھائے'' میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس دوران وہ کورٹ کچہری کے چکروں میں واقعی در در ٹھوکریں کھاتے رہے اور اُن مقدموں سے نکلنے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ تو بھلا ہو نجم سیٹھی کا جو اُس وقت ڈیلی ٹائمز کے مدیر تھے اور انہوں نے ایک اداریہ مبارک بھائی پر قائم مقدمات کے بارے میں لکھ کر افسوس کا اظہار کیا جسے اُس وقت کے پنجاب کے گورنر خالد مقبول نے پڑھا اور پھر ذاتی دلچسپی لے کر پولیس کے ذریعے وہ مقدمات ختم کروائے۔

مبارک بھائی کی ایک اور خاص بات اُن کا کسی کی مدد کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا ہے۔ ایک بار میں ہندوستان جا رہا تھا تو اُس وقت مبارک بھائی کی بڑی بیٹی عطیہ دہلی کی جواہر لال یونیورسٹی میں ایم فل کر رہی تھی۔ جب مبارک بھائی کو پتا چلا کہ میں دلی جا رہا ہوں تو انہوں نے جھٹ ایک پرچہ جے این یو میں عمرانیات کے پروفیسر امتیاز احمد کے نام اور ایک پرچہ راجیہ سبھا کی رُکن نرملا دیش پانڈے کے نام لکھ دیا کہ ان سے مل لینا۔ ویسے تو میرے بھی دلی میں ذاتی جاننے والے اچھے خاصے تھے لیکن پھر بھی ان دو پرچوں نے میرے قیام کو مزید پُرلطف اور معلوماتی بنا دیا۔



اپنی تقریباً ربع صدی کی رفاقت میں میں نے کبھی مبارک بھائی یا ذکیہ بھابھی کو اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا۔ گو کہ مبارک بھائی زود رنج ہیں اور لوگوں سے بہت جلد ناراض ہو جاتے ہیں لیکن کبھی بھی کسی سے تلخ کلامی یا تکرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک مرتبہ اُنہیں غصے میں دیکھا تھا۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر طارق رحمان نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ گھر سے نکلتے ہوئے مبارک بھائی نے اپنے ڈرائیور سے کہا میں تمہاری رحمان صاحب سے فون پر بات کرا دیتا ہوں تا کہ تم پتا سمجھ لو۔ ڈرائیور نے کہا کہ پتا لکھا ہوا ہے وہاں پہنچ کر فون کرلیں گے اگر دشواری ہوئی تو۔ اب جب اس علاقے میں پہنچے تو مکان مل کر ہی نہ دے اور طارق رحمان کا فون مسلسل ''ابھی جواب موصول نہیں ہو رہا'' کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ اس چکر میں جب خاصی دیر ہوگئی تو مبارک بھائی کا غصہ دیکھنے والا تھا۔ خدا خدا کر کے مکان تو مل گیا مگر اُن کا ڈرائیور مبارک بھائی کے غصے کو آج تک نہیں بھولا ہوگا کیونکہ اسے بے وقوف، احمق، ضدی اور اس طرح کے کئی القابات بڑے جوش سے عطا کئے گئے تھے۔ ہم سب اب بھی اس واقعے کو یاد کر کے اکثر ہنستے ہیں۔

مبارک بھائی قائداعظم کو ہمیشہ جناح صاحب کہتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کے سخت ناقد ہیں خاص طور پر اقبال کے اُن اشعار کے جن میں وہ ''نگاہِ مردِ مومن'' اور ''شمشیر و سناں اوّل'' جیسے خیالات کی ترویج کرتے ہیں۔ مبارک بھائی کے خیال میں اقبال نے پاکستانیوں کا دماغ خراب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اُنہیں چٹانوں پر گھونسلے بنانے اور خودی کو بلند کرنے میں لگائے رکھا ہے جس کی وجہ سے پاکستانی قوم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی گئی ہے اور اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ یہ ''مردِ مومن'' خودکش دھماکے کرنے لگے ہیں اور ہر لحظہ نئی شان نئی آن کے ساتھ تباہیاں پھیلا رہے ہیں۔

مبارک بھائی کو اپنی کتابوں کی اشاعت میں بھی کوئی خاص مالی فائدہ نہیں ہوا اور یہ کام وہ کم و بیش خدمتِ خلق کے طور پر ہی کرتے رہے ہیں۔ پہلے تو جب 1980ء کے عشرے میں انہوں نے کتابیں لکھنی شروع کیں تو اُن کی کتابت تک خود ہی کرتے رہے پھر جب چند ناشروں نے اُن کی کتابیں چھاپنی شروع کیں تو رائلٹی کے نام پر کوئی معاوضہ ملنا کارِ دارد تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اُن کی درجنوں کتابیں چھپ کر ہزاروں کی تعداد میں بکتی رہیں مگر اُن کے ہاتھ میں بمشکل چند ہزار روپے ہی آتے رہے لیکن انہوں نے علم کی ترویج کے لئے کام کارِ خیر سمجھ کر ہی کیا ہے ورنہ وہ سندھ یونیورسٹی کی لگی بندھی نوکری چھوڑتے اور نہ مشعل فاؤنڈیشن یا گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی نوکری سے ہاتھ دھوتے۔

مبارک بھائی اور اُن کی فیملی کا بڑا وصف اُن کی قناعت پسندی اور ہر حال میں خوش باشی ہے۔ گو کہ اب مبارک بھائی کی بینائی خاصی متاثر ہو چکی ہے مگر پھر بھی وہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ روزنامہ ڈان میں اُن کے کالم باقاعدگی سے آتے ہیں جس میں ہر ہفتے ایک نئے اور اہم تاریخی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور پھر اس تاریخی موضوع کے ذریعے پاکستان کے موجودہ حالات کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔

انہوں نے ویسے تو کئی اخبارات کے لئے لکھا مگر زیادہ اخبارات نے اُن کے پیسے دبا لئے سوائے ڈان اخبار کے اور جس کا کریڈٹ وہ اخبار کی انتظامیہ کو ضرور دیتے ہیں۔ سہ ماہی ''تاریخ'' پچھلے کئی سال سے مبارک بھائی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ جس سے آمدنی تو کچھ نہیں بلکہ کچھ اپنے پاس سے ہی لگانا پڑتا ہے۔ البتہ تاریخ جیسے موضوع پر ایک رسالہ باقاعدگی سے نکالنا بذاتِ خود پاکستان جیسے معاشرے میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔

مبارک بھائی ایک باغی ذہن کے مالک شروع ہی سے رہے ہیں۔ اپنے خاندان کے پہلے فرد بنے جس نے اپنی بیوی سے برقع چھڑایا۔ تعلیم کے لئے ایسے شعبے کا انتخاب کیا جسے پاکستان جیسے معاشروں میں کوئی مالی طور پر منافع بخش شعبہ نہیں سمجھا جاتا لیکن پھر بھی انہوں نے اس میں ڈوب کر کسبِ کمال حاصل کیا۔ سندھ یونیورسٹی میں عتاب کا شکار ہوئے تو کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ معافی تلافی کر کے بحال ہو جاؤ مگر مبارک علی خان کہاں اور معافی کہاں۔ اڑے رہے اور پھر کئی برس بعد بحال ہوئے۔ بچیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جانا تھا تو لمحہ بھر توقف نہ کیا۔ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں اس بات پر ڈٹ گئے کہ کسی کانفرنس میں معاوضہ پاکستانیوں کو کم اور جرمنوں کو زیادہ کیوں ملے گا۔ کھڑے کھڑے نوکری چھوڑ دی مگر نہ چھوٹا تو اُن کا لکھنا لکھانا جس کے لئے محاورے میں تبدیلی کرتے ہوئے مبارک بھائی کے ہاتھ دھو دھو کر پینا چاہئیں۔



# نظریہ تاریخ:

## گڑھے مُردوں سے زندہ انسانوں تک

ڈاکٹر روبینہ سہگل

ڈاکٹر مبارک علی سے میری ملاقات سب سے پہلے 1986ء میں ہوئی جب میں امریکہ میں زیرِ تعلیم تھی اور گرمیوں کی تعطیلات کے لئے لاہور آئی تھی۔ چند دوست احباب مجھے ایک لیکچر سننے کے لئے کسی کے نجی گھر میں لے گئے اور بتایا کہ سندھ میں مقیم ایک دانشور لاہور آیا ہوا ہے اور وہ تاریخ کے موضوع پر مقالہ پڑھے گا۔ میرا تجسس جاگا اور میں دوستوں کے ہمراہ ایک نجی بنگلے کے باغ میں گئی جہاں یہ لیکچر ہونا تھا۔

جب مبارک علی سے مجھے متعارف کروایا گیا تو وہ مجھے ایک سادہ لوح شخص لگے۔ اُن میں نہ تو کوئی گھمنڈ تھا، نہ غرور بلکہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ عاجزی اور انکساری سے بھرپور تھے اور بے حد خلوص سے ملے۔ چند اور دانشور بھی وہاں موجود تھے اور اُن سب سے ملاقات کر کے خوشی محسوس ہوئی۔

اُس کے بعد مبارک علی نے تاریخ کے موضوع پر اپنی بات کہی۔ اپنی سادہ زبان اور عام الفاظ میں اُنہوں نے ایک گھنٹہ بات کی اور جیسے جیسے وہ بولتے رہے مجھے لگا جیسے میں ایک اور دنیا میں چلی گئی ہوں کیونکہ وہ ایسی باتیں تھیں جو اُس دن سے قبل میں نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ مبارک علی تاریخ کا بالکل ایک الگ اور منفرد نظریہ پیش کر رہے تھے۔ یہ نقطہ نظر اُس تاریخ سے مکمل طور پر مختلف تھا جو میں نے سکول اور کالج کے زمانے میں پڑھی تھی۔ میں نے ماضی میں کبھی ویسے سوچا ہی نہیں تھا جیسے مبارک علی بتا رہے تھے۔ میرے لئے تاریخ سیاسی اور شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کا ریکارڈ تھی۔ لوگ کہتے تھے ''تاریخ پڑھ کر کیا ملتا ہے۔ یہ تو گڑھے مُردے ہوتے ہیں۔ ان سے کیا فائدہ۔''

لیکن جس نقطہ نگاہ سے مبارک علی تاریخ کے مضمون پر بات کر رہے تھے وہ تو بالکل ہی ایک نیا اور علیحدہ انداز تھا۔ مبارک علی تمام اُن مفروضوں اور نظریات کو رَد کر رہے تھے جو میرے ذہن میں تاریخ کے موضوع سے وابستہ تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ تاریخ صرف شاہی خاندانوں اور امراء کے کارناموں کا ریکارڈ نہیں ہوتی بلکہ تاریخ کے معمار عام لوگ ہوتے ہیں۔ تاریخ لکھنے اور سمجھنے کے بہت سے انداز ہیں مثال کے طور پر تاریخ سیاسی بھی ہو سکتی ہے لیکن اسے ثقافتی، تہذیبی، سماجی پہلوؤں سے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کیونکہ تاریخ عموماً قوم پرستی اور مذہبی زاویئے سے لکھی جاتی ہے اس لئے یہ محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اس میں لوگوں کی عدم دلچسپی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تاریخ پڑھانے کے نئے دلچسپ اور تخلیقی طریقوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

مبارک علی کے لیکچر کے بعد تمام لوگوں پر سحر طاری تھا۔ لوگوں نے بہت سے سوالات کئے اور مبارک علی نے تحمل اور صبر سے ہمارے سوالات کا جواب دیا۔ ان کی باتیں ہمارے لئے نت نئی تھیں اور انہوں نے ہمیں جھنجھوڑ کے رکھ دیا جیسے کسی خواب سے کوئی ایک دم آپ کو جگا دے اور آپ خود کو ایک نئی اور غیر مانوس جگہ پر پائیں۔ پرانے مفروضے ٹوٹ گئے۔ اندازِ فکر کی بنیادیں ہل گئیں۔ روایتی طرزِ سوچ ٹوٹنے لگی۔ میرا تجسس اور جاگا اور میں نے ان کی کتاب ''تاریخ اور آگہی'' حاصل کی اور اپنے ساتھ امریکہ لے گئی جہاں میں نے وہ کتاب پڑھی۔

میں اس کتاب سے بے حد لطف اندوز ہوئی کیونکہ اس کی سادہ زبان سے صاف ظاہر تھا کہ عام لوگوں کے لئے لکھی گئی تھی تاکہ جو شخص تاریخ کے مضمون کا طالب علم نہ بھی ہو وہ بھی اسے باآسانی سمجھ پائے۔ ظاہر ہے مبارک علی کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ کے مضمون کو گڑھے مُردے والی سوچ سے علیحدہ کر کے اسے زندہ انسانوں کی کہانی کے طور پر پیش کیا جائے۔ مبارک علی تاریخ کے مضمون کو مقبول بنانا چاہتے تھے۔ تاکہ لوگ تاریخ سے بور نہ ہوں اور ان میں تاریخی شعور پیدا ہو جو کہ سیاسی شعور کی بنیاد ہوتا ہے۔ اس کتاب سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور 1989ء میں پاکستان واپسی پر میں نے مبارک علی کی دیگر کتابوں کو پڑھنا شروع کر دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میرے غیر رسمی تعلیمی رہنما یعنی (Thesis Advisor) بن جائیں۔

مبارک علی نے خوشی سے یہ رول قبول کیا اور پھر اگلی دو دہائیوں میں انہوں نے ہر طرح سے میری تعلیمی رہنمائی کی اور ہر مرحلے پر میری مدد کی خاص طور پر جب میں حوصلہ شکنی کا شکار ہو جاتی یا کسی وجہ سے مایوس ہو جاتی تو وہ ہمیشہ میری ڈھارس بڑھاتے اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ مبارک علی کے



ساتھ دوستی اور خلوص کا رشتہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ میں ان کے بے پناہ علم و دانش سے مستفید ہوئی بلکہ ان کے حسنِ سلوک اور مروّت سے بھی میں نے بہت پایا۔ ان کی اہلیہ ذکیہ آپا اور ان کی بیٹیاں عطیہ، شہلا اور نینی میرے گھر کے افراد جیسے ہیں۔

بعد ازاں میں نے ان کی بہت سی مختلف کتابیں پڑھیں مثال کے طور پر ''تاریخ اور آج کی دنیا''، ''تاریخ اور عورت'' اور ''تاریخ کے بدلتے نظریات''۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں اور مقالے لکھے مثلاً برطانوی راج، فاشزم، غلامی کا دور، جاگیرداری، صوفیاء کی روحانی سلطنت اور کھانے پینے کے بدلتے آداب۔ تمام کتابیں اور مقالے مقبول انداز میں لکھے گئے تھے تاکہ عام لوگ مستفید ہو پائیں اور معاشرے میں تاریخی و سیاسی شعور بڑھے۔

یہاں ضروری ہے کہ میں چند اُن نظریات کی بات کروں جو مبارک علی نے متعارف کروائے اور جو کہ روایتی تاریخ سے ہٹ کر تھے۔ انہوں نے اس تصور کو عام کیا کہ تاریخ صرف حکمرانوں، بادشاہوں اور شاہی خاندانوں کے کارناموں کا نام نہیں ہے بلکہ تاریخ عام لوگوں کی روزمرہ زندگی میں تبدیلیوں کا ذکر کرتی ہے اور ان تبدیلیوں کی وجوہات کا تجزیہ کرتی ہے۔

مبارک علی کا کہنا تھا کہ تاریخ عام لوگ بناتے ہیں، وہ مزدور جنھوں نے تاج محل بنایا نہ کہ شاہ جہان جس نے محل بنانے کا حکم دیا۔ تاریخ وہ عورتیں بناتی ہیں جنھوں نے زراعت کی ایجاد کی اور معاشروں کے لئے اشیائے خورد و نوش کا انتظام کیا اور مردوں کی پشت پناہی کی تاکہ وہ بڑے بڑے اور عظیم کارنامے سرانجام دے سکیں۔ تاریخ وہ کسان رقم کرتے ہیں جو ہر ایک کا پیٹ بھرتے ہیں اگرچہ خود اکثر بھوکے رہتے ہیں۔ تاریخ ذرائع پیداوار میں تبدیلیوں کا نام ہے اور ایک ارتقائی عمل کا نام ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ انسان نے غار کے زمانے سے کیسے اپنے سفر کا آغاز کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ طرزِ زندگی کیسے بدلنے لگا۔ نئی ایجادات نے کیسے لوگوں کی زندگی بدل دی اور ہر طرح کی نئی دریافت نے کس طرح انسانوں اور معاشروں میں تبدیلی پیدا کی۔ تاریخ کا مطالعہ اگر اس نقطہ نظر سے کیا جائے تو ایک تاریخی اور سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے کیونکہ پھر انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ تاریخ صرف حکمران طبقوں کی شان و شوکت کا نام نہیں ہے۔ ان کی شان و شوکت کی بنیاد عام لوگوں کی محنت و مشقت ہے جس نے یہ شان و شوکت ممکن بنائی۔ اس قسم کی تاریخ پڑھ کر ایک عام شخص کو احساسِ قوت ہوتا ہے اور وہ خود کو بے بس نہیں قرار دیتا۔ اُس میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ وہ اشتراکی اور اجتماعی عمل سے اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ جہاں روایتی تاریخ مایوسی اور بے بسی پیدا کرتی ہے، وہاں متبادل نظریہ تاریخ انسان کو اس کے

اعمال کی افادیت سے آگاہ کرتا ہے۔

مبارک علی قوم پرستی اور مذہبی جنونیت کے تحت لکھی گئی تاریخ کو بے حد تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوم پرستی کے جذبات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی تاریخ جذبات کو اُبھارتی ہے اور منطقی سوچ اور عقل کو مقفل کرتی ہے۔ قوم پرستی کے تحت قلمبند کی گئی تاریخ جنگ وجدل کو فروغ دیتی ہے۔ کیونکہ قومیں اور ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدل میں مصروف رہتی ہیں، لہٰذا ایسی تاریخ جارحیت اور تشدد کے جذبات اُبھارتی ہے۔ اس قسم کی تاریخ میں خون خرابہ، مرنا مارنا، قتل وغارت سب اچھے سمجھے جاتے ہیں اور انسان کے اعلیٰ اور نفیس جذبات کم کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی تاریخ میں خون بہانے کو سراہا جاتا ہے اور موت کی پرستش کی جاتی ہے۔ قوم پرستی اور مذہبی جذبات کے تحت لکھی گئی تاریخ زندگی کو غیر اہم قرار دیتی ہے اور موت کو ترجیح دیتی ہے۔ اس جہان کو ایک عارضی جگہ قرار دیتی ہے اور صرف اگلے جہان کو دائمی اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کی تاریخ ایک ایسی سوچ پیدا کرتی ہے کہ جس میں انسان اس دنیا میں اپنی زندگی میں دلچسپی کھو بیٹھتا ہے اور صرف موت کے بعد کی نامعلوم زندگی پر توجہ دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کسی بھی تعمیراتی، تخلیقی عمل پر یقین نہیں رکھتا اور ہر وقت عاقبت سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔ لہٰذا معاشرے میں ایک جمود پیدا ہوتا ہے جو غور وفکر اور عمل، ہر چیز کو اور تخلیقی صلاحیت کو سلب کر دیتا ہے۔

مبارک علی کے مطابق قوم پرستی اور مذہبی جذبات کے تحت تحریر شدہ تاریخ افراد کو اہمیت دیتی ہے نہ کہ اجتماعی سماجی قوتوں کو۔ اس قسم کی تاریخ میں ایک شخص اہم ہو جاتا ہے اور یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ ایک فرد بناتا ہے۔ نتیجتاً عظمت کا تصور جنم لیتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے کوئی ایک شخص دوسروں کی نسبت عظیم ہے اور عام افراد اُس کے مقابلے میں ادنیٰ ہیں۔ مبارک علی افراد کی پرستش کی مخالفت کرتے ہیں اور اجتماعی سماجی عوامل کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ایسے جملوں سے متفق نہیں ہوں گے کہ شاہ جہان نے تاج محل بنایا، قائداعظم نے پاکستان بنایا، سکندر اعظم بہت عظیم تھا۔ اُن کے ہاں قتل وغارت گری عظمت نہیں ہے بلکہ پستی کی نشانی ہے۔ پاکستان کا وجود میں آنا پیچیدہ تاریخی عوامل کا نتیجہ تھا اور قائداعظم نے تاریخ کو نہیں بلکہ تاریخ نے محمد علی جناح کو جنم دیا۔ تاریخی عمل مخصوص افراد کو منظر عام پر لے آتا ہے۔ مبارک علی شخصی پرستش کو رد کرتے ہیں اور اشتراکی اور اجتماعی عوامل کو اہم قرار دیتے ہیں۔

شخصی پرستش کا ایک عنصر جو کہ قوم پرستی پر مبنی تاریخ کا نمایاں جزو ہے، یہ ہے کہ لوگ تاریخ میں



ہیرو اور ولن کی تلاش کرتے ہیں۔ ایک طرف غازی اور شہید بنا لئے جاتے ہیں تو دوسری طرف غدار اور دشمن۔ قوم پرستی کے جذبے سے سرشار تاریخ معروضی نہیں رہتی بلکہ قتل وغارت گری کرنے والوں کو ہیرو بنا لیتی ہے۔ مثال کے طور پر محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کی جارحیت اور قتل وغارت گری کو خوب سراہا جاتا ہے اور اُن کی خونریزی اور ظلم کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی استعماری قوتوں کی تعریف کی جاتی ہے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں جنگ وجدل کے جذبات اُبھارے جاتے ہیں۔ اس طرح امن وامان سے جڑے جذبات مخدوش ہو جاتے ہیں۔

قوم پرستی پر مبنی تاریخ جہاں ایک طرف ہیرو کی تلاش میں رہتی ہے، وہاں دوسری طرف دُشمن اور غداروں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر پاکستانی مورخ، خصوصاً وہ جو کہ درسی کتب تحریر کرتے ہیں، میر جعفر اور میر قاسم کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق میر جعفر نے سراج الدولہ سے بے وفائی کی اور میر قاسم نے ٹیپو سلطان کو دھوکہ دیا۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان مسلمانوں کے بڑے ہیرو مانے جاتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ خوف پیدا کیا جاتا ہے کہ قوم کے دُشمن اور غدار چاروں طرف موجود ہیں، لہٰذا قوم سے ہر دم وفاداری ہونی چاہئے، خواہ حکمران طبقے آپ کو کچھ نہ فراہم کریں۔ اس وفاداری کی سب سے بڑی نشانی فوج قرار دے دی جاتی ہے اور ہر ایک کے دل میں قوم کی خاطر لڑنے اور مرنے کے جذبات پیدا کئے جاتے ہیں۔ فوج کو وفاداری کا پیکر اور سیاسی رہنماؤں کو غداری کی علامت بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ فوج ہمیشہ ملک وقوم کو بچاتی ہے جبکہ جمہوری قوتیں توڑنے پر تُلی ہیں۔ چنانچہ ہیرو اور غدار کا موازنہ کر کے لوگوں کے دلوں میں نہ صرف خوف پیدا کیا جاتا ہے تاکہ وہ قربانیوں کے لئے تیار رہیں، بلکہ دُشمن کی ساخت بھی اس طرح سے کر دی جاتی ہے کہ یوں لگے جیسے وہ انسان ہی نہیں ہے۔ اُسے مارنا نیکی کا کام ہے۔ اس بات کو قطعی طور پر بھلا دیا جاتا ہے کہ کوئی بھی شخص خواہ کس بھی قوم، ملک، مذہب یا گروہ سے تعلق رکھتا ہو پوری طرح اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص میں خوبیاں اور اچھائیاں دونوں ہوتی ہیں۔

اگرچہ مبارک علی مذہبی یا قوم پرستی سے متاثر تاریخ کے مخالف ہیں، اُن کے خیال میں تاریخ حتمی طور پر یا مکمل طور پر معروضی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر شخص جب تاریخ قلم کرتا ہے تو مکمل طور پر اپنے تعصبات کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ وہ حقائق کے وسیع سمندر میں سے کون سے حقائق کا انتخاب کرے گا اور کون سے نظر انداز کر دے گا، اس بات کا انحصار اس کے نقطہ نظر پر ہے۔ مثلاً مارکسی سوچ رکھنے والا مورخ مخصوص حقائق کو چن کر اُن کا تجزیہ کرتا ہے، خواتین کے حقوق کی علمبردار تحقیق دان اُن حقائق کا انتخاب کرتی ہیں

جن سے اُن کا نقطہ نگاہ فروغ پائے اور مزدوروں یا کسانوں کی تحریک سے منسلک مورخ ایسے حقائق کی تلاش کرتا ہے جو اُس کے نظریے کی تائید کریں۔ مکمل طور پر معروضی ہونا تو کسی بھی مضمون میں ممکن نہیں ہوتا، تاہم مبارک علی کا نظریہ یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو اپنے تجزیے کو جذبات اور تعصبات سے پاک رکھ کر منطقی سوچ کے مطابق کرنا چاہیے۔

مبارک علی کا نظریہ تاریخ یہ ہے کہ ماضی اور حال کو ایسے قلمبند کیا جائے کہ لوگوں میں سیاسی وسماجی شعور بیدار ہو، اُن کے اندر امن وامان کے جذبات پیدا ہوں، اُن کے نفیس اور خوبصورت جذبات کو اُبھارا جائے۔ مثال کے طور پر اگر انسان کے کارناموں کا ذکر کرنا ہو تو عسکریت پسندی کی بجائے انسانی تخلیق کے کارنامے چنے جائیں۔ انسان کی فنونِ لطیفہ اور علم کی ترقی کو سراہا جائے مثلاً مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی کے نمایاں کارناموں کو سراہا جائے تاکہ جنگ وجدل کے جذبات کم ہوں اور حسن ودلکشی کو داد دی جائے۔

مبارک علی کے ہمراہ سینکڑوں بیٹھکوں کے دوران میں نے اُن سے بے پناہ علم حاصل کیا۔ وہ ہر چیز کو تاریخ کے زاویے سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ ہر واقعہ اور قصہ کو تاریخ کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔ موجودہ دور اور حال کے واقعات اور عوامل کو تاریخ کے تناظر میں سمجھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اُن کے پاس بیٹھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر شے تاریخی ہے اور کسی بھی سماجی عمل کی تاریخ سمجھے بغیر اُسے پرکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ دوستی نے مجھے یہ سکھایا کہ تاریخی شعور ہر انسان کے لئے بے حد ضروری ہے۔

مجھے مبارک علی کے ہمراہ آگرہ میں تاج محل اور بعد ازاں فتح پور سکری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ 1996ء میں ہم نے آگرہ اور جے پور کا سفر اکٹھے کیا۔ اگر میں تاج محل اور فتح پور سکری خود دیکھنے جاتی تو خوبصورت عمارات سے لطف اندوز ہو کر لوٹ آتی۔ مگر مبارک علی نے ان تاریخی مقامات کو زندہ کر دیا۔ انہوں نے ان عمارات کے چپے چپے سے جڑے واقعات بیان کر کے میرے لئے ایک جیتی جاگتی حقیقت کا گمان پیدا کیا۔ مجھے لگا جیسے میں اپنی نظروں کے سامنے وہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ تاریخی مقامات کسی مورخ کے ہمراہ ہی دیکھنے چاہیں ورنہ وہ ماضی کے گڑھے مُردے ہی لگتے ہیں اور اُن میں زندگی اور جان نظر نہیں آتی۔ مبارک علی کے تبصرے نے ان مقامات کو زندہ کر دیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ان کی کتابوں سے احساس ہوتا ہے کہ تاریخ گڑھے مُردوں کی بھوت کہانیوں کا مرقع نہیں ہوتی بلکہ زندہ انسانوں کی جیتی جاگتی داستان کا نام ہے۔ مصوری،



فنونِ لطیفہ، سائنس، علم ودانش، دلکش مجسمے جو پوری دنیا میں نظر آتے ہیں اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسان کی زندگی کی کہانی ہوتی ہے۔ اتنی خوبصورتی اور حسن وجمال گڑھے مُردے نہیں تخلیق کر سکتے۔ تاریخ انسان کے ان اصل کارناموں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

میں مبارک علی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے سوچنے کا یہ نیا انداز دیا اور روایتی تاریخ پر مبنی سوچ کو گڑھا مُردہ بنا دیا۔

# ایک ٹیڑھے خان صاحب کی کہانی

وسعت اللہ خان

خان صاحب بڑے غلام علی خان چونکہ صاحبِ تان تھے، قراۃ العین حیدر ایک ادیبہ تھیں، جوگندر ناتھ منڈل ایک قانون داں سیاستداں تھے لہٰذا انہوں نے جلد ہی تاڑ لیا کہ مستقبل کیسا ہے۔ ہمارے ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو بھی فوراً اندازہ ہو گیا تھا "کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔" مگر وہ یہ اندازہ ہوتے ہی حوصلہ ہارنے کے بجائے سحرِ کاذب کو سحرِ صادق سے بدلنے کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ چونکہ ٹونک کے پٹھان ہیں لہٰذا جوش صاحب کی طرح طبیعت کی خانصابی کبھی نا گئی۔ دردر ٹھوکر کھانے کے بعد ستر (70) کے پیٹے میں بھی بانکپن کی خودداری کا یہ عالم کہ خود پے قیامت بھی گذر جائے تو منہ سے سی نا نکلے۔ جسم مضمحل سہی مگر ریاکاری کے اندھیرے کو قلمی تلوار سے کاٹنے کی دُھن اب بھی تپ کی طرح جوان وسوار ہے۔

ہوسکتا ہے یہ کوئی اہم بات ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے عرق ریز تصنیفات کی نصف سنچری مکمل کر لی ہے۔ مگر پچاس سے زائد کتابیں تو کئی لوگ لکھ چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب بہت اچھے ٹیچر ہوں۔ مگر بہت اچھے ٹیچر تو بہت سے گذرے ہیں۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب اعلیٰ پائے کے محقق ہوں۔ مگر اعلیٰ پائے کے محقق تو دنیا میں کئی ہیں۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب بہت ملنسار، خلیق اور اعلیٰ انسان ہوں لیکن یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں۔ ذرا سی کوشش سے ایسے اوصافی لوگ اب بھی مل جاتے ہیں۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں ایسا خاص اگر کچھ بھی نہیں تو میں ان پر کیوں لکھنا چاہتا ہوں؟

شاید اس لئے کہ کم از کم پاکستان میں ڈاکٹر مبارک علی اس وقت واحد مورخ ہیں جنہوں نے تاریخ کے مضمون کو ادق مباحثوں، نیم دانشورانہ ڈرائنگ رومز، کرم خوردہ سرکاری لائبریریوں کے جمائی پسند تھکیلے عملے، روبوٹی مزاج اساتذہ، انکریمنٹس کے تعاقب میں تحقیقی مقالے چھپوانے پر مجبور تدریسی



مخلوق، ریٹائرڈ جرنیلی ونوکر شاہی پس منظر والے جز وقتی واعظ بازوں، دس بائی چودہ کی سکرین کے اندر بند ذہنوں کے ساتھ براجمان لال بجھکڑوں، لال بیگ سے اکبرِ اعظم تک ہر موضوع پر سائیکلوسٹائل گفتگو کی گریوی تیار رکھنے والے علمی باورچیوں، درباری نسخہ جات کی بنیاد پر نصابی معجون کوٹنے والوں اور تاریخی میٹریل کے کٹ پیسوں سے ہر سائز کے ریڈی میڈ ڈسپوزایبل فکری لباس سینے والے بزازوں کے چنگل سے نکال کر اسے قابلِ یقین، زود ہضم، عام فہم انداز میں ایسے کتابی ساشوں میں پیک کر دیا کہ تاریخ کا مضمون اب ذرا سا بھی شغف رکھنے والے عام آدمی کی دسترس میں آ گیا ہے۔

ٹونک سے مہاجرت کے بعد جام شورو یونیورسٹی کی زمین میں سائنٹیفک عوام دوست تحقیق کا جدید پودا لگانے کے جرم میں اردگرد اُگ آنے والی خودرو خاردار سازشی جھاڑیوں سے بچنے کی خاطر لاہور کی برج کالونی کے ایک عام سے فلیٹ میں رہائش پذیر ڈاکٹر صاحب سماج میں جینے کے لئے درکار ضروری علمی تکبر اور نخوت تک سے عاری ہیں۔ یوں مروجہ مادی پیمانوں کے اعتبار سے وہ ایک ناکام آدمی ہیں۔ یہاں کی کنفرمسٹ دانش گاہوں میں ان کے لئے احترام ضرور پایا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دراصل ان کے منفرد کام سے ہر لکیر کا فقیر احتراماً گھبراتا ہے تاکہ ان سے باضابطہ استفادہ نہ کرنا پڑ جائے۔ اس کے باوجود خانصابی طبیعت کے اسیر ڈاکٹر صاحب بیرونی جامعات سے آنے والی پیش کشوں کو ٹھکرا کر ویسا ہی لطف کشید کرتے ہیں جیسا سارتر نے نوبیل انعام ٹھکرا کر کشید کیا ہو گا۔

ادب کے محاذ پر جن جن اصحاب واصحابیات نے دادِ شجاعت دی ان میں سے اکثر نے کسی نا کسی دورِ حکمرانی میں اس شجاعت کی داد مع سود وصول کر لی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب چونکہ تعلیم میں حقائق کی خیانت کی وباء کے پیچیدہ مرض سے برسرِ پیکار ہیں لہٰذا فوجی دور ہو کہ سویلین، آمریت ہو کہ آمرانہ جمہوریت۔ وہ کسی حکمراں اور کسی دور کے کام کے نہیں۔ ایک دور میں انہیں جانے کس غلط فہمی میں ہسٹری کمیشن میں شامل کر لیا گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ شامل کرنے والوں کو جلد ہی غلطی کا احساس ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب پھر سے اپنے مانوس کمرے میں لوٹ آئے۔

پھر بھی ایک ایسے زمانے میں جب اعلیٰ تعلیمی اداروں میں درست تاریخ تو کجا مسخ تاریخ پڑھانے اور پڑھنے والے بھی نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ناکامی سے کام لیتے ہوئے کچھ ایسے محققین پیدا کر دیے ہیں جن کے سبب ڈاکٹر صاحب کی مبنی بر حقائق سچائی کی تلاش کا کام ویسا پھل دار درخت ضرور بن جائے گا جس کی جڑیں دور تک اپنی ہی زمین میں پھیلی ہوئی ہوں گی اور اس کے سائے تلے مستقبل کے تحقیقی مسافر دم لے سکیں گے اور اس درخت کے کچھ بیج اپنے سامان میں

باندھ کر آگے بھی بڑھ سکیں گے۔

دراصل یہی مسافرانِ تلاشِ حقیقت تاریخ کے مضمون کو ایک بت بنا کر جہل کا چڑھاوا وصول کرنے والے پروہتوں اور عقیدے و تاریخ کو خلط ملط کرنے والے تخیل باز مداریوں سے ہماری آپ کی جان چھڑائیں گے اور اگر ہم نہیں تو ہمارے بچے سینہ ٹھونک کے کہہ سکیں گے کہ

کوئی قاتل نہیں گذرا ایسا
جس کو تاریخ بچا کر لے جائے

(علیم)

کاش ڈاکٹر صاحب ایسے نہ ہوتے۔ ذرا سی دنیادار روایتی شخصیت ہوتے۔ آئینِ نو سے ڈرتے طرزِ کہن پہ اڑتے۔ خسارے کو منافع نہ جانتے۔ افسروں کی چھوٹی موٹی فرمائشوں کو بھی بجالانے میں کیا حرج تھا۔ خود در در ٹھوکر کھانے کے بجائے فنِ تحقیق کو بندر کی طرح گلی گلی، ایوان در ایوان، دفتر در دفتر نچوا کر داد و تحسین و مال بٹورنے والے کرتبی بننے میں کیا قباحت تھی۔

کاش وہ بھی اہلِ طاقت اور ان کے مصاحبین کے ناز اٹھاتے اور باہر آ کر اپنی جراتِ رندانہ کے افسانوی قصے سنا کر ہم جیسوں کو مرعوب کرتے اور ٹائی کی ناٹ درست کرتے کرتے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھتے بیٹھتے ہم سے ایک کاروباری سی مسکراتی معذرت کرتے کہ معاف کیجئے مجھے گورنر صاحب یا وزیر اعلیٰ صاحب یا سیکرٹری ایجوکیشن صاحب یا یوایس ایڈ صاحب نے ایجوکیشنل ریفارمز پر ایڈوائس کے لئے نہ بلایا ہوتا تو آپ سے مزید گپ شپ رہتی۔

اگر ایسا کچھ ہو جاتا تو اس سے فوری فائدہ تو یہ ہوتا کہ میں یہ مضمون لکھنے سے بچ جاتا کیونکہ مجھ دنیادار کے دماغ کو اس کائنات کے منصور، سرمد اور مبارک وغیرہ بالکل سمجھ میں نہیں آتے۔

پھر بھی دل یہ کہنے پر جانے کیوں بضد ہے۔

تھینک یو ڈاکٹر مبارک علی صاحب۔۔۔!



# ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں

قاضی جاوید

ڈاکٹر مبارک علی کے مداح ہزاروں ہیں اور میں اپنا شمار اُن میں کرتا ہوں۔ اُن سے نیاز مندی کی ایک تہائی صدی بیت چکی ہے۔ وہ 1970ء کی دہائی کے آخری سال تھے جب مجھے ڈاکٹر صاحب کی دو پہلی کتابوں "المیہ تاریخ" اور "برصغیر کے مسلم معاشرے کا المیہ" کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ انہی دنوں ملتے جلتے موضوعات پر میری ایک دو کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ وہ میرے لئے کچھ سہانے دن نہ تھے کہ کئی الجھنوں نے گھیر رکھا تھا۔ چنانچہ ایک ہم خیال دوست تک رسائی پانے کی خواہش سے مغلوب ہو کر میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط بھیجا۔ اُس زمانے میں وہ سندھ یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد تھے۔ خط اُن تک نہ پہنچا اور میں جواب سے محروم رہا۔

ڈاکٹر مبارک علی سے میری پہلی ملاقات 1985ء میں ہوئی جب وہ لاہور آئے تھے اور معروف صنعت کار نصیر اے شیخ صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پروفیسر وارث میر مرحوم نے مجھے اس بارے میں اطلاع دی اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ وہ خوش بختی کا کوئی لمحہ تھا کہ ایک ملاقات نے دو دوست بخش دیئے ___ ایک ڈاکٹر مبارک علی اور دوسرے نصیر اے شیخ۔ بعد میں کئی برسوں تک ڈاکٹر صاحب لاہور آتے رہے اور چھاؤنی میں شیخ صاحب کی رہائش گاہ پر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونیورسٹی سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی اور لاہور منتقل ہو گئے۔

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو گزرے ہوئے برسوں کی درجنوں ملاقاتیں یاد آ رہی ہیں۔ خیر، یہ ایک الگ داستان ہے جو شاید کبھی کاغذ پر آ جائے۔ یہاں البتہ میں چند باتیں ڈاکٹر صاحب کی نگارشات کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ اُن کی تحریروں کی جن خوبیوں نے ہم سب کو متوجہ کیا ہے، اُن

میں سے دوتین تو بالکل عیاں ہیں ____ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں تاریخ کے جدید انداز نگارش کو متعارف کروایا ہے۔ ہمارے مورخین عام طور پر تاریخ کو الٰہیات، قوم پرستی اور دوسرے قومی، مذہبی اور اصلاحی جذبوں سے گڈمڈ کرتے رہے ہیں۔ ان جذبوں کے غیر ضروری بوجھ سے تاریخ کو آزاد کرنا سہل نہ تھا۔ اس کے لئے ایک موثر اور بڑے مورخ کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں نے ہمارے ہاں تاریخ کو سیکولر اور جدید طرزِ احساس کے حوالے سے مرتب کرنے کا فرض خوبی سے ادا کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں تاریخ کو ایک بامعنی انسانی عمل کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتابیں محض معلومات مہیا نہیں کرتیں بلکہ نیا شعور بھی عطا کرتی ہیں۔ وہ ماضی کے حوالے سے حال کے فہم کا راستہ بناتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موٹی موٹی کتابیں نہیں لکھتے۔ وہ مختصر کتب لکھتے ہیں اور سلیس اور قابل فہم زبان بروئے کار لاتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قارئین سے محبت کرتے ہیں اور اُن کو ساتھ لیتے ہوئے آگے کی طرف چلتے ہیں۔

یہ ہوئیں تین باتیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نصابی کتب لکھی ہیں اور نہ ہی وہ محض تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے علماء وفضلا کے لئے لکھتے ہیں۔ وہ عام تعلیم یافتہ لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ تحریری عمل کے دوران اُن کے پیش نظر جو امکانی قارئین رہتے ہیں، وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ذہین اور تعلیم یافتہ افراد ہیں جو اپنے سماج کو اور اپنی دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں اور بدلنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ ان میں مثال کے طور پر طالب علم، استاد، ادیب، صحافی اور دانش ور شامل ہیں۔ یہ سب وہ صاحبان ہیں جو سماجی تبدیلی کے عامل بن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ افتادگانِ خاک کے لئے لکھتے ہیں۔ سبب انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جب عوام کو تاریخ میں جگہ نہ ملے تو ان کی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ اُن کی زندگیاں بے معنویت کی زد میں آ جاتی ہیں۔

یہ ایک نیا نقطہ نظر ہے۔ ہمارے ہاں، اس سے پہلے، عوام کے زاویہ نگاہ سے تاریخ نہ لکھی گئی تھی۔ خیر، مجھے احساس ہے کہ بعض لوگ مجھ کو ٹوکتے ہوئے مارکسی مورخین کا حوالہ دینا چاہیں گے۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ بے شک ہمارے مارکسی دانش ور عوام کے حوالے سے تاریخ کو سمجھنے کے مدعی ہیں۔ مگر انہوں نے تاریخ نگاری پر زیادہ توجہ دی نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی اور مارکسی دانش وروں میں مطابقتیں تلاش کر لی جائیں تو بھی دونوں کے نکتہ ہائے نگاہ میں ایک نازک سا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخی مادیت کے اثرات قبول تو کیے ہیں، لیکن وہ مارکسی نہیں ہیں۔ وہ کچھ کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔



ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ فلسفہ تاریخ کی تشکیل کے دوران کارل مارکس کا رویہ ضرورت سے زیادہ یورپ پرست رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مارکس نے تاریخ کا جو تصور دیا ہے، اُس میں بنیادی طور پر یورپی ماڈل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ وہ یورپی تاریخ کی اساس پر نظریہ سازی کرتا ہے اور اُس سے اخذ ہونے والے نتائج کا اطلاق غیر یورپی دنیا پر کرتا ہے۔ اصل میں ہیگل بھی اسی انداز نظر کا شکار تھا اور اُس نے یورپ کو توجہ کا مرکز بناتے ہوئے مشرقی دنیا اور خصوصاً ہندوستان کو تاریخ سے خارج کر دیا تھا۔ مارکس بھی کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ، یہ کہنے پر آمادہ ہو جاتا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس خطے کی کوئی تاریخ نہیں ہے یا یہ کہ اس خطے کی تاریخ لکھی نہیں گئی۔ ہاں، اس کا مطلب یہ ضرور ہے کہ تاریخ کے انیسویں صدی کے جرمن کلاسیکی فلسفہ کے زاویے سے تاریخ سازی اور تاریخی عمل کو رواں دواں رکھنے والے جو عوامل ہوتے ہیں، وہ ہندوستان میں عنقا تھے۔

کئی تحریروں میں ڈاکٹر مبارک علی نے اس موقف پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اُس کو مغالطہ آمیز ٹھہرایا ہے۔ تاہم وہ مانتے ہیں کہ تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے مارکس کے کئی نظریات بہت اہم ہیں۔ اُن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہندوستان یا مشرق کی دوسری تہذیبوں کا مطالعہ یورپی ماڈل کی بنیاد پر یا یورپی فریم آف ریفرنس میں نہیں کیا جانا چاہئے۔ ان تہذیبوں کا تاریخی عمل اور اُس کے مقولات یورپی تاریخ سے بہت مختلف ہیں۔ لہٰذا اُن کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا جانا چاہئے۔ مارکس اور مارکسی تاریخ نگاروں سے یہ اختلاف جہاں ڈاکٹر صاحب کے مخصوص انفرادی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتا ہے، وہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نظریئے کے حوالے سے تاریخی حقائق کو دیکھنے کے بجائے حقائق کو اولیت دیتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ میری اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ڈاکٹر مبارک علی مغربی دنیا کی نئی اور مقبول تجربی رسائی (Empirical approach) کی جانب مائل ہیں۔ تاریخ کو لکھنے کا یہ رویہ دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں اور علمی حلقوں میں معتبر مانا جانے لگا ہے اور ہمارے تاریخ دان اور دانش ور حلقوں میں اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ عقل عامہ بھی اس کی تائید کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ بظاہر اس تصور کی نفی کرنے والے دلائل کو تلاش کرنا محال ہوتا ہے کہ مورخ کا کام بس یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ پیش آیا ہے، وہ اُس کو جوں کا توں ریکارڈ میں لے آئے۔

کاش یہ ممکن ہوتا۔ لیکن یہ محال ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعات بے شمار ہوتے ہیں اور اُن سب کو اکٹھا کرنا اور محفوظ کرنا ممکن نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک واقعہ کو بیان

میں سے دو تین تو بالکل عیاں ہیں ____ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں تاریخ کے جدید انداز نگارش کو متعارف کروایا ہے۔ ہمارے مورخین عام طور پر تاریخ کو الٰہیات، قوم پرستی اور دوسرے قومی، مذہبی اور اصلاحی جذبوں سے گڈمڈ کرتے رہے ہیں۔ ان جذبوں کے غیر ضروری بوجھ سے تاریخ کو آزاد کرنا سہل نہ تھا۔ اس کے لئے ایک موثر اور بڑے مورخ کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں نے ہمارے ہاں تاریخ کو سیکولر اور جدید طرزِ احساس کے حوالے سے مرتب کرنے کا فرض خوبی سے ادا کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں تاریخ کو ایک بامعنی انسانی عمل کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتابیں محض معلومات مہیا نہیں کرتیں بلکہ نیا شعور بھی عطا کرتی ہیں۔ وہ ماضی کے حوالے سے حال کے فہم کا راستہ بناتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موٹی موٹی کتابیں نہیں لکھتے۔ وہ مختصر کتب لکھتے ہیں اور سلیس اور قابل فہم زبان بروئے کار لاتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قارئین سے محبت کرتے ہیں اور اُن کو ساتھ لیتے ہوئے آگے کی طرف چلتے ہیں۔

یہ ہوئیں تین باتیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نصابی کتب لکھی ہیں اور نہ ہی وہ محض تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے علماء وفضلا کے لئے لکھتے ہیں۔ وہ عام تعلیم یافتہ لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ تحریری عمل کے دوران اُن کے پیش نظر جو امکانی قارئین رہتے ہیں، وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ذہین اور تعلیم یافتہ افراد ہیں جو اپنے سماج کو اور اپنی دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں اور بدلنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ ان میں مثال کے طور پر طالب علم، استاد، ادیب، صحافی اور دانش ور شامل ہیں۔ یہ سب وہ صاحبان ہیں جو سماجی تبدیلی کے عامل بن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ افتادگان خاک کے لئے لکھتے ہیں۔ سب انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جب عوام کو تاریخ میں جگہ نہ ملے تو ان کی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ اُن کی زندگیاں بے معنویت کی زد میں آ جاتی ہیں۔

یہ ایک نیا نقطہ نظر ہے۔ ہمارے ہاں، اس سے پہلے، عوام کے زاویہ نگاہ سے تاریخ نہ لکھی گئی تھی۔ خیر، مجھے احساس ہے کہ بعض لوگ مجھ کو ٹوکتے ہوئے مارکسی مورخین کا حوالہ دینا چاہیں گے۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ بے شک ہمارے مارکسی دانش ور عوام کے حوالے سے تاریخ کو سمجھنے کے مدعی ہیں۔ مگر انہوں نے تاریخ نگاری پر زیادہ توجہ دی نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی اور مارکسی دانش وروں میں مطابقتیں تلاش کر لی جائیں تو بھی دونوں کے نکتہ ہائے نگاہ میں ایک نازک سا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخی مادیت کے اثرات قبول تو کئے ہیں، لیکن وہ مارکسی نہیں ہیں۔ وہ کچھ کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔



ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ فلسفہء تاریخ کی تشکیل کے دوران کارل مارکس کا رویہ ضرورت سے زیادہ یورپ پرست رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مارکس نے تاریخ کا جو تصور دیا ہے، اُس میں بنیادی طور پر یورپی ماڈل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ وہ یورپی تاریخ کی اساس پر نظریہ سازی کرتا ہے اور اُس سے اخذ ہونے والے نتائج کا اطلاق غیر یورپی دنیا پر کرتا ہے۔ اصل میں ہیگل بھی اِسی انداز نظر کا شکار تھا اور اُس نے یورپ کو توجہ کا مرکز بناتے ہوئے مشرقی دنیا اور خصوصاً ہندوستان کو تاریخ سے خارج کر دیا تھا۔ مارکس بھی کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ، یہ کہنے پر آمادہ ہو جاتا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس خطے کی کوئی تاریخ نہیں ہے یا یہ کہ اس خطے کی تاریخ لکھی نہیں گئی۔ ہاں، اس کا مطلب یہ ضرور ہے کہ تاریخ کے انیسویں صدی کے جرمن کلاسیکی فلسفہ کے زاویے سے تاریخ سازی اور تاریخی عمل کو رواں دواں رکھنے والے جو عوامل ہوتے ہیں، وہ ہندوستان میں عنقا تھے۔

کئی تحریروں میں ڈاکٹر مبارک علی نے اس موقف پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اُس کو مغالطہ آمیز ٹھہرایا ہے۔ تاہم وہ مانتے ہیں کہ تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے مارکس کے کئی نظریات بہت اہم ہیں۔ اُن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہندوستان یا مشرق کی دوسری تہذیبوں کا مطالعہ یورپی ماڈل کی بنیاد پر یا یورپی فریم آف ریفرنس میں نہیں کیا جانا چاہئے۔ ان تہذیبوں کا تاریخی عمل اور اُس کے مقولات یورپی تاریخ سے بہت مختلف ہیں۔ لہٰذا اُن کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا جانا چاہئے۔ مارکس اور مارکسی تاریخ نگاروں سے یہ اختلاف جہاں ڈاکٹر صاحب کے مخصوص انفرادی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتا ہے، وہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نظریئے کے حوالے سے تاریخی حقائق کو دیکھنے کے بجائے حقائق کو اولیت دیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ میری اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ڈاکٹر مبارک علی مغربی دنیا کی نئی اور مقبول تجربی رسائی (Empirical approach) کی جانب مائل ہیں۔ تاریخ کو لکھنے کا یہ رویہ دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں اور علمی حلقوں میں معتبر مانا جانے لگا ہے اور ہمارے تاریخ دان اور دانش ور حلقوں میں اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ عقل عامہ بھی اس کی تائید کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ بظاہر اس تصور کی نفی کرنے والے دلائل کو تلاش کرنا محال ہوتا ہے کہ مورخ کا کام بس یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ پیش آیا ہے، وہ اُس کو جوں کا توں ریکارڈ میں لے آئے۔

کاش یہ ممکن ہوتا۔ لیکن یہ محال ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعات بے شمار ہوتے ہیں اور اُن سب کو اکٹھا کرنا اور محفوظ کرنا ممکن نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک واقعہ کو بیان

کرتے ہیں تو اُن کے بیان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات اس قسم کے بیانات ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ اس لئے اُن سب کو جانچنا اور کسی ایک حقیقت تک پہنچنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ تاریخ کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ دو یا دو سے زیادہ مورخین جب کسی ایک واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اُن کے بیان عموماً ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے دانش ور اور مورخ اس تصور کے دام فریب میں آ جاتے ہیں کہ اگر تاریخ نگار اپنے آپ صرف واقعات بیان کرنے تک محدود رکھیں تو ماضی کی ''صحیح تاریخ'' مرتب کی جا سکتی ہے۔ خیر، ڈاکٹر مبارک علی کو ہم اس قسم کے تاریخ نگاروں میں شمار نہیں کر سکتے۔ اپنی تاریخی بصیرت کے باعث وہ جان جاتے ہیں کہ فہم عامہ کو متاثر کرنے والا یہ نقطہ نظر مغالطہ آمیز ہے۔ تاریخ نگاری کے تجربی منہاج کو مسترد کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ ماضی واقعات کا اس قدر بڑا اور بے ہنگم مجموعہ ہے کہ مورخ کو لامحالہ انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے۔ جب وہ انتخاب کرتا ہے تو داخلی یعنی subjective عامل متحرک ہوتا ہے اور وہ معروضیت یا غیر جانب داری کو ضعف پہنچاتا ہے جو کہ تجربی منہاج کا آدرش ہے۔ ژاں پال سارتر نے اس حوالے سے یہ کہا تھا کہ تاریخ نگار تاریخ لکھتا نہیں بلکہ اُس کو بناتا ہے۔ وہ جن حقائق و واقعات کو چُن لیتا ہے وہ محفوظ رہ جاتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ چھوڑ دیئے جانے والے یا نظر انداز کر دیئے جانے والے حقائق و واقعات ماضی کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے کم از کم ایک جگہ جرمن مورخ رانکے سے بھی اتفاق کا اظہار کیا ہے جس کا کہنا یہ تھا کہ معروضی (objective) مانگ کرتی ہے کہ معرض وجود میں آنے والے تمام واقعات کو بیان کیا جائے۔ لیکن درحقیقت اس انداز میں لکھی ہوئی تاریخ ایسی شئے ہوگی جس کا کوئی مطالعہ نہ کرنا چاہے گا۔

یہاں ایک اور بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے مطالعہ سے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ سارتر کی حد تک نہ جائیں تو بھی وہ تاریخ سے مورخ کو خارج کرنے کی اجازت دینے پر مائل نہیں ہیں۔ جائز طور پر وہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ لکھنے والا تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اُس کا اپنا ایک رول ہے اور اُس کو ختم نہ کرنا چاہئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ رول جائز حدود سے نہیں نکلنا چاہئے۔ یہاں پیش نظر رکھنے والی بات یہ ہے کہ ان جائز حدود کی خلاف ورزی اُس وقت ہوتی ہے جب مورخ اپنے کسی مقصد یا مفاد کی خاطر حقائق و واقعات کو جان بوجھ کر توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ خلاف ورزی اُس وقت بھی ہوتی ہے جب مورخ کسی مذہب، نظریئے یا آئیڈیالوجی کی گرفت میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ معروضی ادراک اور متوازن فیصلوں کی اہلیت کھو دیتا ہے۔ اُس کو وہ کچھ دکھائی



نہیں دیتا جو کہ موجود ہے بلکہ اُس کو وہ کچھ دکھائی دیتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تب وہ تاریخ لکھ نہیں رہا ہوتا بلکہ اپنی ذہنی تسکین کا سامان اکٹھا کر رہا ہوتا ہے۔ اُس کی نگاہیں اپنے مذہب، نظریہ یا آئیڈیالوجی کی تائید کرنے والے حقائق و واقعات سے آگے نہیں جاتیں۔ تسکین کی خواہش اُس کی ذہنی دیانت کو معطل کر دیتی ہے اور یہاں تک کہ وہ حقیقتوں کو چھپانے یا اُن کو مسخ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اپنے بہت سے مضامین میں، انٹرویوز اور کتابوں میں ڈاکٹر مبارک علی نے اس قسم کی نظریاتی تاریخ نگاری کو ہدف تنقید بنایا ہے اور اُن کے کام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کی تاریخ نگاری سے پیدا ہونے والے مغالطوں اور گمراہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ہمارا حاکم طبقہ اور سرکاری مراعات سے مستفید ہونے کے آرزومند دانش ور اس ملک کو نظریاتی ریاست قرار دیتے ہیں، لہٰذا وہ نظریاتی تاریخ کے دلدادہ ہیں۔ ان کو معروضی تاریخ سے یا غیر جانبداری سے لکھی جانے والی تاریخ سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اس کو ملک کو نقصان پہنچانے کی سازش سے تعبیر کرتے ہیں، اور نظریاتی تاریخ نگاری کی سرپرستی کرنے پر آمادہ رہتے ہیں، ڈاکٹر مبارک علی نے اس روش پر خاص طور پر نکتہ چینی کی ہے۔ اس موضوع پر اُن کے خیالات بہت سے مضامین میں ملتے ہیں۔ جن میں سے ایک ''پاکستان میں تاریخ نگاری کا مضمون'' ہے۔ یہ مضمون مجلّہ تاریخ کے اٹھارہویں شمارے میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب ''تاریخ اور نصابی کتب'' خصوصاً اس موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ پاکستانی ریاست تاریخ کے مضمون کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ اُس کا مطمع نظر یہ ہے کہ تاریخ سے اُس نظریہ کی توثیق کا کام لیا جائے جس کو وہ نظریہ پاکستان کا عنوان دینے لگی ہے۔ لہٰذا حکمرانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ تاریخ کے نصاب و تحقیق میں اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس نظریہ اور اُس کے تقاضوں کی بہر طور بالادستی ثابت ہو۔ ہماری نصابی کتب اس خواہش کی عکاس ہیں جن میں صرف اُن موضوعات اور خیالات کو شامل کیا جاتا ہے جو حکمران طبقوں کے مفادات کو آگے بڑھاتے ہوں۔ یوں جو تاریخ لکھی جا رہی ہے وہ مسخ شدہ تاریخ ہے۔ وہ نوجوانوں میں مثبت تاریخ کا شعور پیدا کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔ یہ بھی ہے کہ بالائی طبقوں کو معروضی تاریخ میں کوئی دلچسپی اس لئے بھی نہیں کیونکہ وہ اُن کی سیاہ کاریوں، سازشوں اور خامیوں کو ریکارڈ میں لے آتی ہے۔ عام لوگ روایتی انداز کی تاریخ کے مطالعہ سے بیزار ہو گئے ہیں۔ وہ ایسی تاریخ چاہتے ہیں جس میں حقیقی اہمیت کے حامل موضوعات ہوں۔ وہ اپنے موجودہ حالات کو تاریخ

کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ آزادی کی دو تہائی صدی کے بعد بھی وہ کیوں سیاسی استحکام اور معاشی خوش حالی سے محروم چلے آ رہے ہیں۔ وہ واقعات کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں۔ تاریخ اُن کے تقاضوں کا جواب دے سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے لازم ہے کہ اُس کو نظریاتی پابندیوں سے آزاد کیا جائے۔

خیر، آیئے اب تاریخ کے بارے میں ایک اور نکتہ سے بھی بات ہو جائے۔ اپنی حالیہ تحریروں میں، اور ان سے میری مراد اکیسویں صدی میں لکھی جانے والی تحریریں ہیں، ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ میں قوت کے رول کو پہلے سے زیادہ اہمیت دینا شروع کی ہے۔ اس موضوع پر اُن کے تازہ ترین خیالات اُن کی خودنوشت ''میری دنیا'' کے ایک باب میں ملتے ہیں جس کا عنوان ''تاریخ کے تاثرات'' ہے۔ یہ کتاب 2012ء کے آخری ہفتوں میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں وہ جتلاتے ہیں کہ تاریخ میں قوت کا کردار اُس سے کہیں زیادہ اہم ہے جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ جب کوئی قوم سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے طاقت ور ہو جاتی ہے تو اُس میں احساس برتری نشو ونما پانے لگتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اُس میں چند ایسی خصوصیات ہیں جن سے دیگر اقوام محروم ہیں۔ اس لئے وہ دوسرے سے ممتاز ہوگئی ہے اور زندگی کے اہم شعبوں میں اُن سے آگے نکل گئی ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے عقیدوں، تہذیب وتمدن، رنگ ونسل کو دوسروں سے بہتر ماننے لگتی ہے۔ دوسری قومیں اُس کی نظر میں وقعت کھو دیتی ہیں اور پسماندہ، جاہل اور وحشی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اس لئے وہ قوم دوسروں کی قیادت کرنے کو اپنا فرض ماننے لگتی ہے۔ یہیں سے سامراجی عزائم کی شروعات ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو غلام بنانے اور اُن کے وسائل پر قبضہ کرنے پر مائل ہو جاتی ہے۔ جب کوئی قوم اس کیفیت میں مبتلا ہوتی ہے تو اُس کا عام فرد بھی قومی فخر ومباہات کی زد میں آ جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ قومی ترقی وعروج میں اُس کا بھی حصہ ہے۔ وضاحت کے لئے ڈاکٹر صاحب برطانیہ کی عظمت رفتہ کا حوالہ دیتے ہیں جب اُس کی سلطنت پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اُس وقت قومی عروج پر ایک غربت زدہ انگریز کا سر بھی فخر سے بلند ہو جاتا تھا، اور دوسری قوموں کے لوگ اُس کی نظر میں گھٹیا اور پس ماندہ ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں امریکیوں کا بھی یہی حال ہے جو اپنی قوم کی عالمی فتوحات کو عظمت خیال کرتے ہوئے اُن پر ناز کرتا ہے۔

طاقتور قومیں دوسروں سے اپنی بالادستی منوانا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ دوسری قومیں اُن کی اطاعت کریں اور اُن کی بالادستی کا اعتراف کریں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اس امر کی مثالیں بہت سی ہیں۔ انہوں نے ایتھنز کی فوج کا حوالہ دیا ہے جس نے ملوس نامی ایک چھوٹے جزیرے پر حملہ کیا اور



اُس کے حکمرانوں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور اُن کی اطاعت کریں۔ اس پر ملوس کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ اس لئے تمہارا ہم پر حملہ ناجائز ہے۔ اس پر ایتھنز کے جنرل نے کہا کہ فطرت کا یہ قانون ہے کہ کمزور طاقتور کی یا تو اطاعت کرتا ہے یا اُسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ہم طاقتور ہیں اور تم کمزور ہو، اس لئے ہمارا حق ہے کہ تم پر حکومت کریں۔ اگر تم مزاحمت کرو گے تو اس کی سزا موت ہے۔ ملوس کے لوگوں نے مزاحمت کی اور شکست کھائی۔ اس کے نتیجہ میں اُس کے مردوں کو قتل کر دیا گیا اور اُس کی عورتوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔''

اس طرز عمل کی ڈاکٹر مبارک علی نے اور بھی مثالیں دی ہیں اور کہا ہے کہ آج بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ تاریخ کی اس تاریکی میں روشنی کی کرن یہ ہے کہ ہر معاشرہ میں منحرف اور باغی لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو ظلم وجبر اور استحصال کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں۔ وہ عوام کی آزادی اور معاشرہ کی خوش حالی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے فکری نظام میں روشنی کی یہ کرن عموماً لمحاتی اور بے نتیجہ رہتی ہے۔ پل بھر کے لئے وہ اپنی چمک دکھاتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس نکتہ کی وضاحت ڈاکٹر صاحب کے ہی الفاظ میں پیش کروں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ منحرف اور باغی لوگ جب اپنے مقاصد کے لئے، اپنے نصب العین کے لئے اٹھتے ہیں تو عام لوگ اُن کا ساتھ نہیں دیتے۔ یوں بغاوت اور مخالفت میں یہ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ حکمرانوں کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ اُن کی آواز کو دبا دیں۔ انہیں اذیت دے کر ان کو مجبور کر دیں کہ یہ خاموش ہو جائیں۔ قید وبند کی صعوبتوں سے اُن کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور اگر بات زیادہ بڑھ جائے تو انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس سارے عمل میں معاشرہ خاموش تماشائی بنا یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اُن کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد سرکاری تاریخوں میں یہ باغی، شر پسند، غیر ملکی ایجنٹ اور فتنہ وفساد پیدا کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں اُن کا یہ عکس لوگوں کو بھی اس نقطہ نظر کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔ ایسے جیسے اُن کا وجود ہی نہیں تھا اور آنے والی نسلیں انہیں بھول جاتی ہیں۔''

بلاشبہ یہ تاریخ کا تاریک نقطہ نظر ہے۔ لیکن ہم اپنے ماضی پر تنقیدی نگاہ ڈالیں تو اس کو جھٹلانا دشوار ہو جاتا ہے۔ خیر، اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے مورخ نے اس رنجیدہ اور مایوس کن صورت حال میں تاریخ کا ایک روشن اور امید افزا پہلو بھی نمایاں کیا ہے۔ یہ پہلو انسان کی عظمت، اٹل ارادہ اور ڈٹ جانے کی خصوصیات پر مبنی ہے۔ ایک بار پھر خود انہی کے الفاظ پڑھ لیجئے۔ ''تاریخ کے تاثرات'' کے عنوان سے اپنی زندگی بھر کے تاریخ کے مطالعہ، تجزیہ اور غور وفکر کے

نتائج پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''لیکن دوسری جانب تاریخ کا روشن پہلو (یہ) ہے کہ انسان کو چاہے جس قدر دبایا جائے، اُس پر ظلم کیا جائے، پابندیاں عائد کی جائیں، ڈرایا اور خوف زدہ کیا جائے، مگر اُس میں اپنے حق کے حصول کے لئے مزاحمت اور بغاوت کا جذبہ ختم نہیں ہوتا ہے اور وہ برابر طاقت کے خلاف اٹھتا رہتا ہے۔ غلام اور کسان (تاریخ میں) برابر بغاوتیں کرتے رہے۔ اگرچہ انہیں احساس تھا کہ اُن کی بغاوتیں ناکام ہوں گی، مگر حقوق کے حصول کے لئے انہوں نے جدوجہد کی اور تاریخ میں اضافہ کر گئے۔''

''یہ سبق ہے آمروں، مطلق العنان حکمرانوں اور طاقت کے متوالوں کے نام کہ جب نہتے اور اسلحہ سے محروم لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ہر رکاوٹ کو دور کرتے ہیں اور ہر طاقت کو بکھیر دیتے ہیں۔ تاریخ کا یہ وہ پہلو ہے جو محروم طبقوں اور بے بس عوام کو حوصلہ دیتا ہے کہ تبدیلی اُن کے حق میں آئے گی۔''

میں یہ سوچنے کا میلان رکھتا ہوں کہ تبدیلی کا یہ امکان ہی ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کو برس ہا برس سے سوچنے اور لکھنے پر آمادہ کئے رکھا ہے۔ قریبی دوستوں کے حلقے میں وہ کبھی کبھی یہ اشارہ دینے والی مایوسی کی باتیں کیا کرتے ہیں کہ ہمارا سماج جس مرحلے پر آ گیا ہے، وہاں اب کسی قابل ذکر مثبت تبدیلی کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ لیکن مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ خود ڈاکٹر صاحب کی نگارشات نے مطلوبہ تبدیلی کا عمل تیز تر کر دیا ہے۔ انہوں نے صرف تاریخ لکھی نہیں بلکہ اپنے ہزاروں قارئین کو نیا شعور دے کر تاریخ کو متحرک رکھنے میں بھی حصہ لیا ہے۔

خیر، میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ خاتمے تک پہنچنے کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کو، بنیادی طور پر، دو حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہئے۔ ایک حصے میں وہ کتابیں اور دیگر تحریریں آتی ہیں جن کا موضوع تاریخ ہے اور دوسرے حصے میں وہ تحریریں شامل ہیں جو تاریخ سے متعلق ہیں۔ وضاحت کے لئے میں یہ کہوں گا کہ پہلے حصے میں آپ جدید تاریخ، مغل دربار، نجی زندگی کی تاریخ اور اکبر کا ہندوستان کو شامل کر سکتے ہیں، جب کہ تاریخ کی تلاش، المیہ تاریخ، تاریخ اور دانش ور اور تاریخ کے نئے زاویے جیسی کتابیں دوسری فہرست



میں آتی ہیں۔ آپ اُن کی تصنیفات کی مکمل فہرست، جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے، کو پیش نظر رکھیں تو دیکھیں گے کہ پہلی فہرست کے مقابلہ میں دوسری فہرست میں آنے والی کتب کی تعداد زیادہ ہے۔

میں اس تقسیم کو یہ بات کہنے کے لئے بیان کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی کو عموماً تاریخ نگار کے طور پر پہچانا جاتا ہے، لیکن وہ تاریخ کے نظریہ ساز یعنی فلسفیِ تاریخ بھی ہیں۔ ہاں یہ بھی ہے کہ میں پاکستانی فلسفیوں کے بدحال کنبہ میں شامل کرنے کا خواہش مند بھی ہوں۔

# تاریخ ساز—ڈاکٹر مبارک علی

اشفاق سلیم مرزا

ہمارے اردگرد جو قابلِ احترام شخصیات مختلف علوم سے وابستہ ہیں یا رہی ہیں اگر اُن کا کوئی خاکہ لکھنے بیٹھیے تو اُن سے متعلق کئی کرداری منظر نامے کھل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی مرحوم پر ہی بات کر لیتے ہیں اُن کی شہرت کی بڑی وجہ تو کیمیادان ہونا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ ایک مصور بھی تھے اُن کا ادبی ذوق بھی اعلیٰ پائے کا تھا اور انہیں شاعری کے ساتھ بھی خصوصی لگاؤ تھا وہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ وہ بہت سے فنون لطیفہ کی طرف راغب تھے۔ اسی طرح رضا کاظم صاحب کو دیکھیے، پیشے کے اعتبار سے تو وہ قانون دان ہیں۔ لیکن زندگی کا بیشتر حصہ بائیں بازو کی سیاست میں گزرا، پھر انہوں نے شعبہ موسیقی میں جو کام کیے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

ان دو محترم بزرگوں کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ گو اُن کی وجہ شہرت کسی ایک پیشے سے تھی لیکن دوسرے مشاغل میں بھی وہ بہ یک وقت فعال تھے۔ مثلاً میجر اسحاق محمد بعض فرصت کے لمحوں میں رضا کاظم کے ساتھ شطرنج بھی کھیلا کرتے تھے۔ اسی طرح میکسم گورکی اور لینن کی ایک مشہور تصویر ہے جس میں وہ دونوں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔

اور اب میں اپنے دوست ڈاکٹر مبارک علی کا ذکر اس بنیادی بات سے کروں گا کہ اُن کا اوڑھنا بچھونا تاریخ ہے۔ تاریخ اُن کا روزگار ہے وہ اُسی میں سانس لیتے اور اُسی میں بستے ہیں۔ شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تاریخ اُن کی ہیر ہے اور وہ اُس کے رانجھے ہیں۔ جس طرح محبوب یا محبوبہ کو کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا اُسی طرح جس طرح تاریخ کو وہ دیکھتے ہیں ویسی تاریخ کو اُن کے سامنے کوئی بُرا بھلا نہیں کہہ سکتا۔ وہ تاریخ کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے، تاریخ کے ساتھ گستاخی اُن کے اپنے ساتھ گستاخی کے مترادف ہے۔



عمومی طور پر تاریخ دان تاریخ لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نہ صرف تاریخ نویس ہیں بلکہ تاریخ سازی بھی کرتے ہیں اُس کا پودا لگاتے ہیں اُس کی آبیاری کرتے ہیں اور پھر اُس کی پنیریاں لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں اور یہی اُن کا ذریعہ معاش ہے وہ جگہ جگہ بنجاروں کی طرح صدا لگاتے ہیں تاریخ پڑھو، تاریخ سمجھو اور تاریخ لکھو۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے میں پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں متعارف ہوا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اِسی دور میں اُن کی تحریریں منظر عام پر آنی شروع ہوئی تھیں اُن کی پہلی کتاب جو قارئین تک پہنچی وہ تھی ''تاریخ کیا ہے'' اس کا سن اشاعت 1982ء تھا۔ پھر اس کے بعد ''تاریخ اور شعور'' بھی۔ ایک کتابچہ ''سندھ کی تاریخ کیسے لکھی جائے'' آگہی پبلی کیشنز نے حیدرآباد سندھ سے 1983ء میں شائع کیا جس کی قیمت 3 روپے تھی۔ پھر اس کے بعد آگہی نے ہی دو اور کتابچے ''آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان'' اور ''سرسیّد اور اقبال'' 1984ء میں شائع کیے۔ یہ کتابچے بھی کسی پیشہ ور کاتب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں تھے بلکہ ہاتھ سے لکھی ہوئی عام تحریریں تھیں جو ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ ایک اور کتاب ''تاریخ اور روایت'' بھی اسی دور میں لکھی گئی لیکن جبران بک کمپنی حیدرآباد نے شائع کی تھی۔ سن اشاعت اُس پر درج نہیں ہے لیکن مبارک صاحب نے پیش لفظ کے نیچے 10 نومبر 1983ء کی تاریخ لکھی ہے۔ میں نے یہ کتاب 27 جولائی 1986ء کو کراچی میں خریدی تھی۔ بعدازاں کتابیں باقاعدہ انداز میں چھپنی شروع ہو گئیں۔ لیکن اُن کی زیادہ تر کتابیں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوئیں۔ کچھ کتابیں دوسرے اشاعت گھروں سے بھی چھپیں۔

اس کے بعد جب ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں رہائش اختیار کر لی تو انہوں نے کتابی سلسلہ سہ ماہی ''تاریخ'' فکشن ہاؤس سے غالباً 1999ء میں شروع کیا کیونکہ دوسرے شمارے کی تاریخ اشاعت جولائی 1999ء ہے۔ اُس وقت ایک شمارے کی قیمت 100 روپے تھی، سارا کام اس دوران وہ خود ہی کرتے تھے لیکن بعدازاں ایک مجلسِ مشاورت بھی قائم کر دی گئی جس میں نامور لوگوں کے نام شامل ہیں۔ ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلی بھی آتی رہتی ہے۔

یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ پاکستان سٹڈی سینٹر کراچی کے ڈائریکٹر جعفر احمد نے سہ ماہی ''تاریخ'' کو جاری رکھنے میں بہت محنت سے کام کیا ہے۔ وہ کئی سال تک ''ارتقاء'' (Perspective) اور سہ ماہی ''تاریخ'' پر بہ یک وقت کام کرتے رہے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ بلکہ ڈاکٹر مبارک علی نے جعفر احمد کے ساتھ مل کر پاکستان میں اپنی کاوشوں

سے تاریخ کانفرنس کا بھی آغاز کیا اور پاکستان کی کئی جامعات اور تعلیمی اداروں نے اُن کے ساتھ تعاون کیا۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر کراچی یونیورسٹی کے علاوہ میں گجرات یونیورسٹی اور نیشنل کالج کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس کام میں گجرات یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر نظام الدین اور ساجدہ وندل کا بہت تعاون حاصل رہا۔ کانفرنسوں کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے لیکن فنڈز کی کمی کی وجہ سے کبھی تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب پر صاحبانِ آراء ان کے کام اور کردار کے بہت سے پہلوؤں کو اُجاگر کریں گے لیکن میں اُن کی تاریخ سازی کے ساتھ اُن کا مختصر سا کرداری خاکہ کھینچوں گا۔ کیونکہ ایک عرصہ سے نہ صرف میری اُن کی دوستی ہے بلکہ میں کسی نہ کسی طرح اپنی بساط کے مطابق اُن کے کام میں اپنا حصہ ڈالتا رہا ہوں۔

تاریخ سازی کے ضمن میں دو باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں کوئی حتمی بات کرنے سے گریزاں رہتا ہوں۔ علم کے حوالے سے حتمی بات ویسے بھی زیب نہیں دیتی۔ اس لئے میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے سب سے بڑے تاریخ نویس ہیں۔ لیکن ایک بات میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو عوام میں مقبول بنانے کا جو بیڑہ اُٹھایا اُس میں وہ کامیاب رہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ایسا کرنے میں اُن کے کچھ اہداف تھے جن کی طرف اُن کی ہر تحریر واضح اشارے کرتی ہے۔

پہلا تو یہ کہ اُنہوں نے تاریخ اور الٰہیات میں واضح تقسیم کو قائم رکھا۔ دنیا بھر میں الہامی کتابوں میں لکھی گئی تاریخ اور انسان کے ہاتھوں مرتب ہوئی تاریخ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ یہ دو واضح کیمپ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انسانی تاریخ کے داعی ہیں۔ الٰہیات کی مقصدیت اور چھاپ اُن کی تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اُن کی تحریروں نے پوری طرح تو تاریخی مادیت کا لبادہ نہیں اوڑھا لیکن یہ ضرور ہے کہ اُن کے ہاں تاریخ کے معمار عوام ہیں۔

اس حوالے سے انہوں نے تاریخ کو مزید دو طریقوں سے سنوارا انہوں نے ایک طرف تو (Subaltaren) نچلے طبقات کے تاریخ میں کردار کو اُبھارا اور سامنے لائے اور اُن کی طرف توجہ دلوائی۔ یہ کام ہندوستان میں بھی وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ ایک سیریز ''Subaltern Studies'' کے نام سے مورخ (Ranjit Goha) رنجیت گوھا نے شروع کر رکھا ہے۔ یہ نام انہوں نے انتونیو گرامچی (Antonio Gramsci) سے لیا ہے جس نے یہ اصطلاح کم تر درجہ کے لوگوں کے لئے



استعمال کی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مقامی علاقوں کی تاریخ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ بہت سے پرانے لکھنے والے بھی اس طرف راغب ہوئے۔ گو یہ ایک بہت ہی نازک کام ہے اور کٹھن بھی کیونکہ اگر آپ صرف مقامی تاریخ سیاق و سباق سے کٹ کر لکھیں گے تو اس سے انصاف نہیں کر سکیں گے مقامی واقعات اپنے اطراف کے علاقائی اور بین الاقوامی واقعات سے جُڑے ہوتے ہیں اور اُسی تناظر میں آپ اُن کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔ صرف مقامی تاریخ تک موقوف رہنا ایک میکانکی منہاج ہوگا جو یکطرفہ ہوگا اس کام سے ایک ماہر تاریخ دان ہی نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ میں جب عوام اور تاریخ کی بات کر رہا ہوں تو اُس سے مراد یہ نہیں کہ تاریخ صرف عوام بناتے ہیں بلکہ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جدید دور کی تاریخ میں اُن کا کردار بہت فعال ہے۔ وہ بھی پرولتاریہ کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد یہ کام ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے باقی ادوار پر یہ بات من و عن صادق نہ آتی ہو۔ لیکن جدید دور میں جمہوریت کے پہنچنے کے بعد مغربی دنیا میں یہ ضرور ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان میں بھی جدید تاریخ کے نہ صرف بیانیے بلکہ تعقلات کو بھی وسعت دی، اور دوستوں سے یہ کہا کہ اُردو زبان میں لکھیں کیونکہ اس زبان میں لکھی ہوئی تحریروں کو عوام کی اکثریت پڑھ سکتی ہے۔ اُن کا یہ مشاہدہ بالکل درست ہے کیونکہ اُن کی کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جنوبی پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں اُن کے قارئین کی تعداد زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک کام یہ بھی کیا کہ یورپی تاریخی نشوونما اور موضوعات کو اپنی کتابوں میں سمویا۔ سماجی علوم کے حوالے سے یہ کام سبطِ حسن اور علی عباس جلال پوری بھی بطریق احسن کر چکے ہیں۔ فلسفہء تاریخ کے تعلقات کو جس خوبی سے مبارک صاحب نے اپنی کتاب ''تاریخ اور فلسفہء تاریخ'' میں متعارف کروایا ہے اُس سے کولنگ وڈ کی یاد تازہ ہو گئی۔

سہ ماہی ''تاریخ'' پرانی تاریخی دستاویزات بھی نئے طور پر شائع کرنے سے عوام تک اُن کی رسائی ہوئی۔

عرصہ دراز سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ راست باز انسان جب اپنے اردگرد کے ماحول سے مایوس ہونا شروع ہوتا ہے تو اس کے کردار میں زود رنجی کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے اور ایسے دور میں جہاں سماجی سطح پر راست بازی کا فقدان ہو تو کسی بھی ایسے انسان کا زود رنج

ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے جو منفی اقدار سے مطابقت کرنے سے انکاری ہوتا ہے۔

مبارک صاحب کی طبیعت کی راست بازی نے زود رنجی کو جنم دیا ہے۔ جس سے کبھی کبھی دوستوں کے جلو میں بھی اکیلے ہو جاتے ہیں۔ اُن کی سوانح عمری کا عنوان ''در در ٹھوکر کھائے'' بھی اسی بات کی غمازی کرتا ہے اس سے کچھ نقصان بھی ہوتا ہے جو ڈاکٹر صاحب برداشت کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ آج کل کے دور میں اس قسم کی راست بازی مندے کا سودا سمجھی جاتی ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ راست باز ہونا کوئی منفی کرداری پہلو ہے تو میں اُس سے ہرگز اتفاق نہیں کروں گا۔ اس حوالے سے چند تحفظات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کھڑا ہوں۔



# ناتواں عہد کی توانا شخصیت ——ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر غافر شہزاد

ڈاکٹر مبارک علی سے میرا اوّلین تعارف ان کے سہ ماہی رسالہ ''تاریخ'' کے حوالے سے ہوا، یہ کوئی سال 2000-1999ء کی بات ہے۔ تاریخ کا شمارہ پڑھنے کے بعد اس میں دیئے گئے ٹیلی فون پر میں نے ان سے رابطہ کیا تو جواب میں ایک پڑھے لکھے اور مہذب شخص کا شائستہ لہجہ سننے کو ملا، تب سے آج تک میں اپنائیت کے اس لہجے سے بندھا ہوا ہوں، تاریخ کے رسالہ میں غالباً کراچی کے حوالے سے کوئی مضمون تھا، تب میں نے سوچا کہ لاہور کے حوالے سے کچھ ایسا ہی مضمون کہ جس میں شہروں کی توسیع اور پھیلاؤ کے محرکات کو قلم بند کیا گیا ہو، لکھا جا سکتا ہے۔ جب اپنے ان خیالات کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی سے کیا تو ان کی جانب سے بھرپور تائید اور حوصلہ افزائی نے مجھ میں قلم اٹھانے کا اعتماد پیدا کیا۔ اس سے قبل میری چند کتابیں شاعری اور افسانے کے حوالے سے شائع ہو چکی تھیں اور میں قومی سطح کے علمی و ادبی جرائد میں گذشتہ کئی برسوں سے چھپ رہا تھا مگر فن تعمیرات، شہری منصوبہ بندی و آبادکاری اور تاریخ و تعمیرات کے حوالے سے نہ تو کچھ شوق سے پڑھا تھا اور نہ ہی لکھنے کی جانب دھیان گیا تھا، گویا یہ میرے موضوعات ہی نہ تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے اوّلین بالمشافہ ملاقات فکشن ہاؤس میں ہوئی جہاں وہ اپنی مخصوص نشست اور شفیق مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھے ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے تھے۔ انہی دنوں تاریخ کانفرنس کے انعقاد کا سلسلہ چل رہا تھا، اور اس کے لئے لاہور کو موضوع بنایا گیا تھا، سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے تب تک اندرون لاہور کی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے کچھ نہ پڑھا تھا، اور نہ ہی کوئی زیادہ شناسائی تھی، ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کے لئے مدعو کر لیا، اس دعوت پر پہلی بار سنجیدگی سے میں نے اردو میں تعمیرات کے موضوع پر کچھ لکھنے کے بارے میں سوچا، اس سے قبل معروف نقاد

مظفر علی سیّد مجھے فنِ تعمیرات کے حوالے سے اردو میں لکھنے پر اس طرح آمادہ کر چکے تھے کہ میں اپنے ماسٹر آف آرکیٹیکچر کا تھیسس جو کہ لاہور کی مساجد کے مینار و ارتقاء سے متعلق تھا، اردو زبان میں ترجمہ کروں اور اسے شائع کرواؤں۔

میں نے تاریخ کانفرنس میں ''بدلتے معاشرتی تناظر میں گھر کی ہیئت'' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا جس میں اندرون شہر کے گھروں میں رہنے والوں کے بدلتے معاشرتی رشتوں کے گھروں کی تعمیرات اور نقشہ جات میں تبدیلیوں پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا۔ گھر کا نقشہ اندرون لاہور سے گوالمنڈی، سمن آباد اور اقبال ٹاؤن تک پہنچنے میں جن سیاسی، سماجی اور معاشرتی عوامل کے باعث تبدیل ہوا، اس کا ایک تجزیہ اس مضمون میں شامل تھا۔ اسی کانفرنس میں کئی برسوں کے بعد میری ملاقات پروفیسر ظفر علی خان اور پروفیسر پرویز وندل سے ہوئی۔ پروفیسر ظفر علی خان سے ابتدائی تعارف جہلم میں ایف ایس سی کے زمانے (81-1980) کا تھا جبکہ پروفیسر پرویز وندل نے ہمیں انجینئرنگ یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر کے پانچ سالہ تدریسی کورس میں پاکستانی فنِ تعمیر کی تاریخ پڑھائی تھی۔ میں انتہائی خوش قسمت ہوں کہ تاریخ و تحقیق اور لاہور کے حوالے سے میرا تحریری و تحقیقی کام ان تین قد آور محبت کرنے والی توانا شخصیات کے جلو میں شروع ہوا۔ تاریخ کانفرنس میں پڑھا جانے والا وہ مضمون میری کتاب ''لاہور۔۔۔۔گھر گلیاں دروازے'' کی اشاعت کی بنیاد بنا اور اگلے ایک دو سالوں میں شہر قدیم لاہور کے حوالے سے لکھے جانے والے مضامین جو تاریخ کے اگلے شماروں میں شائع بھی ہوئے، میری کتاب کی اشاعت کا سبب بنے۔ تاریخ میں میرے شائع ہونے والے دیگر مضامین کا موضوع درگاہیں، مزارات، وغیرہ تھا جو دراصل میرے ڈاکٹریٹ کرنے کے دوران کی جانے والی تحقیق کے دوران وقتاً فوقتاً لکھے جاتے رہے اور جو ''پنجاب میں خانقاہی کلچر'' نام کی کتاب میں شائع ہوئے، میں کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر مبارک علی کی مقناطیسی شخصیت کے حصار میں نہ آتا تو یہ دونوں کتابیں اور بعد ازاں دیگر کئی تصنیفات میرے نوکِ قلم سے تخلیق نہ ہوتیں، ہر بار تاریخ کے رسالہ کی اشاعت کے بعد اگلے رسالہ کے لئے مضمون لکھنے کی تحریک اور ترغیب کا سبب ڈاکٹر مبارک علی کا ٹیلی فون ہوتا اور ان کا شفیق انداز کا تحکمانہ لہجہ، جو ان کی خاص پہچان ہے، اور جو لوگ ان کی شخصیت سے واقف ہیں انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ اس تحکمانہ لہجہ سے شفقت کا عنصر جب کم ہوتا ہے تو یہ لہجہ کیا رنگ لاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کی شخصیت اور توانائی ہمیشہ سے ہی مجھے ایک نئی تخلیقی قوت عطا کرتی رہی ہے۔ وہ



مسلسل کانفرنسز میں شمولیت اختیار کرتے ہیں، مسلسل لکھتے اور چھپتے رہتے ہیں، عام گفتگو میں بھی غیر متوقع اور نہایت الجھے ہوئے دقیق مسائل سے متعلق سوالات کے جوابات نہایت مدلل اور تاریخی حوالہ جات کے ساتھ پوچھنے والوں کو دیتے ہیں، معلوم ہی نہیں ہوتا کب ان کی نئی کتاب شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آ جاتی ہے، اس بات سے میں اکثر تحیّر زدہ ہو جاتا ہوں، اپنی توانائیاں مجتمع کر کے میں ان کے پیروں کے نشانات کی رہنمائی میں سفر جاری رکھتا ہوں، مگر میری رفتار کے کم ہونے کے سبب ہمارے درمیان یہ فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی کا نقطہ نظر بالکل الگ اور مختلف ہے، وہ سیاسی، سماجی، مذہبی اور جغرافیائی حالات کو منظر، پس منظر اور پیش منظر میں بہ یک وقت دیکھتے ہیں، ان کی تحریریں پڑھ کے ہمیں آج کل کے حالات و واقعات، عمل ردِ عمل، معاشرہ، حکومتوں کے انداز، سیاسی چال بازیاں، اور لوگوں کی زیادہ بہتر سمجھ آنے لگتی ہے، وہ اتنی آسان زبان اور بیان کے ایسے واضح سلیقے اور زاویے سے نہایت ادق اور الجھے ہوئے مسائل پر اتنی آسانی اور سہولت سے لکھتے ہیں کہ ہمیں رشک آتا ہے، دو چار مہینوں میں نہایت اہم موضوع پر ان کی کتاب کی اشاعت ہمارے لئے ایک سنگِ میل سے کم نہیں ہوتی، خاص طور پر جب وہ انسانی تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو ہمیں اپنا آج اس میں سانس لیتا ہوا، ننگ دھڑنگ اور بہت واضح دکھائی دیتا ہے، ہم ابھی اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں میں الجھے ہوتے ہیں اور ڈاکٹر مبارک علی اپنی تجزیاتی انداز کی تحریروں کے ذریعے کئی ناگفتہ سوالوں کے جواب بھی ہمیں دے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے جس طرح تاریخی موضوعات اور تناظر کو بادشاہوں کے فریم سے نکال کر عام آدمی کے چوکھٹے تک لے آئے ہیں، یہ اسی تربیت کا حصہ ہے کہ میرے جیسے لکھنے والوں نے عمارات کا انسانی زندگی سے ایک نئے انداز سے رشتہ جوڑا ہے، عمارتوں کے ڈیزائن اور جگہاتی تنوع نے انسانی ضرورتوں، موسمی اثرات، معیشت، سیاست اور معاشرت کے سبب جو ارتقاء کی منزلیں طے کی ہیں، ہمیں ڈاکٹر مبارک علی کے اندازِ نظر سے ان کی بہتر اور بامعنی سمجھ آنے لگی ہے۔ میرے جیسے بہت سے لوگ اس بات پر متفق ہیں اور اپنے لئے اس کو باعثِ اعزاز سمجھتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر مبارک علی کے عہد میں سانس لے رہے ہیں اور جن کی عمر بھر کی کوشش اور سعی مسلسل نے تاریخ اور معاشرے کو بالکل الگ زاویے سے دیکھنے کا شعور دیا ہے ورنہ تو ہم جہالت کے اندھیروں اور فرسودہ تاریخ نگاری کی روایات میں ہی زندگیاں بسر کر کے چلے جاتے۔

ڈاکٹر مبارک علی تخلیقی وفور سے مزین ایک ایسے مردِ آہن ہیں جنہوں نے ذہنی وعلمی جنگیں ہی نہیں لڑیں بلکہ ہمارے معاشرے کے کئی ناسوراُن کی اصول پرستی سے ٹکرائے اور پاش پاش ہوئے ہیں مگر زندگی اور تاریخ نگاری کے حوالے سے وہ اپنے نقطہ نظراور زاویئے سے ایک ڈگری بھی نہیں ہٹے، ان کو عدالتوں میں لے جایا گیا، ان پر معاشی تنگ دستی کے گھیرے تنگ کیئے گئے، ان کی تخلیقی اور تجزیاتی صلاحیتوں پر رکیک حملے کیئے گئے، مگر وہ نہایت مضبوطی، استقامت اور یقین کے ساتھ اپنے طے کردہ راستوں اور منزلوں کی جانب رواں رہے، زر پرستی اور مادی خواہشات کے حصول کے لئے دن میں ہزار بار بکنے والے افراد سے بھرے ہوئے اس معاشرے میں ڈاکٹر مبارک علی جیسی صالح اور ثابت قدم شخصیت ہمارے جیسے محدود دامن اور نحیف نوجوانوں کے لئے ایک مینارۂ نور اور مشعلِ راہ ہے۔

میں جب بھی دنیا کی بھاگ دوڑ سے تھک جاتا ہوں، کندھے سے کندھا مار کر آگے نکل جانے والوں کی قاری ضرب سے اپنا توازن کھونے لگتا ہوں، عزم، استقامت، زندگی کی امید اور یقین کے لئے ڈاکٹر مبارک علی کی توانا، متوازن اور مضبوط شخصیت کے حصار میں پناہ لیتا ہوں۔ جب بھی ٹیلیفون کر کے میں نے ان سے پوچھا ہے کہ آپ مصروف تو نہیں، کیا میں آسکتا ہوں۔ نہایت خندہ پیشانی سے مثبت جواب دیتے ہیں اور میں ان کے گھر کی جانب چل پڑتا ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے یہ کہا ہو کہ میں کام کر رہا ہوں، اتنی دیر میں فارغ ہوں گا، آج نہیں، کل کسی وقت آنا۔ ان کی طرف سے ملنے والی اس سہولت نے مجھے اپنی نظروں میں ہمیشہ باوقار اور معزز کیا ہے، وگرنہ معاشرے کے لئے میرے جیسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے ہرگز زیادہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کی شخصیت سے علمی، فکری اور ذہنی بالیدگی کے علاوہ میں جس جمالیاتی مسرت سے ہم کنار ہوتا ہوں وہ ان کی خوش لباسی ہے، جس قدر ان کی شخصیت نفیس، صاف ستھری اور تازہ دم ہے، ویسے ہی لباس کے معاملے میں وہ منفرد نظر آتے ہیں، اس بات کا کریڈٹ مجھے بھابھی جان کو دینا چاہئے یا نہیں، معلوم نہیں، میں نے کبھی پوچھا نہیں، مگر گھر میں جس سادگی اور سلیقے کی جھلک مجھے نظر آتی ہے، اس کے لئے یقیناً بھابھی تحسین کی مستحق ہیں، مگر انہوں نے بھی صلہ وستائش سے بالاتر ہو کر جس طرح ان کو سہارا دے رکھا ہے ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے آشیانے سے دو بیٹیاں علم کی تلاش اور زندگی کی دوڑ میں شمولیت کے لیے اڑ کر دیارِ غیر میں مقیم ہو چکی ہیں مگر ان کی تیسری بیٹی نین تارا جو آرٹسٹ بھی ہے اور ڈاکٹر صاحب کی پرائیویٹ سیکرٹری بھی، ان کے ساتھ ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ وہ بیٹوں کی طرح ڈاکٹر صاحب کی ہمت بندھاتی ہے۔ ان کی



لائبریری سے کوئی کتاب تلاش کرنی ہو یا ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کی تواضع، ہمہ وقت تیار رہتی ہے، بہت چھوٹی سی عمر میں وہ بااعتماد اور سمجھدار ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب تحقیقی وتخلیقی سفر کا آغاز کیا وہ ٹائپ مشین اور کتابت کا زمانہ تھا اور آج اکیسویں صدی کے اولین نصف میں وہ کمپیوٹر کے عہد میں سانس لے رہے ہیں، انہوں نے بدلتی ہوئی دنیا میں سائنسی ترقی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر خود کو چلایا ہے جو صرف تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال مورخ ہی کر سکتا ہے وگرنہ دو دہائیاں گزرنے کے بعد مورخ خود عہدِ پارینہ کا قصہ بن کے رہ جاتا ہے مگر ڈاکٹر مبارک علی کی علمی وفکری صلاحیت نے ان کے وجود کو کل، آج اور کل کے درمیان ایک طویل مضبوط پل کی حیثیت سے زندہ رکھا ہوا ہے۔ وہ زمان ومکان کے تناظر میں تاریخ کو محدود کر کے نہیں پرکھتے بلکہ اس کا ربط عصر حاضر سے اس طرح بناتے ہیں کہ ماضی عہد حاضر بن کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود طاقت، حکومت، معاشرت، معیشت، مذہب اور ثقافت کسی سطح پر بھی بنیادی انسانی فطرت تبدیل نہیں ہوئی۔ وہ ویسی ہی چلی آرہی ہے۔ صرف تاج اور تخت سنبھالنے والے چہرے بدلتے رہتے ہیں۔ سماج میں جو تبدیلی ہونا چاہئے، انسان کی سوچ اور شعور ابھی اس سے بہت دور ہے مگر ڈاکٹر مبارک علی نے جس تاریخ کی آگہی کا بیڑا اٹھایا ہے، اس نے انسانی سوچ اور شعور کی بالیدگی کی کئی منازل، جو صدیوں پر محیط تھیں، سالوں میں طے کروادی ہیں اب یہ تو اپنی اپنی توفیق ہے، کس کے کشکول میں کتنا آتا ہے۔

# ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

ڈاکٹر مبارک علی سے بالمشافہ ملاقات تو کافی بعد میں ہوئی لیکن ان کے نام اور کام سے شناسائی ۱۹۸۷ء کے اواخر میں اس وقت ہوئی جب جیکب آباد میں بڑے بھائی کے دوست جو کہ لیاقت میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کی تعلیم میں مصروف تھے اور تعطیلات میں جب بھی جیکب آباد آتے تو بڑے بھائی سے ملنے آجاتے اور کئی گھنٹے گفتگو جاری رہتی۔ انھیں پڑھنے لکھنے کا کافی شوق تھا اس لیے اکثر اوقات نئی کتابیں لاتے رہتے تھے۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔ ایم آر ڈی کی جمہوری تحریک کے دباؤ میں آنے کے بعد ملک میں لولی لنگڑی جمہوریت تو بحال کر دی گئی تھی۔ لیکن ایک شریف لیکن کمزور سندھی سیاستدان محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم بنا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ملک میں سیاسی جبر اور تنگ نظری میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی تھی۔ جنرل ضیاء اور اس کے فوجی حکمران اسی طرح برقرار تھے۔ سندھ کے تعلیمی ادارے اور سندھ یونیورسٹی اور لیاقت میڈیکل کالج قوم پرستی اور مارشل لاء مخالف تحریکوں کا گڑھ بنے ہوئے تھے۔ جنرل ضیاء نے اپنے دورِ حکومت میں جہاں دیگر نہام نہاد معاشی اور معاشرتی اصلاحات کو متعارف کرایا وہیں اس نے اس ملک کے ساتھ سب سے بڑا خطرناک کھیل کھیلا اور وہ تھا اصلاح کے نام پر اس ملک میں مذہبی انتہا پسندی کو متعارف کروانا۔ افغان جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں مدرسوں کا ایک وسیع جال بچھایا گیا۔ اور بعد ازاں یہی مدرسے ملک میں انتہا پسندی کی آماجگاہ بن کر ابھرے۔

صوبہ سندھ تاریخی طور پر مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کی مثالی تصویر رہا ہے۔ چند واقعات کو چھوڑ کر عموماً سندھ میں سیکولر، قوم پرست اور رواداری کو قبولیت حاصل رہی ہے۔ ہمیں اپنے بچپنے کے دنوں میں بھی یہی ماحول دیکھنے کو ملا۔ ۱۹۸۸ء کے اوائل میں کیڈٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا اختتام ہوا اور



یونیورسٹی میں داخلہ ملنے تک کے عرصے میں جب جیکب آباد میں طویل عرصے تک قیام کرنے کا موقع ملا تو اسی دوران ڈاکٹر منور سے، بھائی کے توسط سے باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت جام ساقی سندھی نوجوان کے لیے ایک ہیرو کی مثال رکھتا تھا جو کہ اپنے بائیں بازو کے خیالات کے باعث طویل عرصے سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا تھا۔ ڈاکٹر ظاہر ہے بائیں بازو کے زیرِ اثر طبقاتی جدوجہد کی باتیں کرتے تھے اسی دوران انہوں نے ڈاکٹر مبارک علی کا ذکر کیا جو کہ ان سے مل چکا تھا اور ان کی کتابیں ساتھ رکھتا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کو ۱۹۸۷ء کے اواخر میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اب ہماری ملاقاتوں کا موضوع ڈاکٹر مبارک علی کی تحریریں ہوتیں۔ ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء الحق کی فضائی حادثے میں ہلاکت کے بعد ملک میں جمہوری حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی گھٹن کے ماحول میں کچھ کمی آئی، تو ہم لوگوں نے سوچا کہ ملک میں ملنے والی اس آزادی کا فائدہ اٹھایا جائے اور روشن خیالی کے عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ اس لیے ہم لوگوں کے لیے سب سے اولین ترجیح ڈاکٹر مبارک علی تھے۔ ہم لوگ اس وقت ہفت روز میگزین نکال رہے تھے جو کہ سندھی زبان میں تھا۔ ہم لوگوں نے اس کو ترقی پسند تحریریں شائع کرنے کا مقصد بنایا۔ کیونکہ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریریں نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہوتی تھیں جو کہ لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی تھیں لیکن کیونکہ یہ اردو میں تھیں اس لیے سندھی زبان کا قاری ان سے اس طرح مستفید نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے فیصلہ لیا گیا کہ ان کی تحریروں کو سندھی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اس طرح مبارک علی کو سندھی میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر مبارک علی سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

ہم لوگوں نے جہاں ایک طرف ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں سے تراجم شروع کیے تو دوسری طرف میں نے ڈاکٹر صاحب سے تازہ تحریروں کی بھی درخواست جاری رکھی اور ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ ہماری درخواست پر فوراً تحریریں فراہم کیں۔ اسی دوران وہ ہیرالڈ فرنٹیئر پوسٹ اور دیگر انگریزی کے اخبارات اور رسائل میں ڈاکٹر صاحب کے شائع ہونے والے انٹرویو اور مضامین کو بھی سندھی میں منتقل کرنے کا عمل ہوا اور ان مضامین کے سندھی میں شائع ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو سندھی زبان کے قارئین تک پہنچانے کی اولین کاوش ہوئی۔

یونانی تاریخ ہیروڈوٹس سے لے کر آج تک تاریخ نویسی کے مختلف نقطۂ نظر (school of thoughts) سامنے آتے رہے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ روایت کیا جانے والا نقطہ نظر سیاسی تاریخ کا نظریہ ہے۔ جہاں تاریخ نویسی کا بیشتر کام حکمرانوں کے مفادات کو سامنے

رکھ کر کیا گیا ہے۔ بادشاہوں نے اپنے درباروں میں سرکاری تاریخ نویس مقرر کیے جنہوں نے صرف امراء اور بادشاہوں کے نقطۂ نظر سے تاریخ لکھی۔ مذہب کے انسانی معاشرے میں داخل ہونے کے بعد تاریخ کو مذہبی اثر کے تحت لکھا جانے لگا اور جدید تاریخ میں قوم پرست ریاستوں کے ابھرنے کے بعد تاریخ کو بھی محدود پیمانے پر لکھا جانے لگا۔ لیکن تاریخ نویسی کے عمل میں بڑی اہم تبدیلی اس وقت دیکھنے کو ملی جب ۱۹۴۶ء میں برطانیہ کی کیمونسٹ پارٹی کے ساتھ منسلک تاریخ دانوں کے ایک گروہ نے ہم خیال تاریخ نویسوں کا گروہ بنانے کا اعلان کیا۔ اس گروہ نے تاریخ کے روایتی طریقوں سے ہٹ کر لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ تاریخ نویسی اب تک زیادہ تر امراء اور مراعات یافتہ کرداروں کا ذکر کرنے تک محدود ہے۔ اس میں عام آدمی بالکل غائب ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کو نئے انداز اور اسلوب سے لکھا جائے اور تاریخ کا محور عام آدمی ہو۔ عام آدمی کا طریقہ رہن سہن ہو، اس کی ثقافت اور اس کا دکھ درد ہو، معاشرے میں اس کی خدمات اور اس کے کردار کا ذکر ہو۔ ان کے استحصال اور ان کی اس استحصالی نظام کے خلاف بغاوتوں کا ذکر ہو۔ معاشرے کے طبقاتی کردار اور طبقاتی بنیادوں پر ابھر کر سامنے آنے والے سماجی نظام اور سماجی ڈھانچے کا ذکر ہو۔

اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس برطانیہ کیمونسٹ تاریخ دانوں نے تاریخ لکھنے کا ایک نیا اور منفرد نقطۂ نظر پیش کیا، اور اس کو نام دیا گیا ''History from below'' یعنی تاریخ زیریں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ کو عام آدمی کے نظر سے لکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے آنے کے بعد اس میں آنے والی تبدیلی کے نتیجے میں جو نیا سماجی ڈھانچہ ابھر کر سامنے آیا ہے اس کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا جائے کیونکہ سرمایہ دارانہ نے پہلے سے موجود جاگیردارانہ طرز کے استحصال کو مزید زیادہ استحصالی بنا دیا ہے۔ اس گروہ میں نمایاں کرسٹوفر ہل اور ای پی تھامسن شامل تھے۔ تھامسن نے اپنی معرکۂ آراء کتاب ''The making of working class'' لکھی۔ اس گروہ کے ایک اور رکن سی۔ ایل۔ آر جیمز جو کہ اپنی سوچ میں مارکسٹ تو تھے لیکن وہ اسٹالن کی پالیسیوں کے مخالف تھے انہوں نے اپنی کتاب ''The black jacobins'' لکھی جو کہ ۱۹۳۸ء میں سامنے آئی۔ ناول کی طرز پر تحریر کی جانے والی کتاب بڑی مقبول عام ہوئی۔

ڈاکٹر مبارک علی نے ایک مارکسٹ تاریخ داں اور دانشور ہونے کے باعث اسی گروہ سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خواص پر تنقید کی اور عام آدمی کو تاریخ سے غائب رکھے جانے کے باعث اپنی تحریروں کا محور عام شخص کو بنایا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ عام آدمی ہی ہے جو تاریخ کو بناتا ہے۔



معاشرے میں نظر آنے والی تمام ترقی عام آدمی کی مرہونِ منت ہی ہے۔ تمام کامیابیاں تو عام آدمی کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں اور کامیابیوں کے اختتام پر اسی عام آدمی کو ہی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کے بیشتر کتابوں کے موضوعات وہ کردار ہیں جو کہ ہمارے معاشروں میں اکثر دھتکارے جانے والے کردار سمجھے جاتے ہیں۔ جو بے وقعت تھا اور ان کی حیثیت جانور سے بھی بدتر ہیں۔ لیکن ڈاکٹر مبارک علی سمجھتے ہیں کہ وہی تو اصل معاشرہ ہے۔ مزدور، کسان، محنت کش، خواتین، غلام ان کے ہیرو ہیں۔ بادشاہ، مذہبی علماء، سپاہ سالار، جاگیردار اور سرمایہ داران کے نزدیک وہ کردار ہیں جو کہ ان کے استحصال اور معاشرے کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا باعث ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مارکسٹ تاریخ داں ایرک ہابس بام کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکوؤں اور ٹھگوں کی تاریخ بھی لکھی۔ یہ بتایا کہ یقیناً معاشرے میں ایسے کرداروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں ظالم تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ بہت سطحی طریقہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان حقیقی وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو کسی بھی انسان کو معاشرہ سے ہٹ کر ڈاکو اور چور بننے پر مجبور کرتا ہے۔ معاشرے کے مفاد پرست اور امراء کس طرح بعض اوقات اپنے مخالفین کو مختلف القاب لے کر ان کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں اور بالآخر ان کے یہی خیالات معاشرے میں قابل قبول بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی چھ سات درجن سے زائد کتابیں اتنے زیادہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں کہ لگتا ہے تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ رہ گیا ہے جس پر انہوں نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔ انہوں نے بچوں کے لیے، خواتین کے لیے، مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے لیے غرض ہر ایک کے لیے لکھا ہے۔ انہوں نے مذہبی پیشواؤں اور نام نہاد عالموں کے طریقۂ واردات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اپنی کتابیں تحریر کی ہیں۔ بلکہ انہوں نے کئی کتابیں اور مضامین تراجم بھی کیے ہیں جن میں بریخت کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے پہلے سے شائع شدہ مواد کی تاریخی اہمیت کو سمجھتے ہوئے انہیں اکٹھا کر کے شائع کروایا جن میں لطف اللہ کی آپ بیتی جیسی کتابیں بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے جہاں مختلف موضوعات پر کتب تحریر کی ہیں وہیں انہوں نے کتابوں کے ساتھ ساتھ اخبار اور جرائد میں بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ لکھا اور اب تک لکھتے آ رہے ہیں۔ روزنامہ ڈان، پاکستان ٹوڈے، بدلتی دنیا جیسے اخبارات اور جرائد میں ان کے مضامین عام و خاص سب کے لیے یکساں دلچسپی کا ساماں رکھتے ہیں۔ انہوں نے ڈان میں خصوصی طور پر بچوں کے لیے تاریخ کو بڑے سہل انداز میں لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کو بڑی خوبی سے منزل تک پہنچایا ایک طرف جہاں ہمارے درسی

نظام کو نام نہاد و تنگ نظر مذہبی اور قومی سوچ (idelogy) میں مقید کر کے اس کا دائرہ بڑا محدود کر دیا گیا ہے جس کے باعث معروضیت (objectivity) اس سے بالکل ہی غائب ہوگئی تو دوسری طرف اپنے مخالفین کے لیے تعصب اور نفرت پر مبنی خیالات کو اس قدر بھر دیا گیا ہے کہ ہماری نئی نسل کے ذہنوں میں سوائے نفرت اور تعصب کے اور کوئی بات سامنے نہیں آ رہی۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں عدم برداشت اور انتہا پسندی کے رجحانات کو بڑھاوا ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان رجحانات کو ختم کر کے ان کی جگہ روشن خیالی اور حقیقت پسندی کو آگے لانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتابوں اور تحریروں سے وہم و توہمات (myths) کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ صدیوں سے جن کو لوگوں نے اپنا ہیرو اور مسیحا بنا کر پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں میں انہیں عوام دشمن ثابت کیا۔ فاتحین ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اکثر غاصبین ہیں اور وہ بھی ایسے غاصب کہ جنہوں نے نہ صرف قبضے کیے بلکہ قتل و غارت گری بھی کی اور لوٹ مار بھی۔ عصمت دری بھی کی اور مقبوضہ علاقوں کی تہذیب وثقافت کو بھی تباہ و برباد کرنے کے ذمہ دار بھی ٹھہرے۔ وہ بغیر کسی تفریق کیے اپنی تحریروں میں سچ لکھنے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب، نسل، زبان کی تفریق کیے بنا مظلوم مظلوم ہے اور ظالم ظالم ہے ان کی تحریروں میں ان کی ذات وشخصیت کی طرح کسی قسم کی سودے بازی اور Compromise نہیں ہے۔ جس بات کو تاریخی حقیقت (Historical fact) کی بنیاد پر درست پاتے ہیں۔ اسے اسی طرح بیان کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے صرف اپنی بات کو قاری تک پہنچانے کی ذمہ داری نہیں نبھائی بلکہ انہوں نے کوشش کی کہ حقیقی مارکسٹوں کی عوامی تحریروں کو اپنے قارئین تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر لی اور اسے بڑے احسن طریقے سے نبھایا۔ ان میں کئی نام ہمارے سامنے ہیں مثلاً عرفان حبیب، رومیلا تھاپر وغیرہ شامل ہیں جن کی تحریروں اور کتابوں کو ترجمہ کرانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فکشن ہاؤس کے ذریعے شائع کروایا۔ یہ عوامل ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کو عیاں کرتے ہیں کہ وہ حقیقی عالم کو عالم سمجھتے ہیں اور اسے وہ مقام دینے کے قائل ہیں جو کہ اس کا حقیقی درجہ ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام جس سے ڈاکٹر مبارک علی بہت متاثر رہے اور جن کی تحریروں کو ترجمہ کرا کر اردو زبان کے قارئین تک پہنچانے کے عمل کو کامیاب بنایا وہ مارکسی ماہر عمرانیات پروفیسر حمزہ علوی ہیں۔ حمزہ علوی صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر عرصہ دیارِ غیر میں برطانیہ اور کینیڈا کی کئی ممتاز یونیورسٹیوں میں پڑھاتے گزارا۔ انہوں نے بے تحاشہ تحقیقی کام کیا لیکن بدقسمتی سے ان کا کام انگریزی میں تھا اور بکھرا ہوا تھا۔ اس لیے پاکستانی قارئین



کی وہ توجہ حاصل نہ کر سکا جس کا کہ وہ حقدار تھا کیونکہ انہوں نے زیادہ تر تحقیقی کام تحریک پاکستان، ہندوستان کے مسلمان معاشرہ، تقسیم ہند، مذہبی انتہا پسندی، تخلیق پاکستان اور پاکستان کے سول اور فوجی پر کیا تھا۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری تھا کہ ایسے حقیقی تحقیقی کام کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے حمزہ علوی سے اپنی دیرینہ دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی تحریروں کو اردو میں شائع کروایا۔ حمزہ صاحب کے مضامین پر مشتمل کتابیں "جاگیرداری اور سامراج"، "پاکستان ریاست اور اس کا بحران" کے نام سے شائع کروائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش رہی کہ ان کے مزید مضامین کا بھی ترجمہ ہو اور یہ شائع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں اب یہ ذمہ داری انہوں نے مجھے سونپی اور نہ صرف یہ ذمہ داری سونپی بلکہ ہم جیسے لاپروا اور لاابالی لوگوں کو ہر وقت یاد دہانی بھی کراتے رہے کہ یہ کام جلد از جلد مکمل کیا جائے۔ اس کا ایک سہل اور قابلِ عمل طریقہ بھی ان ہی نے تجویز کیا جس کے تحت میری ذمہ داری یہ ٹھہری کہ حمزہ علوی کا ایک مضمون ڈاکٹر صاحب کے سہ ماہی تحقیقی جرنل "تاریخ" کے لیے مہیا کروں۔ کوشش کر کے جب ہم نے یہ ذمہ داری نبھائی اور مضمون کثیر مقدار میں اکٹھا ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب نے اچانک یہ خوش خبری سنائی کہ انہوں نے فکشن ہاؤس کے ذریعے ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرانے کا اہتمام کر لیا ہے۔ ہم جیسے نوجوانوں کے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ حمزہ علوی کے تراجم کیے جائیں اور انہیں ڈاکٹر مبارک علی جیسے عوامی دانشور کی سرپرستی میں ان کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ مزید اعزاز یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی ترتیب اور تمام مراحل اپنی زیر نگرانی طے کرائے اور سب سے بڑی بات یہ کہ کتاب کا سرورق خود اپنی خواہش پر اپنی بیٹی نین تارا جو کہ آرٹ سے نہ صرف شغف رکھتی ہے بلکہ دلجمعی سے کام بھی کرتی ہے۔ اس سے اس کا سرورق بھی بنوایا۔ نین تارا ہی آج کل ڈاکٹر صاحب کی شائع ہونے والی کتابوں کے بڑے دلکش سرورق بنا رہی ہے اور کیوں نہ بنائے بالآخر عظیم باپ کی بیٹی جو ہے۔ اسے گھر میں وہ ماحول اور تربیت ملی جو کہ بہت سے لوگوں کو نصیب نہ ہو سکے اور ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم نے پوری طرح حقِ تربیت بھی ادا کیا۔ میری یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے تعاون اور ان کی کاوشوں سے "تخلیق پاکستان، سماجی و تاریخی مباحث" کے نام سے ۲۰۱۲ء میں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں سے تاریخ جیسے مضمون کو جسے عمومی طور پر ایک خشک اور بوریت کا مضمون سمجھا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو عوامی دلچسپی کا مضمون بنا دیا۔ اب یہ مضامین اور ڈاکٹر صاحب کی تحریریں عوام سے عوامی زبان میں بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کے لیے ایک مزید ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھالی اور اسے اب

تک بڑی خوبی سے نبھاتے چلے آ رہے ہیں اور وہ ہے سالانہ ''تاریخ کانفرنس''۔ ڈاکٹر صاحب بڑی کامیابی سے گذشتہ برسوں سے اس کا کامیاب انعقاد کرتے آ رہے ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ بغیر کسی مالی مدد اور کسی خاص معاونت کے نہ ہونے کے باوجود اس سلسلے میں کسی ایک سال بھی کوئی تعطل نہیں آیا۔ میرے لیے یہ بڑی اعزاز کی بات تھی جب ۲۰۱۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کی کانفرنس کو ہمارے ادارے szabist میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار کانفرنس کا موضوع تھا ''تاریخ اور جنگ'' جبکہ اس سے قبل کئی اہم موضوعات مثلاً ''تاریخ اور عوامی تحریکیں''، ''مارشل لاء کی تاریخ''، ''تاریخ اور عورت'' اور دیگر کئی موضوعات پر یہ کانفرنس منعقد ہوئیں۔ ان کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے تحقیقی مقالوں کا معیار انتہائی بلند رہا ہے۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد نے اس سلسلے کی کئی کانفرنسوں کو بڑے احسن طریقے سے منعقد کروانے میں بڑی تگ و دو کی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تاریخ کانفرنس اب ایک اہم علمی روایت بن گئی ہے جو کہ کبھی لاہور، کراچی اور دیگر شہروں میں منعقد ہوتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک مزید کاوش سہ ماہی تحقیقی جرنل ''تاریخ'' کا اجراء ہے۔ اب تک اس جرنل کے 47 شمارے شائع ہو چکے ہیں اور ہر شمارہ ایک اعلیٰ تحقیق کا شاہکار ہے۔ اس شمارے میں جہاں ایک طرف سالانہ تاریخ میں پڑھے جانے والے مضامین شائع ہوتے ہیں تو دوسری طرف اس میں اعلیٰ پائے کے تحقیقی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ کئی شمارے خصوصی نمبرز کے طور پر شائع ہوئے ان جرنل میں کئی نامور دانشوروں کے مضامین کو ترجمہ کر کے شائع بھی کرایا گیا۔ اس جرنل کی اشاعت بذات خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور ایسے حالات میں جہاں اس ملک میں لکھنے والوں کی قلت ہو اور جتنے لکھنے والے باقی ہیں وہ بھی اپنی دیگر مصروفیات میں الجھے ہوئے ہوں تو ایسے حالات میں مضامین تحریر کروانا اور پھر انہیں شائع کروانا ایک جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن ڈاکٹر صاحب ان تمام مشکلات اور مصائب کے باوجود بالکل نہیں گھبرائے اور ہمت نہیں ہارے اور اس جرنل کو باقاعدگی سے شائع کرواتے رہے، اور یہ جرنل ایک مقبول تحقیقی جرنل کے طور پر سامنے آ گیا ہے۔ اس نے اپنی مستند علمی حیثیت منوالی ہے۔ یہ کام ڈاکٹر مبارک علی کی ذات سے ہی ممکن ہوا کہ یہ کام آگے بڑھایا جا سکے۔ تحقیقی جرنل ہمارے ملک کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور ادارے شائع نہیں کر سکتے لیکن ڈاکٹر مبارک علی نے جو کہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں انہوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں اس جرنل کو ایک معیاری تحقیقی جرنل بنا ڈالا ہے اور دیگر کئی لوگوں کے لیے ایک مثال قائم کر دی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو گذشتہ دو دہائیوں سے بینائی کا مسئلہ درپیش رہا لیکن اس تکلیف کے باوجود انہوں



نے اپنے علمی کام کو نہ رکنے دیا۔ ان کے حوصلے خطا نہ ہوئے ان کی ہمت نہ ٹوٹی بلکہ انہوں نے اپنے مسئلے مسائل کا حل نکال ہی لیا ہے اور ان کا علمی کام آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنا کام جاری رکھنے میں ان کے خاندان اور خصوصاً ان کی بیگم ذکیہ اور ان کی چھوٹی بیٹی نین تارا کا بھرپور ساتھ رہا۔ ہمیں ان دونوں افراد کو بھی مکمل کریڈٹ دینا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک عرصے تک جس طرح کورٹ کچہری کو بھگتا اور ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹی، لوگوں نے جس طرح بلاوجہ ان کو ہی معاملات میں الجھایا جس کا ان سے دور دور تک واسطہ نہیں تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ سچ بالآخر سچ تھا اور ڈاکٹر صاحب تمام تر پریشانیوں کے باوجود ان تمام معاملات سے سرخرو ہو کر نکلے ہمارے جیسا کوئی کم حوصلہ مند ان حالات کا شکار ہوتا تو وہ فوراً اپنی ہمت ہار چکا ہوتا لیکن یہ ڈاکٹر صاحب جیسا ہی کردار تھا کہ جنہوں نے تمام تر مصائب کے باوجود اپنا علمی کام جاری رکھا۔ آج کے اس دور میں ڈاکٹر مبارک علی جیسا عوامی دانشور یقیناً ہم جیسے لوگوں کے لیے ڈھارس اور امید کی ایک کرن ہے۔ ہماری دعا اور خواہش ہے کہ ڈاکٹر مبارک مزید لکھیں اور بہت لکھیں اور اس ملک کے لوگوں میں روشن خیالی اور بیداری شعور کی جو صلیب انہوں نے اُٹھا رکھی ہے اس کو مزید مضبوطی سے تھامے رکھیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری نسل اور دانشوروں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کی ان علمی کاوشوں کا بھرپور ساتھ دیں تا کہ ڈاکٹر صاحب کا مشن آگے بڑھ سکے۔ مجھے یہ بات کہنے دیجیے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں اور بڑی بدقسمتی ہے وہ قوم اور گروہ جو ڈاکٹر مبارک علی جیسے عوامی دانشور کے حقیقی مقام کو نہ سمجھ سکے۔ حکومتی سطح پر آج تک ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا کوئی اعتراف نہیں اور انہیں اس کا گلہ بھی نہیں کیونکہ ایک ایسے ملک میں جہاں بیشتر اوقات فوجی حکومتیں نافذ رہی ہیں اور جہاں جمہوریت اور جمہوری اقدار کا فقدان رہا ہو وہاں ڈاکٹر صاحب کی روشن خیالی اور خرد افروزی پر مشتمل تحریروں کو کون برداشت کرنے کو تیار ہو گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے بقول چاہے ہم تعداد میں کتنے کم ہی کیوں نہ ہوں چاہے حالات کتنے نامساعد ہی کیوں نہ ہوں ہم اپنی کاوشیں جاری رکھیں گے چاہے راہ میں کتنی رکاوٹیں ہی کیوں نہ آئیں ہم اپنے مشن کو آگے ہی بڑھائیں گے، ہم لڑیں گے اور جدوجہد کرتے رہیں گے عوام کے حق حکمرانی کے لیے، مظلوم قوموں اور گروہوں کے حقوق کے لیے، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف، ظلم اور استحصال کے خلاف، سماجی ناہمواری کے خلاف۔ کیونکہ بنا جدوجہد ہم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا حوصلہ اور ہمت ہے، جس نے ہم جیسے کارکنوں میں جدوجہد کرنے کی قندیل جلا دی ہے۔

# ڈاکٹر مبارک علی

انور کمال

ڈاکٹر مبارک علی خان سے تعارف کیسے ہوا، ملاقات کیوں اور کہاں ہوئی...... یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب بذاتِ خود دلچسپ ہے۔

تعارف ہوا جب ڈاکٹر مبارک علی حیدر آباد میں مقیم تھے اور لاہور میں ان کے چند ہاتھ سے تحریر شدہ کتابچے پڑھنے کو ملے۔ اس کے بعد ایک قدرے ضخیم، غالباً 120 صفحات پر مشتمل کتاب بعنوان ''برصغیر پاک و ہند میں مسلمان معاشرے کا المیہ'' پڑھنے کو ملی۔ مروجہ سوچ سے ہٹ کر حقائق کو ایک نئے زاویے سے دیکھا، پرکھا۔ پریشانی کے عالم میں اپنے دوست انگریزی کے استاد ایس ایم رضی عابدی کے پاس گیا اور ان سے معاملے پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی۔ آپسی بحث و مباحثہ کے بعد طے پایا کہ رضی اور میں حیدر آباد جا کر ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقات کریں۔

چنانچہ رضی اور میں ریل سے ڈاکٹر مبارک علی کے گھر حیدر آباد میں جا پہنچے۔ تعارف کروایا اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ گفتگو کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ہم دونوں مسافروں کو کھانا بھی کھلایا اور رات ہو جانے پر اپنی بیٹھک میں دو بستر بھی عنایت فرما دیئے۔ مہمان نوازی سے اندازہ ہوا کہ بھابی ڈاکٹر مبارک علی کی ہر طرح سے شریکِ حیات اور معاون ہیں۔

صبح ناشتہ کے بعد آگاہی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر رضی اور میں بس سے لاہور واپس آ گئے۔ اس ابتدائی ملاقات کے بعد ڈاکٹر مبارک علی سے باقاعدہ رابطہ رہا اور جب ریٹائرمنٹ کے وقت ڈاکٹر مبارک علی دوستوں کے اصرار پر کراچی جانا چاہتے تھے تو رضی اور میں انہیں لاہور کھینچنے لگے۔ بالآخر ہم کامیاب ہوئے اور ڈاکٹر مبارک علی ہمراہ اہل و عیال لاہور میں آ بسے۔ تعلیم و تدریس کے اس شہر نے ڈاکٹر مبارک علی کو اپنی آغوش میں لیا اور اگرچہ ڈاکٹر مبارک علی کبھی کبھی کراچی والوں کی باتوں میں آ کر یہ کہتے کہ انہیں کراچی جانا چاہئے تھا، رہے وہ لاہور میں ہی۔



ڈاکٹر مبارک علی ایک نامور مورخ ہیں، کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا اپنا منفرد مقام ہے۔

میری تعلیم لاہور شہر کے انگریزی ذریعہ تعلیم اور پھر گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی میں ہوئی۔ پنجابی ادب سے نابلد، اردو میں اظہار کمزور اور انگریزی دال دلیا کمانے لائق۔ سکول میں تاریخ قصہ کہانیوں کے طور پر اور وہ بھی بادشاہوں کی شان و شوکت کے قصیدے، داخلی و خارجی جنگوں اور شہزادے شہزادیوں کے عشق اور شادی بیاہ کی داستانوں کے طور پر پڑھائی گئی۔

ڈاکٹر مبارک علی نے اس تعلیمی پس منظر کے نوجوان کو آنکھیں دیں۔ میرا تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کا زاویہ بدل گیا۔ یہ کیا......؟ سکندرِ اعظم اور اکبرِ اعظم کے ادوار میں ان کی رعایا بھی تھی، عام لوگ بھی بستے تھے، جن کی بابت اس سے پہلے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دنیا اور اس کی تاریخ لوگوں کے حوالے سے دیکھنے سے دماغ روشن ہوا۔ ہلچل پیدا ہوئی۔ انسانی سماج کے ارتقاء کی جدلیاتی و مادی بنیادوں کا پتہ چلا۔ برصغیر پاک و ہند میں برطانوی استعماری دور کیا تھا، کیوں تھا، غلامی اور اس سے بھی بدتر غلامانہ ذہن کیسے تشکیل پایا، کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔

عالمی جنگِ عظیم اول و دوم، آج کا امریکہ، آج کے عالمی استحصالی اداروں اور سرمایہ داری نظام کے خلاف جدوجہد کی ضرورت اور تاریخی پس منظر کا شعور ملا۔ ڈاکٹر مبارک علی جن عام لوگوں کے حوالے سے تاریخ لکھتے ہیں، اس کو انہی کی زبان میں لکھتے ہیں۔ طرزِ تحریر سادہ اور سمجھ میں آنے والا ہے۔ جو اخباری کالم بھی لکھتے ہیں، ان میں موضوع ایسے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا آج کی اپنی دنیا پر منطبق کر کے سمجھ سکتا ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ حکمران طبقات کن مشاغل میں مصروف ہیں۔ نظام فرسودہ، جو پہلے تھا، سو اب بھی ہے۔ عوام بدحال، جو پہلے تھے، سو اب بھی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی سے تعارف نے اپنے سماج کو، اپنی دنیا کو، اپنے گردونواح کو سمجھنے میں ایک ایسے شخص کی مدد کی جو استعمار، استبداد، استحصال، سامراج، جبر، غلامانہ ذہن جیسے الفاظ اور ان کے تاریخی معنوں سے روشناس ہی نہ تھا۔ جس کی سولہ سالہ باقاعدہ تعلیم نے اسے اندھا و بہرہ رکھا تھا۔

اس سے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو جاننے کا بھی موقع ملتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو ایک دیومالائی دنیا میں پالتے ہیں۔ نہ انہیں اپنے سماج سے، نہ اپنی حقیقی دنیا سے روشناس کرواتے ہیں۔ نہ بچوں کو اس ادب کی طرف لے کر جاتے ہیں جس سے بچوں میں سماجی و سیاسی شعور پیدا ہو سکے جو آگے چل کر پروان چڑھ سکے اور نئی نسل میں تنقیدی صلاحیتیں پیدا کر سکے۔

ڈاکٹر مبارک علی جیسے اساتذہ کرام کی اپنے معاشرے کو یہی دین ہے کہ وہ ان عام لوگوں کو بینائی کا چشمہ دیتے ہیں جو ان کی جانب توجہ کرتے ہیں۔ میں ایسے تمام اساتذہ کرام کو سلام پیش کرتا ہوں۔

# ڈاکٹر مبارک

رضی عابدی

ڈاکٹر مبارک علی، ایک منفرد نام، ایک منفرد کام۔ 1986ء میں لاہور فورم نے، جس کے صدر پروفیسر اشفاق علی خان اور سیکریٹری پروفیسر منظور احمد، تاریخ پر ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ منتظمین نے اس سلسلے میں بہت دماغ دوڑائے۔ لیکن لاتعداد کالجوں اور جامعات کی موجودگی کے باوجود کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آیا۔ کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو تاریخ کے کسی موضوع پر درسی سبق سے ہٹ کر کوئی بات کر سکے۔ اس وقت تک کسی نے ڈاکٹر صاحب کا نام نہیں سنا تھا۔ پہلی مرتبہ لاہور ڈاکٹر مبارک علی کے نام سے واقف ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے لئے ایک بڑی خوش آئند دریافت تھے اور ہمارے لئے یہ دریافت انور کمال صاحب کی تھی۔

تاریخ کو عموماً محض ایک مضمون سمجھا جاتا تھا۔ جس کا بظاہر عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے 1947ء میں میٹرک کا امتحان دلی بورڈ سے دیا تھا۔ وہاں تاریخ اور جغرافیہ لازمی مضامین تھے۔ طلباء عام طور پر یہ کہتے سنائی دیتے تھے کہ تاریخ جغرافیہ بے وفا، شام کو گھوٹو، صبح صفا۔ تاریخ کو محض تاریخوں اور سالوں کا گورکھ دھندا سمجھا جاتا تھا۔ جو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا زبردست کام یہ ہے کہ انہوں نے نوجوانوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا کی اور اسے ایک بامعنی مطالعہ بنادیا۔

ڈاکٹر مبارک علی پر ایک اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ پر کوئی بڑا کام نہیں کیا اور چھوٹے چھوٹے تعارفی مقالے لکھے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ ڈاکٹر مبارک علی کے لئے کوئی نصابی مضمون نہیں بلکہ سوچ کا ایک انداز ہے۔ وہ چاہتے تو بڑے بڑے ضخیم تحقیقی مقالے بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نام ونمو کے لئے نہیں لکھتے۔ وہ ایک درویش صفت علم دوست سکالر ہیں اور تاریخ سے انہیں عشق ہے جسے وہ ساری دنیا کا محبوب بنانا چاہتے ہیں۔



ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تاریخ ماضی کی بھولی بسری کہانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ہمارا حال ہے۔ یہ وقت کا ایک آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنی بنتی بگڑتی سنورتی شکلیں نظر آتی ہیں۔ اس میں ہمیں اپنے خدوخال نظر آتے ہیں۔ اپنی خوبیاں اور خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ہم چاہیں تو اسے اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کی تصویر سمجھیں۔ یہ آج کو دور سے دیکھنے کا طریقہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو کتابوں سے نکال کر ایک زندہ جیتی جاگتی تصویر بنادیا ہے۔ ایک ایسی تصویر جس میں تذکرہ تو دوسروں کا ہوتا ہے لیکن تصویر اپنی ہی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو اب لوگ خصوصاً ہمارے نوجوان محض ایک درسی کاوش نہیں سمجھتے بلکہ اس میں انہیں ایک چلتی پھرتی زندہ حقیقت نظر آتی ہے۔

تحقیق یقیناً ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے اس میں دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سارا عمل میکانکی ہو کر رہ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو دلچسپ بنادیا ہے اور اسے درسگاہوں سے نکال کر عام زندگی کا جزو بنادیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ادب زندگیوں میں جاری اور ساری ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ تاریخ کے موضوع پر جلسے نہیں کئے جاتے تھے۔ یہ عام دلچسپی کا موضوع نہیں تھا۔ لیکن آج تاریخی مجلسوں میں بھی لوگ خصوصاً نوجوان ایسے شوق سے آتے ہیں جیسے کبھی مشاعروں میں آتے تھے، اور یہ سب ڈاکٹر صاحب کی محنت اور ان کی تاریخ سے والہانہ لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ اور پنجاب کے دوردراز علاقوں میں، یہاں تک ہندوستان کے طول وعرض میں بھی لوگ ڈاکٹر صاحب کی آمد کے منتظر رہتے ہیں اور بڑے شوق اور انہماک سے اُن کی باتیں سنتے ہیں۔

اس تمام گفتگو سے یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب صرف لوگوں کی تفریح طبع کے لئے تاریخی موضوعات پر دلچسپ اور عوام پسند مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علمی گہرائی اور تحقیقی باریک بینی ہے۔ انہوں نے بہت سے تاریخی مغالطوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً

> ''اس ضمن میں سب سے اہم عنصر نظریہء پاکستان کا ہے کہ جو پاکستان بننے کے بعد وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ 1970ء کی دہائی میں اس کی تبلیغ شروع ہوئی۔ چونکہ پاکستان کی جدوجہد میں سیاست و مذہب دونوں کا دخل تھا اس لئے نظریہء پاکستان کی تعمیر میں دونوں عناصر کو شامل کر کے اس کا جواز بنایا گیا اور تاریخ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔''

(تاریخ اور نصابی کتب)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران نہ تو مسلم لیگ کے عمائدین کے ذہن

اور نہ ان کے مخالفین کے ذہن میں کوئی تذبذب تھا۔ مسلم لیگ پاکستان مسلمانوں کے لئے حاصل کرنا چاہتی تھی نہ کہ اسلام کے لئے ___ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پاکستان کے علاوہ کسی بھی منصوبہ کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی۔ اسی لئے تمام مذہبی جماعتوں اور تقریباً سب ہی مذہبی علماء نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی بلکہ ایک سیکولر تحریک تھی۔ مسلمان صرف ایک مذہبی جمعیت نہیں تھے بلکہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت بھی تھے۔ پاکستان کا مطالبہ مذہبی نہیں بلکہ ایک سیاسی مطالبہ تھا۔ تاریخ کا مطالعہ ایسی الجھنوں کو سلجھانے میں بہت مدد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> ''جب کبھی معاشرے میں انتشار ہوتا ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت اگر تاریخ کی مدد لی جائے تو وہ اس زوال کے عمل کو روک سکتی ہے اور معاشرے کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان ثقافتی اور سماجی روابط کو تلاش کر کے انہیں یک جہتی کے مواقع فراہم کر سکتی ہے۔''

(تاریخ کی روشنی)

اس طرح تاریخ کو قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تاریخ کی صحیح تدریس بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ:

> ''تاریخ کو کیسے پڑھانا چاہئے کہ یہ ہماری نسل سے نفرت اور تنگ نظری کو ختم کر کے ان میں وسیع النظری اور قوت برداشت پیدا کرے؟ کیونکہ اس وقت تاریخ کو جس انداز میں پڑھایا جا رہا ہے وہ انتہائی فرسودہ طریقہ ہے جس نے ہماری نسل کو جاہل اور تنگ نظر بنا رکھا ہے۔''

(تاریخ اور آگہی)

آج ہماری سیاست اور ثقافت کا یہ سب سے اہم مسئلہ ہے اور ہر طرف اس بات پر گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں کہ ہماری قوم میں قوتِ برداشت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ بات بات پر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات ___ یہاں تک کہ بچوں کی لڑائی پر بھی گولیاں چلتی ہیں اور جانیں جاتی ہیں۔ علاقائی، فرقہ وارانہ اور یہاں تک کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ بھی تشدد آمیز رویے عام نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے ذریعہ ان تضادات کو معقولیت کی حد تک رکھنے کا راستہ دکھایا ہے۔ یہ اُن کا جہاد ہے جو وہ بلا خوف و خطر اور بلا کسی ذاتی مفاد کے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی اس کوشش نے بہت سے لوگوں میں سچ کہنے کی ہمت پیدا کی ہے۔



# ڈاکٹر مبارک علی ایک تابندہ ستارہ

سردار عظیم اللہ میو

معاشرے یقیناً انسانی رویّوں سے عبارت ہوتے ہیں۔ انسانوں کے شعور اور اخلاقیات کا مجموعی مظہر معاشرے کی اجتماعی سوچ ہوتی ہے۔ بدقسمت معاشروں کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں سمجھ، فہم، دانش، برداشت، ایمانداری اور دور اندیشی جیسے جوہر منافقت، مکاری، طاقت کی بے جا نمائش اور کج فہمی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس پیمانے پر پرکھا جائے تو ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ کسی طرح بھی خوش قسمت کہلانے کا سزاوار نہیں۔ اس رویّے کا ایک عکس ہمارے ہیروز کے چناؤ میں نظر بھی آتا ہے۔ ہم میں سے اکثریت کے ہیروز وہ لوگ ہیں جو عقلی شعور کی بجائے جسمانی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور ہیں اور اگر ایک دو لوگ لکھنے پڑھنے والوں میں سے بھی اس فہرست میں شامل ہیں تو انہیں ہم نے مختلف وجوہات کی وجہ سے جن میں جذباتیت سب سے اہم وجہ ہے ایک ایسے سنگھاسن پر بٹھایا ہوا ہے جہاں بیٹھے وہ ہر قسم کی تنقید و تعریف سے ماوراء ہیں۔ ان کے کام کو عقلی دلیل پر پرکھنا کفر ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں جس قسم کے معاشرتی رجحان ہو سکتے ہیں اور جتنے خطرناک ہو سکتے ہیں ہمارا معاشرہ اس کی بین مثال ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے بعد کے چھیاسٹھ سالوں میں فکر و دانش اور علم و فن کے میدان میں ہم دنیا میں آخری سرے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ معدودے دو چار لوگ ہوں گے جنہوں نے اس میدان میں بین الاقوامی سطح پر اپنا نام بنایا اور دنیا نے اُنہیں صاحب فن تسلیم کیا ہے۔ سوال یہ ہے اگر ایسا ہے تو کیا ہماری دھرتی بنجر ہو چکی ہے جو علم و دانش اور فکر و فلسفہ کے میدان میں کوئی نیا شگوفہ کھلانے سے قاصر ہے۔ جواب یقیناً نفی میں آئے گا۔ ہمیں دنیا کی ذہین اقوام میں شمار کیا جاتا ہے۔ دھرتی تو اپنے سینے سے متنوع قسم کے پھولوں کی افزائش میں مصروف ہے۔ یہ تو ہمارا المیہ ہے کہ جس پھول کی خوشبو ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے اُسے ہم اپنے گاؤں، شہروں تک بھی پھیلنے سے روکتے ہیں۔ ہمارے اس

# ڈاکٹر مبارک

رضی عابدی

ڈاکٹر مبارک علی، ایک منفرد نام، ایک منفرد کام۔ 1986ء میں لاہور فورم نے، جس کے صدر پروفیسر اشفاق علی خان اور سیکریٹری پروفیسر منظور احمد، تاریخ پر ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ منتظمین نے اس سلسلے میں بہت دماغ دوڑائے۔ لیکن لاتعداد کالجوں اور جامعات کی موجودگی کے باوجود کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آیا۔ کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو تاریخ کے کسی موضوع پر درسی سبق سے ہٹ کر کوئی بات کر سکے۔ اس وقت تک کسی نے ڈاکٹر صاحب کا نام نہیں سنا تھا۔ پہلی مرتبہ لاہور ڈاکٹر مبارک علی کے نام سے واقف ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے لئے ایک بڑی خوش آئند دریافت تھے اور ہمارے لئے یہ دریافت انور کمال صاحب کی تھی۔

تاریخ کو عموماً محض ایک مضمون سمجھا جاتا تھا۔ جس کا بظاہر عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے 1947ء میں میٹرک کا امتحان دلی بورڈ سے دیا تھا۔ وہاں تاریخ اور جغرافیہ لازمی مضامین تھے۔ طلباء عام طور پر یہ کہتے سنائی دیتے تھے کہ تاریخ جغرافیہ بے وفا، شام کو گھوٹو صبح صفا۔ تاریخ کو محض تاریخوں اور سالوں کا گورکھ دھندا سمجھا جاتا تھا۔ جو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا زبردست کام یہ ہے کہ انہوں نے نوجوانوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا کی اور اسے ایک بامعنی مطالعہ بنا دیا۔

ڈاکٹر مبارک علی پر ایک اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ پر کوئی بڑا کام نہیں کیا اور چھوٹے چھوٹے تعارفی مقالے لکھے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ ڈاکٹر مبارک علی کے لئے کوئی نصابی مضمون نہیں بلکہ سوچ کا ایک انداز ہے۔ وہ چاہتے تو بڑے بڑے ضخیم تحقیقی مقالے بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نام ونمو کے لئے نہیں لکھتے۔ وہ ایک درویش صفت علم دوست سکالر ہیں اور تاریخ سے انہیں عشق ہے جسے وہ ساری دنیا کا محبوب بنانا چاہتے ہیں۔



ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تاریخ ماضی کی بھولی بسری کہانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ہمارا حال ہے۔ یہ وقت کا ایک آئینہ ہے، جس میں ہمیں اپنی بنتی بگڑتی سنورتی شکلیں نظر آتی ہیں۔ اس میں ہمیں اپنے خدوخال نظر آتے ہیں۔ اپنی خوبیاں اور خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ہم چاہیں تو اسے اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کی تصویر سمجھیں۔ یہ آج کو دور سے دیکھنے کا طریقہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو کتابوں سے نکال کر ایک زندہ جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ ایک ایسی تصویر جس میں تذکرہ تو دوسروں کا ہوتا ہے لیکن تصویر اپنی ہی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو اب لوگ خصوصاً ہمارے نوجوان محض ایک درسی کاوش نہیں سمجھتے بلکہ اس میں انہیں ایک چلتی پھرتی زندہ حقیقت نظر آتی ہے۔

تحقیق یقیناً ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن کسی موضوع پر تحقیق سے پہلے اس میں دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سارا عمل میکانکی ہو کر رہ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو دلچسپ بنا دیا ہے اور اسے درسگاہوں سے نکال کر عام زندگی کا جزو بنا دیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ادب زندگیوں میں جاری اور ساری ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ تاریخ کے موضوع پر جلسے نہیں کئے جاتے تھے۔ یہ عام دلچسپی کا موضوع نہیں تھا۔ لیکن آج تاریخی مجلسوں میں بھی لوگ خصوصاً نوجوان ایسے شوق سے آتے ہیں جیسے کبھی مشاعروں میں آتے تھے، اور یہ سب ڈاکٹر صاحب کی محنت اور ان کی تاریخ سے والہانہ لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ اور پنجاب کے دور دراز علاقوں میں، یہاں تک ہندوستان کے طول وعرض میں بھی لوگ ڈاکٹر صاحب کی آمد کے منتظر رہتے ہیں اور بڑے شوق اور انہماک سے اُن کی باتیں سنتے ہیں۔

اس تمام گفتگو سے یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب صرف لوگوں کی تفریح طبع کے لئے تاریخی موضوعات پر دلچسپ اور عوام پسند مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علمی گہرائی اور تحقیقی باریک بینی ہے۔ انہوں نے بہت سے تاریخی مغالطوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً

> ”اس ضمن میں سب سے اہم عنصر نظریہء پاکستان کا ہے کہ جو پاکستان بننے کے بعد وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ 1970ء کی دہائی میں اس کی تبلیغ شروع ہوئی۔ چونکہ پاکستان کی جدوجہد میں سیاست ومذہب دونوں کا دخل تھا اس لئے نظریہء پاکستان کی تعمیر میں دونوں عناصر کو شامل کر کے اس کا جواز بنایا گیا اور تاریخ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔“

(تاریخ اور نصابی کتب)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران نہ تو مسلم لیگ کے عمائدین کے ذہن

اور نہ ان کے مخالفین کے ذہن میں کوئی تذبذب تھا۔ مسلم لیگ پاکستان مسلمانوں کے لئے حاصل کرنا چاہتی تھی نہ کہ اسلام کے لئے ___ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پاکستان کے علاوہ کسی بھی منصوبہ کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی۔ اسی لئے تمام مذہبی جماعتوں اور تقریباً سب ہی مذہبی علماء نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی بلکہ ایک سیکولر تحریک تھی۔ مسلمان صرف ایک مذہبی جمعیت نہیں تھے بلکہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت بھی تھے۔ پاکستان کا مطالبہ مذہبی نہیں بلکہ ایک سیاسی مطالبہ تھا۔ تاریخ کا مطالعہ ایسی الجھنوں کو سلجھانے میں بہت مدد ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

"جب کبھی معاشرے میں انتشار ہوتا ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت اگر تاریخ کی مدد لی جائے تو وہ اس زوال کے عمل کو روک سکتی ہے اور معاشرے کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان ثقافتی اور سماجی روابط کو تلاش کر کے انہیں یک جہتی کے مواقع فراہم کرسکتی ہے۔"

(تاریخ کی روشنی)

اس طرح تاریخ کو قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تاریخ کی صحیح تدریس بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ:

"تاریخ کو کیسے پڑھانا چاہئے کہ یہ ہماری نسل سے نفرت اور تنگ نظری کو ختم کر کے ان میں وسیع النظری اور قوت برداشت پیدا کرے؟ کیونکہ اس وقت تاریخ کو جس انداز میں پڑھایا جا رہا ہے وہ انتہائی فرسودہ طریقہ ہے جس نے ہماری نسل کو جاہل اور تنگ نظر بنا رکھا ہے۔"

(تاریخ اور آگہی)

آج ہماری سیاست اور ثقافت کا یہ سب سے اہم مسئلہ ہے اور ہر طرف اس بات پر گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں کہ ہماری قوم میں قوتِ برداشت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ بات بات پر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات ___ یہاں تک کہ بچوں کی لڑائی پر بھی گولیاں چلتی ہیں اور جانیں جاتی ہیں۔ علاقائی، فرقہ وارانہ اور یہاں تک کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ بھی تشدد آمیز رویے عام نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے ذریعہ ان تضادات کو معقولیت کی حد تک رکھنے کا راستہ دکھایا ہے۔ یہ اُن کا جہاد ہے جو وہ بلاخوف وخطر اور بلا کسی ذاتی مفاد کے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی اس کوشش نے بہت سے لوگوں میں سچ کہنے کی ہمت پیدا کی ہے۔



# ڈاکٹر مبارک علی ایک تابندہ ستارہ

سردار عظیم اللہ میو

معاشرے یقیناً انسانی رویّوں سے عبارت ہوتے ہیں۔ انسانوں کے شعور اور اخلاقیات کا مجموعی مظہر معاشرے کی اجتماعی سوچ ہوتی ہے۔ بدقسمت معاشروں کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں سمجھ، فہم، دانش، برداشت، ایمانداری اور دور اندیشی جیسے جوہر منافقت، مکاری، طاقت کی بے جا نمائش اور کج فہمی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس پیمانے پر پرکھا جائے تو ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ کسی طرح بھی خوش قسمت کہلانے کا سزاوار نہیں۔ اس رویّے کا ایک عکس ہمارے ہیروز کے چناؤ میں نظر بھی آتا ہے۔ ہم میں سے اکثریت کے ہیروز وہ لوگ ہیں جو عقلی شعور کی بجائے جسمانی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور ہیں اور اگر ایک دو لوگ لکھنے پڑھنے والوں میں سے بھی اس فہرست میں شامل ہیں تو انہیں ہم نے مختلف وجوہات کی وجہ سے جن میں جذباتیت سب سے اہم وجہ ہے ایک ایسے سنگھاسن پر بٹھایا ہوا ہے جہاں بیٹھے وہ ہر قسم کی تنقید و تعریف سے ماوراء ہیں۔ ان کے کام کو عقلی دلیل پر پرکھنا کفر ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں جس قسم کے معاشرتی رجحان ہوسکتے ہیں اور جتنے خطرناک ہوسکتے ہیں ہمارا معاشرہ اس کی بین مثال ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے بعد کے چھیاسٹھ سالوں میں فکر و دانش اور علم و فن کے میدان میں ہم دنیا میں آخری سرے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ معدودے دو چار لوگ ہوں گے جنہوں نے اس میدان میں بین الاقوامی سطح پر اپنا نام بنایا اور دُنیا نے اُنہیں صاحبِ فن تسلیم کیا ہے۔ سوال یہ ہے اگر ایسا ہے تو کیا ہماری دھرتی بنجر ہو چکی ہے جو علم و دانش اور فکر و فلسفہ کے میدان میں کوئی نیا شگوفہ کھلانے سے قاصر ہے۔ جواب یقیناً نفی میں آئے گا۔ ہمیں دنیا کی ذہین اقوام میں شمار کیا جاتا ہے۔ دھرتی تو اپنے سینے سے متنوع قسم کے پھولوں کی افزائش میں مصروف ہے۔ یہ تو ہمارا المیہ ہے کہ جس پھول کی خوشبو ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے اُسے ہم اپنے گاؤں، شہروں تک بھی پھیلنے سے روکتے ہیں۔ ہمارے اس

روپے کی وجہ سے کتنے ہی درخشاں ستارے وقت سے پہلے اپنی تابنا کی کھو بیٹھے یا کسی اور آسمان کی تلاش میں اس مدار سے ہی نکل گئے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا آسمان ابھی تک ایسے کچھ ستاروں سے مزیّن ہے جنہوں نے باوجود نامساعد حالات کے نا تو مدار بدلا اور نہ ہی اپنی تابنا کی کو ماند پڑنے دیا بلکہ ہر نیا دن ان کے علم و فن کی روشنی میں اضافے کا پیغام لئے آتا ہے۔ ایسا ہی ایک روشن ستارہ ڈاکٹر مبارک علی خان ہیں جو برس ہا برس سے خود اپنے اور اپنے وطن کے ساتھ کئے عہد کو نبھا رہے ہیں اور وہ عہد ہے سچ لکھنے کا، سچ کہنے کا، جبر کے آگے نہ جھکنے کا اور لوگوں تک علم و دانش کا سچ پھیلانے کا۔ بطور مفکّر و مورّخ اُن کی اپنے فن اور فکر سے کمٹمنٹ مثالی ہے۔ جھوٹی کہانیوں کا گورکھ دھندہ کہلانے والا فنِ تاریخ، ماڈرن ازم اور کولونیل ازم سے ہوتا ہوا پوسٹ کولونیل ازم، سب آلٹرن تاریخ نویسی پوسٹ ماڈرن ازم اور اورینٹل ازم تک جا پہنچا ہے جبکہ ہمارے اکثریتی لکھنے والے ابھی تک مذہب اور نسل کے تعصبات سے ہی نہیں نکل سکے۔

فنِ تاریخ کی اس ترقی میں ہمارا کیا حصہ ہے یہ ایک الگ لمحہ فکریہ ہے۔ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زبان میں اپنے لوگوں تک تاریخ کا سچ ابنِ خلدون سے والٹیئر تک پہنچے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں لکھنے کی جرأت و جسارت کی ہے؟ صرف ایک ڈاکٹر مبارک علی۔ کیا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو اکیلے ڈاکٹر مبارک علی کے کام سے ادا ہو جائے گا؟

میری ڈاکٹر صاحب سے پہلی ملاقات 2008ء کے اواخر میں محترم شہاب الدین میو صاحب کی وساطت سے ہوئی اُس وقت تک میں نے ڈاکٹر صاحب کو بہت کم پڑھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے سفرنامے پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ بعدازاں ایک دو جگہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو سنا تو سوچا ڈاکٹر صاحب کی کتابیں بھی پڑھنا چاہئیں اور پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو وہ ناولوں کی طرح روایتی تاریخ لکھتے ہیں اور نہ ہی شخصیات کو دیومالائی ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں بلکہ یہ تو اکثر فلسفیانہ تحریریں ہوتی ہیں جن میں تاریخی واقعات کو حوالہ کے طور پر دیا جاتا ہے مگر یہ ان کے فن کی سچائی ہے کہ ایک عالم ان تحریروں کے سحر میں مبتلا ہے جو عام طور پر خشک تصوّر کی جاتی ہیں۔ تاریخی حقائق کو بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کر دینا ان کا خاصہ ہے اور اسی جرأت اظہار نے اُنہیں ایسے موضوعات پر بھی قلم اُٹھانے کی ترغیب دی ہے جن پر رائے دینا ہمارے یہاں قابلِ گرفت سمجھا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر سچے انسان کی طرح اُنہوں نے بھی آدرشوں پر چلنے کی قیمت چکائی ہے۔ پچھلے دنوں ہماری ادبی



تنظیم ''میواتی دنیا'' کی طرف سے منعقد کی گئی ایک تقریب میں ڈاکٹر صاحب مہمانِ خاص تھے۔ وہاں اُنہوں نے زور دے کر یہ بات کہی کہ ''اشرافیہ کے بارے میں لکھنے والوں کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جن کے پاس فخر کے لئے نام و نسب کا کوئی لاحقہ موجود نہیں اور مخصوص طبقات یا کنبوں قبیلوں کی بڑائی بیان کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا ہوگا کہ کہیں یہ تحریر کسی دوسرے کے لئے آزار کا باعث تو نہیں۔''

اپنی آپ بیتی ''میری دنیا'' میں وہ خود لکھتے ہیں کہ ''میں نے اخلاقی قدروں کو پامال ہوتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ایمانداری اور دیانت کس طرح سے پشیمانی کا باعث بن جاتی ہیں اور کس طرح ایک حساس شخص کے لئے جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے اُس وقت جب مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہو تو لبرل خیال رکھنے والا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ ریاست اور حکومت سے تو لڑ سکتے ہیں لیکن اگر معاشرہ اس کا شکار ہو تو ان سے لڑنا ان کے درمیان زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ سبھی باتیں میرے سامنے ہیں کہ سیاست کس طرح سے دولت کمانے کا ذریعہ بنی اور یہ بھی کہ طبقۂ اعلیٰ کے لوگ قانون سے بالاتر ہو گئے۔ اگرچہ بابر بادشاہ نے کہا ہے کہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' یہ بابر کے لئے تو ٹھیک تھا کہ وہ حکمران تھا اس کے پاس عیش و عشرت کے ذرائع تھے مگر ان لوگوں کے لئے یہ کس قدر اذیت ناک ہے جو جانتے ہیں کہ دنیا بار بار نہیں آئے گی اور وہ مایوسیوں اور محرومیوں کے عالم میں اس جہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو جہاں بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہیں پاکستان میں بھی اُن کو نہایت سنجیدگی سے پڑھا گیا ہے اور حقائق کو غیر جانبداری کی کسوٹی پر پرکھنے کی تحریک میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سوچنے سمجھنے اور علم سے محبت کرنے والے طبقے کی اکثریت کو اُنہوں نے اپنے خیالات اور فکر سے متاثر کیا ہے اور وہ وقت بہت قریب ہے جب یہی علم دوست تعصبات سے ماوراء گروہ انتہا پسندی کے اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوگا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو قلم کے ساتھ اکتیس (31) برس مکمل ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اپنی تحریروں کے ذریعے انسان دوستی، بے تعصبی اور غیر جانبداری کی تحریک کو فکری قیادت مہیا کرتے رہیں گے۔

# ایک تاریخ داں، ایک انسان

رفاقت علی انصاری

میں ایک کاروباری آدمی ہوں اور میرے لئے کتابیں پڑھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل کام ہے۔ گوکہ میں زمانہ ءطالب علمی سے ہی ادب خصوصاً شاعری پڑھنے کا شوقین رہا ہوں۔ میں نے تقریباً سارے مشہور شاعروں کی شاعری پڑھ رکھی ہے۔ نثر کا آغاز میں نے اُسی زمانے میں کرنل محمد خاں کی کتاب ''بجنگ آمد'' سے کیا۔ اس کے بعد میں مزید تعلیم اور پھر ملازمت میں مصروف ہوگیا تو کتابوں سے کافی دور رہا۔ جب میں لاہور میں واپس آیا اور اپنا کاروبار شروع کیا تو میرے پاس کچھ فارغ وقت ملنے لگا۔ میرا کتابوں کی طرف آنے کا موجب لوڈشیڈنگ تھا۔ مجھے شکر گزار ہونا چاہئے موجودہ حکومت کا۔ اُنہوں نے کوئی اچھا کام تو میرے لئے کیا۔

مجھے یاد ہے جب ایک دن میں بہاولپور میں سہ پہر کے وقت اپنے ہوٹل میں تھا تو بجلی چلی گئی اور مجھے بادل ناخواستہ کمرے سے باہر نکلنا پڑا۔ میں قریب ہی پارک میں چلا گیا، جہاں پر کتابوں کا ایک سٹال لگا ہوا تھا۔ مجھے اتفاقاً ڈاکٹر مبارک علی کی کچھ کتابیں مل گئیں۔ اس سے پہلے میں اُن کی دو ایک کتابیں ''تاریخ اور آگہی'' وغیرہ، زمانہ ءطالب علمی میں پڑھ چکا تھا۔

اُن میں میری دلچسپی کی وجہ اُن کا متنازعہ ہونا تھا۔ اس وجہ سے میرے دل میں اُن کی کتابیں پڑھنے کی جستجو پیدا ہوئی۔ اب چونکہ میں Mature ہو چکا تھا تو ان کی کتابیں میرے دل پر اثر کرنے لگیں۔ پھر لاہور میں مَیں نے ماوراء بکس سے اُن کی مزید کتابیں خریدیں۔ جب اُن کے پاس موجود ڈاکٹر صاحب کی سب کتابیں میں نے پڑھ لیں تو اُن کے سیلز مین سے پوچھا کہ کوئی اور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اب مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ''فکشن ہاؤس'' پر ہر ہفتے آتے ہیں اور مزید کتابیں وہاں سے ملیں گی۔ پس میں



ایک دن فکشن ہاؤس پہنچ گیا اور جناب ظہور صاحب سے ملاقات ہوئی اور اپنے آنے کا مدعا بیان کیا اور کچھ کتابیں وہاں سے خریدیں۔

لہٰذا اگلے ہی ہفتے میری پہلی ملاقات ڈاکٹر مبارک علی صاحب سے ہوگئی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک اور اس کے کافی دیر بعد تک، میں صرف ڈاکٹر صاحب ہی کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو میں اپنے کاروبار میں بہت مصروف رہتا تھا لہٰذا میرے لئے کتابیں پڑھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل تھا۔ پس میں صرف جب سفر پر جاتا تھا تو بس یا ہوٹل میں اور ریل گاڑی یا بس کے انتظار میں پڑھتا تھا ایک تو اس سے سفر کا پتا نہیں چلتا تھا اور کچھ علم بھی حاصل ہوتا تھا۔

اب کچھ ڈاکٹر صاحب کے متعلق بیان کروں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ایک بلند پایہ تاریخ دان اور محقق ہیں اور آپ کی کتابوں نے لاکھوں لوگوں کی سوچوں کو بدلا ہے۔ میں نے اُن کی زندگی اور کتابوں میں ایک نہ ختم ہونے والی مقصدیت پائی ہے جب بھی وہ کتاب لکھتے ہیں تو یہ مقصدیت ہر جگہ کارفرما ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی دونوں حیات زندگی کی کتابوں کو قلم بند کرتے وقت یہ کارفرما تھی۔ میں نے اُن سے اس سے متعلق کہا کہ آپ نے اپنی خودنوشت ''میری دنیا'' جو بعد میں آئی جو آپ نے اپنی پیاری بیٹی کے کہنے پر لکھی۔ اُس کو بھی اپنے ہی اصول پر لکھا، اور بہت سے دوستوں کا شکوہ رہا کہ آپ نے اُن کا ذکر کھل کر نہیں کیا۔ میں نے اس کتاب سے زیادہ مواد زیر سطر کیا۔ جو میں عموماً آپ کی دوسری کتابوں سے کیا کرتا تھا۔

یہ آپ کی ہی کتابوں کی بدولت مجھے زندگی کے بہت سے مسائل کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے میری سوچ بھی ویسی ہی تھی، جیسے اور طالب علموں کی پاکستان میں ہوتی ہے۔

اب کچھ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے متعلق۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میں نے بہت کم کتابیں پڑھی ہیں، اور جو پڑھی ہیں اُن سے مجھے اتنا علم حاصل نہیں ہوا، جتنا میں نے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کو پڑھ کے حاصل کیا۔

ایک تو انہوں نے غیر دلچسپ Subject تاریخ (History) کو دلچسپ بنایا اور دوسرا اس میں مختلف قسم کے عنوانات کو شامل کر کے اس کے دائرے کو وسعت دی۔ اب قاری کو اس مضمون میں گھسے پٹے عنوان جنگیں، بادشاہوں کے نام اور اُن کی تاریخیں جو کہ یاد کرنا بہت مشکل تھا۔ اس سے باہر نکال کر اس کے کینوس کو وسیع کر دیا۔ اب آپ اس میں مختلف عنوان جیسا کہ آنسوؤں کی تاریخ، غلاموں کی تاریخ ٹھگوں، کسانوں، عورتوں، علماء، دانشور، مزدور اور اب تو کائنات کی تاریخ بھی پڑھ سکتے ہیں۔

نیچے والی سطروں میں اُن دو چیزوں کے متعلق لکھوں گا، جنہوں نے مجھے متاثر کیا، جس کی وجہ سے میں ڈاکٹر صاحب کا Fane بنا۔

یہ کوئی 90ء کے عشرے کی بات ہے۔ جب میں M.Sc مکمل کرنے کے بعد مختلف اخبارات کو روزانہ پڑھتا تھا۔ جس میں Daily Dawn بھی تھا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کا کالم ہر اتوار کو آتا ہے۔ ان میں سے ایک کالم مغل دور میں عورتوں کے لقب اور ناموں کے متعلق تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ مغل بادشاہوں نے کس طرح گھریلو اور بازاری عورتوں کے نام رکھ رکھے تھے۔ انہوں نے گھریلو عورتوں کے نام مثلاً نور محل، نور جہاں، زیب النساء، مہر النساء، جہاں آراء وغیرہ رکھے تھے اور بازاری عورتوں کے شعلہ بدن، گل نار وغیرہ تھے۔ یعنی انہوں نے گھریلو عورتوں کے نام پاکیزہ رکھے اور بازاری عورتوں کے بڑھکیلے، بازاری تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب سے میں نے پڑھا، اُس کتاب کا نام مجھے یاد نہیں، کیونکہ یہ کتاب میں نے کافی دیر پہلے پڑھی تھی۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ ابتدائی زمانے میں جب انسان جنگل میں رہتا تھا اور اُس کا گزر بسر صرف شکار پر ہوتا تھا۔ اُس وقت وہ ہر جانور کو اپنا دشمن خیال کرتا تھا۔ لیکن غالباً کسی اتفاق سے انسان کی پہلی انسیت ''کتے'' سے ہوگئی۔ جس نے اپنی موجودگی میں غار اور آگ کے علاوہ، ایک زیادہ محفوظ رات گزارنے کا موقع فراہم کیا۔ اس سے آگے چل کر انسان نے اور بہت سے دوسرے جانوروں کو سُدھایا اور اُنہیں اپنے استعمال میں لے آیا۔ جس سے انسان نے تہذیبی طور پر بہت ترقی کی۔ جن جانوروں کو انسان نے اُس زمانے میں پالتو بنا کر اپنے استعمال میں لایا، وہ تھے بھینس، گائے، بیل، گدھا، بھیڑ، بکری، اونٹ اور گھوڑا۔ لیکن انسان نے اپنے اس محسنوں کی عزت نہ کی اور انہیں زمانے میں ایک گالی بنا دیا۔ جیسا کہ بھینس کے آگے بین بجانا، گائے، بیل اور گدھے کو احمق قرار دیا۔ بھیڑ اور بکری بزدلی کی علامت ٹھہری۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیڑھی اور ''کتے'' کو تو ایشیاء میں سب سے بڑی گالی بنا دیا گیا۔

لیکن اس کے برخلاف جن جانوروں نے انسان کی اطاعت میں آنے سے انکار کر دیا انہیں ہم نے عظیم بنا دیا۔ جیسا کہ شیر، چیتا اور سانپ۔ ہم بڑے فخر سے اپنے ناموں کے ساتھ اُن کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم یہ سوچتے نہیں کہ انہوں نے انسانیت کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا اور اُلٹا نقصان پہنچایا، اور ابھی تک پہنچا رہے ہیں۔

اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جو ہم نے جناب ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے سیکھیں۔



آپ کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو سچی بات نہایت آسان زبان میں پہنچائی جائے اور اس میں کسی قسم کی غیر ضروری لفاظی، منظر کشی، مبالغہ آمیزی اور بے جا تکرار کو ختم کیا جائے۔ مجھے اُن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر ایسی عادت بن گئی کہ میرے لئے کوئی اور دوسرے لکھاریوں کی کتابیں پڑھنا مشکل ہو گیا۔ اس بات کی شکایت میں نے ڈاکٹر صاحب سے کی اور وہ مسکرائے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ان دنوں مجھے قاضی جاوید صاحب کی کتاب ''لوگوں کو سوچنے دو'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے قاضی صاحب سے شکایت کی کہ ایک تو اس میں فلسفہ کی Terms کا اُردو میں ہونا اور دوسرا آپ نے غیر ضروری مشکل الفاظ کے انتخاب سے اس کو بوجھل بنا دیا ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ کتاب آپ جیسے لوگوں کے لئے نہیں لکھی گئی۔ جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو مجھے پتا چلا کہ یہ کتاب ہمارے جیسے لوگوں کے لئے ہی لکھی گئی تھی۔ جیسے کہ اس کا عنوان ہے ''لوگوں کو سوچنے دو'' اور اس میں خاص بات نہیں تھی۔ جو خاص لوگ (Intellectuals) اسے پڑھتے، کیونکہ اُن کو یہ سب معلوم تھا۔ میں نے اپنے مطالعہ سے یہ بھی نوٹ کیا کہ بہت سے مشہور لکھاری یہاں کے ہوں یا باہر کے آسان زبان استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب وقت کے بہت پابند ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں اکثر اُن کی ڈانٹ سننی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ سچ بولتے ہیں اور سچ ہی لکھتے ہیں۔ چاہے اس کی انہیں کتنی ہی قیمت کیوں نا چکانی پڑے۔ اس سلسلے میں انہیں بہت ساری نوکریاں چھوڑنی پڑیں۔

برداشت اور قوتِ ارادی اُن میں بہت زیادہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم سب نیرنگ گیلری میں بیٹھے گرمی میں بجلی والوں کو کوس رہے ہوتے ہیں وہ بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہمارے پوچھنے پر وہ صرف اتنا کہتے ہیں ''بس اب عادت ہو گئی ہے۔''

ایک حساس انسان ہیں اور جب بھی میں انہیں نیرنگ گیلری سے واپس گھر چھوڑنے جاتا ہوں تو وہ اکثر موجودہ ملکی حالات کے متعلق متفکر ہوتے ہیں۔

غرض کہ جیسی اُن کی تحریریں ہیں۔ ویسا ہی اُن کا پیکر ہے۔ ایک چیز جو اُن میں بہت زیادہ ہے۔ وہ کسی کا احسان نہیں لیتے۔ یعنی کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے۔

ہم چند دوست (قاضی جاوید، اسلم گورداسپوری، سلمان عابد، زمان خان، لیاقت علی، شہزاد احمد، شہزاد ایڈووکیٹ، وغیرہ) باقاعدگی سے نیرنگ گیلری میں ڈاکٹر مبارک صاحب کی معیت میں بیٹھتے ہیں یہاں ہمارا اکثر عنوانِ گفتگو سیاست ہوتا ہے۔ لیکن جب کبھی کوئی علمی و ادبی بات ہوتی ہے تو ہم خوب

ڈاکٹر صاحب کی ذہانت وتحقیق سے مستفید ہوتے ہیں۔ مجھے جو چیز اُن کی بہت زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اُن کی غیر معمولی یادداشت۔ اُنہیں تمام واقعات، اُن کی تاریخیں، نام، اور پوری تفصیل زبانی یاد ہوتی ہیں، اور پوری تفصیل سے ہمیں بیان فرماتے ہیں۔

اس کے علاوہ جب کبھی ہم اُن سے کوئی سوال کے متعلق پوچھیں تو وہ ہماری پوری رہنمائی فرماتے ہیں۔ وہ نہایت ہی ملنسار اور شفیق ہیں، ہفتے میں دو یا تین دن بعد اُن کا فون ہماری خیریت کے متعلق آتا ہے۔ غرض کہ اُن میں وہ تمام خوبیاں اور خصوصیات ہیں جو ایک غیر معمولی انسان میں ہوسکتی ہیں۔

آخر میں یہاں برٹرنڈ رسل کا یہ مقولہ لکھوں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''شاعر، ادیب اور فلسفی ایسے لوگ ہیں، جن کو اُن کی زندگی میں کوئی نہیں پوچھتا، اُن کی وفات کے بعد لوگ اُن کی پوجا کرتے ہیں۔''

میری تمام لوگوں سے اپیل ہے کہ یہ بڑے قیمتی لوگ ہیں۔ براہ کرم قائداعظم اور اقبال کے علاوہ دوسرے دانشوروں اور صاحبِ کمال لوگوں کی بھی عزت کریں۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگی سچائی کو پھیلانے میں صرف کردی ہے اور ابھی مصروف ہیں۔

دُعا ہے کہ خدا انہیں اسی طرح مصروفِ کار رکھے۔ آمین!



# ڈاکٹر مبارک علی

زمان خان

انیس نے کہا تھا۔

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ڈاکٹر مبارک علی جیسے حساس، نازک مزاج، مہذب مگر انتھک اور چٹان سے زیادہ مضبوط ارادے والے شخص کے بارے میں کچھ لکھنا اور وہ بھی بہت ہی قلیل وقت میں بہت ہی پُر خطر اور جان جوکھوں کا کام ہے، عام طور پر اگر آپ کسی کی تعریف کریں تو آپ صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ خوش ہوگا مگر یہ کیمیائی، کارگر اور آزمودہ، آسان نسخہ ڈاکٹر مبارک علی پر کارآمد نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ خود بلند پایہ کے پُرعزم مورخ ہیں اور انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کب کوئی چلاؤ کام کر رہا ہے اور تعریف کر کے نہ صرف اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرتا ہے بلکہ جس کی تعریف کی جائے اس کا مرتبہ بھی گھٹاتا ہے۔ سو ڈاکٹر مبارک کے بارے میں قلم اٹھانا دراصل پل صراط پر گذرنے کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے کب اور کس جگہ تعارف ہوا اب صحیح طور پر یاد نہیں (مگر مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے ان کے نام اور کام سے متعارف تھا) ڈاکٹر صاحب غالباً لاہور میں گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے اور میں کوئی لیکچر سننے وہاں گیا تھا وہاں ہی ڈاکٹر صاحب نے میرا تعارف مورخ مرحوم کے عزیز سے کرایا تھا جو کے کے عزیز اور ان کی بیگم زرینہ سے عمر بھر کی دوستی میں بدل گیا سچ پوچھیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے اصولوں کی بنیاد پر گوئٹے انسٹیٹیوٹ سے استعفیٰ دے دیا (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا پہلا اور آخری استعفیٰ نہیں تھا بلکہ جب بھی انہیں یہ موقع ملا انہوں نے کلمہ حق کہنے

سے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی خواہ اس کے لئے انہیں کتنی بھی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے اور گھر کے حالات خواہ کچھ ہوں۔ یہ سلسلہ غالباً سندھ یونیورسٹی سے شروع ہوا تھا)۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو ڈاکٹر صاحب کی سوانح عمری کے دونوں والیم (دردر ٹھوکر کھائے اور میری دنیا) پڑھ لیں اور خود ہی نتیجہ نکال لیں، اور دیکھیں کہ ڈاکٹر صاحب نے کن نامسائد حالات کا مقابلہ کیا اور یہ مقام حاصل کیا۔

بہر حال مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ وہ میری دعوت پر لائلپور (جسے آجکل فیصل آباد کہا جاتا ہے) تشریف لائے، لیکچر دیا۔ جماعت اسلامی کے ایک ممبر نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب سے ایسا سوال کیا جائے جس کا جواب شاید ڈاکٹر صاحب نہ دے سکیں یا سر عام دینا پسند نہ کریں مگر ڈاکٹر صاحب سولی پر بھی کلمہ حق کہنے والے ہیں (ایک ایسی جماعت جس نے تخلیق پاکستان کی مخالفت کی ہو اور اب اپنے آپ کو پاکستان کا حقیقی اور سچا وارث سمجھتی ہے)۔ ڈاکٹر صاحب نے بلا کسی لگی لپٹی فوراً جواب دیا کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں (مسلم لیگ) کا درست فیصلہ نہ تھا، اور سب کو حیران کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے دورہ فیصل آباد سے مجھے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ ان کا واحد ذریعہ آمدن لکھنا پڑھنا اور لیکچر دینا ہے۔

جب میں پچھلی صدی کے آخر میں نوے کی دہائی میں لاہور آ گیا تو ان دنوں ڈاکٹر صاحب فکشن ہاؤس سے وابستہ تھے اور نہ صرف ان کے لئے لکھتے تھے بلکہ اپنا سہ ماہی رسالہ ''تاریخ'' بھی نکالتے تھے۔ (بدقسمتی سے پچاس شمارے نکالنے کے بعد وہ اب اس کی اشاعت منقطع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں)۔

مجھے گو ہفتہ اور اتوار کو چھٹی ہوتی تھی مگر میں پھر بھی جب لاہور میں ہوتا اس محفل میں ضرور شریک ہوتا۔ یقین کریں کہ وہاں بہت دلچسپ لوگوں سے باتیں کرنے اور ان کے خیالات سننے کا موقع ملتا۔ کیونکہ وہاں دوسرے شہروں سے بھی لوگ کتب خریدنے آتے تھے اس لئے دوسرے شہروں سے آنے والے لوگوں سے تبادلہ خیال کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ پھر ظہور میو اور رانا رحمان کے درمیان مالی اختلافات سامنے آ گئے اور رانا رحمان نے اپنی الگ دوکان ''بک ہوم'' کے نام سے کھول لی۔ اب یہ ہوتا کہ چند گھنٹے فکشن ہاؤس میں گذارے جاتے جس کے دوران چائے، قہوہ کے علاوہ ''چنے کی دال'' بھی کھانے کو ملتی اس کے بعد قافلہ ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں ''بک ہوم'' جاتا اور وہاں پھر چائے کا دور چلتا۔ پھر ڈاکٹر صاحب جیسے سادہ آدمی پر ان کے اپنے ہی پروردہ سعود الحسن نے حملہ کر دیا۔ پھر ظہور اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان ایسے مسائل پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے فکشن ہاؤس اور بک ہوم کی محفل اجڑ گئی۔ یہاں یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ اس کڑے وقت میں جہاں اور لوگوں (نجم سیٹھی) نے



ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیا وہاں امجد منہاس نے بھی بھرپور کردار ادا کیا اور اس طرح ڈاکٹر صاحب نے امجد منہاس کے ''کوٹھے'' پر جانا شروع کر دیا۔ ''سانجھ'' نے ڈاکٹر صاحب کی کئی کتابیں شائع کیں مگر ڈاکٹر جیسے سادہ آدمی (کھرے آدمی) کے اپنے پبلشر کے ساتھ مالی مسائل پیدا ہو جاتے (ہر پبلشر یہ چاہتا ہے کہ وہ نہ صرف صاحب کتاب کو کچھ معاوضہ نہ دے بلکہ اس سے کیش لے) کیونکہ وہ حسب وعدہ ان کا معاوضہ ادا نہیں کرتے۔ ہاں ایک ترقی پسند پارٹی کے لوگوں نے بھی ابھی تک ان کے پیسے دینے ہیں۔

''سانجھ'' کے مالک کے ساتھ مسائل پیدا ہوئے تو اب مسئلہ پیدا ہوا کہ ہفتہ وار منڈلی کہاں جمے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو قائل کیا کہ اب ایسی جگہ پر بیٹھا جائے جہاں کسی پبلشر کا کوئی عمل دخل نہ ہو تو طے ہوا کہ ہر ہفتہ نیر علی دادا کی نیرنگ گیلری پر محفل جمائی جائے اور ہر آدمی اپنا اپنا بل خود ادا کرے۔ یہاں نیر علی دادا کا ذکر اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ دادا نے ہمارے لئے خصوصی سلوک (رعایتی نرخوں) کا حکم فرمایا۔

یہاں شامل ہونے والے ڈاکٹر صاحب کے پرانے فکشن ہاؤس کے ساتھیوں کے علاوہ جماعت اسلامی کے ہمدرد بھی شامل ہوتے ہیں۔ (انقلابی شاعری کو ہضم کرنا بہت آسان کام ہے مگر نثر گلے میں اٹک جاتی ہے) اس محفل میں دلچسپ اضافہ ڈاکٹر صاحب کی ''منکر نکیر'' جوڑی کا بھی ہو گیا (بھلا ہو ٹی وی ٹاک شوز کا ہر شخص اپنے آپ کو اینکر پرسن سمجھتا ہے) جو ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں ہی یہ دہراتے ہیں نہیں جھجکتے کہ ڈاکٹر صاحب نے ''یہ کہا ہے''۔

یہاں نہ صرف مختلف مسائل پر دلچسپ اور کبھی کبھی گرما گرم بحث بھی ہوتی ہے بلکہ کئی ایک کتابوں پر خصوصی نشستیں بھی ہو چکی ہیں۔ دوسرے شہروں سے لوگ بھی ملنے آ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب میں یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے خیالات دوسروں پر نہیں ٹھونستے شروع سے ہی ان کا یہ طریق ہے کہ اگر کوئی سوال کرے تو کسی ساتھی کو کہتے ہیں کہ بھئی آپ اس کا جواب دیں گو ان کے ''منکر نکیر'' ٹی وی اینکر کی طرح ڈاکٹر صاحب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہی ہر سوال کا جواب دیں۔ گو ڈاکٹر صاحب پیری مریدی پر یقین نہیں رکھتے۔ مگر آج کے دور میں یہ لوگ بھی یقیناً غنیمت ہیں اور ان میں جاننے کی خواہش اور تجسس پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بطور مورخ بات نہیں کروں گا کیونکہ میری نظر میں یہ کام دوسرے ساتھی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ صرف اتنا کہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کو عام فہم زبان

میں لکھ کر اسے عام آدمی میں متعارف کروایا ہے سو ڈاکٹر صاحب کو ''عوامی مورخ'' کہا جاسکتا ہے۔ان کی کتابیں بلوچستان اور سندھ میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف عام آدمی، خواتین، بچوں اور بوڑھوں کے لئے لکھا ہے بلکہ پاکستان کے بارے میں کوئی بھی تحقیق ان کے کام کا حوالہ دیئے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نڈر اور سچے صحافی رابرٹ فسک نے جب پاکستان کا ذکر کیا تو ڈاکٹر صاحب کی کتاب Identity of Pakistan کا حوالہ دیا۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ جب سے ڈاکٹر صاحب سے میل ملاپ شروع ہوا ہے انہوں نے مجھے اپنی ہر کتاب سے نوازا۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب انہیں ہندوستان میں دلائی لامہ سے امن ایوارڈ ملا تو میں نے ان کا انٹرویو کیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے سے جونیئر لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ جب میرا مضمون پاکستان کی تاریخ پر ''جہد حق'' میں چھپا تو انہوں نے سب سے پہلے فون کیا۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ بہت ہی اچھے انداز میں ہر شخص سے تخلیقی کام کروانے کے ماہر ہیں، انہی کی وجہ سے میں آہستہ آہستہ ''تاریخ'' کا ریگولر لکھاری بن گیا۔ پھر یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف مجھ سے واکاڑہ کے کسانوں کی تحریک کے بارے میں مضمون لکھوایا بلکہ مجھے کراچی میں ہونے والی تاریخ کانفرنس میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ جسے میں بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔

چند ماہ پہلے جب مشہور مورخ ایرک ہابس بام کا انتقال ہوا تو ڈاکٹر صاحب ان کے بارے میں چھپے ہوئے دو مضامین لے آئے اور مجھے کہا کہ تم نے انہیں تاریخ کے لئے ترجمہ کرنا ہے۔ مجھے کچھ ہچکچاہٹ تھی مگر انہوں نے اس پیار سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ بلکہ اشتیاق اس قدر بڑھا کہ میں Economic and Political Weekly(EPW) میں رومیلا تھاپر کے ہوبس بام کے بارے میں لکھے گئے مضمون کا بھی ترجمہ کر دیا، اور اس کے ساتھ ہی ہابس بام کی کتاب کا بھی مطالبہ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب انکار نہ کر سکے مگر انہوں نے یہ ضرور کہا کہ وہ کسی کو کتاب مستعار نہیں دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھے رومیلا تھاپر کی کتاب سومناتھ فوٹو کاپی کروا کر دی تھی۔ اس کا ترجمہ کروا کر بھی چھپوایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب یقیناً ایک عوامی مورخ ہیں اور انہوں نے عام زبان میں تاریخ پر درجنوں کتابیں لکھی ہیں اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک عوامی مورخ ہیں۔

یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی بصارت بہت کم ہوگئی ہے اور انہیں لکھنے پڑھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے روزانہ کے معمولات نہیں



چھوڑے ہیں، پہلے کی طرح لکھنے پڑھنے کا کام جاری ہے مگر اس سارے معاملات میں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی نین تارا کا بہت اہم کردار ہے جس کو ڈاکٹر صاحب اپنی سیکریٹری کہتے ہیں کیونکہ وہی ان کا ٹیلیفون سنتی ہے اور ای میل دیکھتی ہے۔ ان کی دوسری دو بیٹیاں عطیہ اور شہلا امریکہ میں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نہ صرف دوسرے دوستوں کی طرح اپنا بل ادا کرتے ہیں بلکہ دوستوں کو اکثر اصرار کر کے گھر پر کھانے کے لئے بھی بلاتے ہیں اور اپنی زوجہ محترمہ ذکیہ کے ہاتھ کا بنا ہوا حلیم اور پائے بھی بڑے شوق سے کھلاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بہت دکھ کے ساتھ لکھا ہے کہ انہیں ''مکڑ اور مہاجر'' کہا جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اس کی وجوہات کا کس کو علم ہوسکتا ہے صرف یہ عرض ہے کہ (مسلم لیگ) جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے اور اس میں بے گناہ لوگوں کو بھی خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

آج پاکستان کی سڑکوں پر بڑی بڑی گاڑیاں نظر آتی ہیں، دنیا کے بڑے بڑے بین الاقوامی سٹور بھی نظر آتے ہیں ہر شخص کے پاس موبائل ہے اور بچوں میں لیپ ٹاپ بھی بانٹے جارہے ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی معاشرہ سماجی لحاظ سے ذہنی اور فکری پسماندگی کی طرف گامزن ہے اور ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ریاست ڈاکٹر صاحب کو ایک ایسا ادارہ بنانے میں مدد کرتی جہاں وہ نوجوانوں کی تاریخ نویسی میں ٹریننگ کرتے اور پاکستانی پیپلز ہسٹری لکھتے مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا مگر ان حالات سے ڈاکٹر صاحب بددل نہیں ہوئے اور انہوں نے انفرادی طور پر وہ سب کچھ کر دکھایا ہے جو کہ دوسرے ممالک میں ادارے کرتے ہیں۔ مبارک علی پاکستان کا اثاثہ ہیں۔ مگر افسوس ریاست نے انہیں وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔

مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے اور ان کی صحت اور درازی عمر کے لئے دعا گو ہوں۔

## چند یادیں

**کھٹاؤمل**

یہ 1984ء کی بات ہے جب ولی رام صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر مبارک علی جو سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اُس نے سندھ کی تاریخ پہ کتابچے لکھے ہیں، وہ پڑھنا ضروری ہیں۔ میں ایل۔ایم۔سی کی ابن سینا ہاسٹل سے پیدل ایک دن آرٹس فیکلٹی پہنچا تو مبارک علی کے ساتھ فریدالدین، آے۔آر۔ناگوری، حمایت علی شاعر اور عیسیٰ داؤد پوتا کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی۔ اس پہ حیرت ہوئی کہ مبارک علی خود لکھتے، چھاپتے اور بیچتے ہیں۔ اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر ویک اینڈ پہ ریڈیو پاکستان یا ہوٹل فاران میں ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دفعہ مبارک علی کے ساتھ سانگھڑ گئے وہاں اللہ ورایو اور اسحاق منگریو نے لیکچر کے لئے بلایا تھا۔ یاد رہے کہ ہم جہاں بھی گئے تو بس کا کرایہ ڈاکٹر صاحب یا پروفیسر فریدالدین دیتے تھے۔ دیال داس کلب میں زبیدہ احمد فردوس، شکیل پٹھان، خالد وہاب اور حسن منظر سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہماری ملاقاتیں اسٹڈی سرکل کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ایک دفعہ ہم دادو گئے جہاں عادل سفیرائی نے طالب المولیٰ ہائی اسکول میں لیکچر کرایا تھا اور وہاں اعجاز قریشی کے گھر ٹھہرے تھے اور اُستاد بخاری، حاکم شاہد بخاری، شوکت سندھی اور صلاح پنہور سے ملاقات ہوئی۔

مبارک علی کے لیکچرز اور ہماری ملاقاتوں کی وجہ سے دوستوں میں تاریخ پڑھنے کا رجحان پیدا ہوا جو پورے ملک میں پھیل گیا، اور اب مبارک علی کی ساٹھ سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں اور وہ کئی اخباروں میں کالم لکھتے ہیں خاص طور پر ''ڈان'' اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ 1990ء میں باقاعدہ ختم ہوا جب وہ لاہور چلے گئے اور ہم واپس تھرپارکر آ گئے۔ لیکن اب تک رابطہ برقرار ہے اور اسٹڈی سرکل اب ٹیلیفون پہ ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے دنیا کے بہت پڑھے لوگوں کو اور مجھ جیسے عام آدمی کو کتابوں اور سہ ماہی ''تاریخ'' کے ذریعہ متعارف کروایا جس میں خاص



طور پر ہربنس مکھیا، رومیلا تھاپر، عرفان حبیب، بپن چندرا، کو بھی قابل ذکر ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں کے سب اساتذہ اگر اپنے کرایے پر اور اپنی چائے پلا کر لیکچر دیں یا اسٹڈی سرکل چلائیں تو ہم دوسروں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ مبارک علی نے ایک بات ثابت کی ہے کہ زیرو بجٹ پہ بھی کتابیں اور رسالے چھپ سکتے ہیں اور فرد انجمن کا کام کر سکتا ہے۔

ایک دفعہ سبط حسن کی برسی پر کراچی جانا ہوا۔ مبارک علی کو جب 1989ء میں فیض ایوارڈ ملا تو ہم بھی لاہور گئے تھے۔ ایک ہفتہ نصیراے شیخ کے گھر ٹھہرے تھے اور وہاں موجود فیض فیملی، رفیق جعفر، انور کمال، احمد بشیر، صفدر میر، کشور ناہید اور نجم حسین سیّد سے ملاقاتیں ہوئیں اور اُسے بنیاد بنا کر ہم ابھی زندہ ہیں۔ آخر میں یہ کہوں گا کہ اگر مبارک علی ڈپلومیٹک مزاج کے ہوتے تو زندگی میں تکلیفیں مشکلات کم دیکھتے اور وہ لوگوں کے تعصب اور تنگ نظری کا کم شکار ہوتے۔ لیکن میں اُن کے گذارے ہوئے وقت پہ فخر کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

# تاریخ اور مؤرخ

ڈاکٹر توصیف احمد خان

تاریخ دنیا کا قدیم مضمون ہے۔ تاریخ سے ماضی کے واقعات کا علم ہوتا ہے جس کی بناء پر حال میں ہونے والے اقدامات کو بہتر بنانے کا شعور آتا ہے۔ یوں مستقبل سنوارنے کا موقع ملتا ہے۔ پاکستان میں پڑھائی جانے والی تاریخ عرب حملہ آوروں، مسلمان بادشاہوں اور مسلم لیگ کے اکابرین کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے یوں ماضی کے کارناموں پر فخر کرتے ہوئے دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنے کے عزم کے ساتھ ناکامیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس صورتحال کی بناء پر مشرق بنگال کے عوام نے مرکز کے خلاف جدوجہد کی اور بنگلہ دیش بن گیا اور اب ہر طرف پاکستان کی تقسیم کے چرچے ہو رہے ہیں۔ عرب حملہ آوروں اور مسلمان حکمرانوں کی فتح کے گیت گانے والے مورخین ایک سازشی نظریہ کو ملک کی تباہی کا ذمہ دار قرار دے کر اپنا فریضہ پورا کرتے ہیں۔ یوں ایک مخصوص ذہن Mindset نے ملک کی اکثریت کو اپنے بس میں کر رکھا ہے۔ پاکستان ایک دہشت گرد ملک کے طور پر دنیا بھر میں جانا جاتا ہے ملک میں غربت و افلاس کی شرح بڑھ رہی ہے ہر شخص مستقبل سے خوف زدہ ہے، اردو زبان زیادہ قدیم زبان نہیں ہے، یہ ۱۸ ویں صدی میں ارتقاء پذیر ہوئی اس کی سرپرستی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکابرین نے کی پھر ۲۰ ویں صدی میں اردو اشتیاق حسین قریشی، کے کے عزیز، نسیم حجازی اور ڈاکٹر صفدر محمود نے تاریخ لکھنے کا کام سنبھالا اور ریاست نے ان رجعت پسند دانشوروں کی سرپرستی کی، ان دانشوروں نے ایک نظریاتی ملک کا راگ الاپا، فوج جو امریکی سرپرستی میں ایک علیحدہ ریاست بن رہی تھی نے اپنے مقاصد کے حامل ان دانشوروں کی سرپرستی کی یوں تاریخ کو حقیقی انداز میں لکھنے کا تصور عام نہ ہو سکا۔ سید سبط حسن باری، علیگ علی، عباس جلال پوری اور ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کو عقیدے سے ہٹ کر سائنسی طرز فکر کو رائج کرنے کی روایت کو اپنایا۔ ڈاکٹر مبارک علی کو ایک امتیاز



حاصل ہے کہ انہوں نے جدلیاتی مادیت کے اصولوں کے تحت تاریخ لکھنے کا آغاز کیا اور ہمیشہ معتوب رہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اس ملک میں عوامی تاریخ لکھنے کی روایت ڈالی، انہوں نے انسانی سماج کے ارتقا کو بیان کرنے کے ساتھ تاریخ کی آگہی کو اپنا مشن قرار دیا۔ ڈاکٹر مبارک یوں تو راجستھان کی ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے مگر ان کا بچپن اور جوانی حیدر آباد سندھ میں گزرا۔ ڈاکٹر مبارک کا پس منظر اردو بولنے والا متوسط طبقے سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حیدر آباد کا اردو بولنے والا طبقہ رجعت پسند خیالات سے لیس رہا ہے اور ان لوگوں نے طویل عرصے تک سندھ کی مقامی تہذیب اور تاریخ کو قبول نہیں کیا اور تاریخ کو مسخ کیا مگر ڈاکٹر مبارک علی اردو بولنے والے پہلے دانشور ہیں جنھوں نے سندھ پر حملہ کرنے والے جنگجوؤں کے عزائم کا تجزیہ کیا انہوں نے عرب حملہ آور محمد بن قاسم کی مہم کے مقاصد اس کے دور میں لوٹ مار اس وقت کے حکمران حجاج بن یوسف کے پس پردہ کردار عربوں کی فوج کے جدید ہتھیار، حکمت عملی اور حملہ آوروں کے حقیقی مقاصد کے بارے میں اردو میں کتاب تحریر کر کے پاکستان کی نظریاتی ریاست کے شیشہ کو چکنا چور کر دیا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے مغلوں کی تاریخ پر خصوصی توجہ دی انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں اکبر کے طرز حکومت کا جائزہ لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اکبر کے بارے میں نصاب کی کتابوں میں حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ اکبر کے بارے میں یہ بات غلط طور پر تحریر کی، اکبر نے ایک سیکولر طرز فکر کو اپنایا، ہندوستان میں آباد تمام مذاہب کیلئے صلح کل کا نظریہ اپنایا یوں مغل سلطنت کو دوام حاصل ہوا، اکبر نے اگر مسلمانوں کے کسی مخصوص فرقے کی شریعت کو اپنا لیا ہوتا تو مغلیہ سلطنت میں کبھی توسیع نہیں ہوتی اور نہ سلطنت میں استحکام ہوتا اس طرح ڈاکٹر مبارک علی نے اورنگزیب عالمگیر کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا انتہائی سنجیدگی سے تجزیہ کیا انہوں نے اورنگزیب کی جنونیت جس کا شکار اس کے بھائی اور بیٹی ہوئے کے بارے میں حقائق ظاہر کر کے ان لوگوں کیلئے مشکل کھڑی کر دی جو اورنگزیب کے دور سے نظریاتی ریاست کا سلسلہ جوڑتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز اورنگزیب کی پالیسیوں سے ہوا، یوں جو لوگ اورنگزیب کی پالیسیوں کو ہیرو بنا کر اس ملک کو ہزاروں سال پیچھے دھکیلنا چاہتے تھے، ان کے پاس عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے حقائق مختصر ہوئے۔

ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ ۱۷ اور ۱۸ ویں صدی میں ہندوستانی معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان تبدیلیوں کی بناء پر ہندوستانی سماج میں ترقی کے امکانات روشن تھے مگر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر قبضہ کر کے اس کا بدترین استحصال کیا یوں برطانیہ میں خوشحالی آگئی اور ہندوستان غریب

ہوگیا۔ برطانیہ حکومت کی استحصالی پالیسیوں نے ہندوستان کو فرقوں ذات پات میں تقسیم کردیا، جس کی بناء پر ۲۰ ویں صدی میں ہندوستان تقسیم ہوا جس کا خمیازہ بھارت اور پاکستان کے عوام آج بھگت رہے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک نے ۲۰ ویں صدی میں چلنے والی تحریکوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا انہوں نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جمعہ کی نماز کے مختصر خطبے سے پہلے تقریر کا طریقہ رائج کیا یوں یہ خطبے کا حصہ بن گیا۔ آج بھی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مساجد میں علماء اس تقریر کے ذریعے رجعت پسندانہ مواد کروڑوں لوگوں کے دماغ میں داخل کرتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر مبارک نے خلافت تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی نے سیاست میں مذہب کو سب سے پہلے استعمال کرنا شروع کیا، گاندھی کی مذہب کو سیاست میں استعمال کرنے کی اس ٹیکنیک سے پہلے ہندوستان میں یہ رواج نہیں تھا، یوں محمد علی جناح نے گاندھی کی پیروی کرتے ہوئے اسلام کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے محمد علی جناح کی مغربی طرزِ زندگی اور سیکولر اپروچ کا ذکر کیا ہے، جب ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے ایک آرٹیکل میں جناح صاحب کا یہ قول تحریر کیا کہ پاکستان میں نے اور میرے ٹائپ رائٹر نے بنایا تھا تو خودساختہ نظریہ پاکستان کے علم بردار ڈاکٹر صفدر محمود نے ان کے خلاف رکیک مہم چلائی، بہت سے لوگوں کی کوششوں کے باوجود ڈاکٹر مبارک علی کا موقف "جنگ اخبار" میں شائع نہ ہوسکا، اس وقت ڈاکٹر مبارک کراچی آئے، کمانڈر ایوب ملک اور ماہنامہ بدلتی دنیا کے ساتھیوں نے اس موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا، اس سیمینار میں ڈاکٹر جعفر احمد، تسنیم صدیقی وغیرہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا مگر اس سیمینار کی روداد بھی روزنامہ جنگ میں جگہ نہ پاسکی۔ ڈاکٹر مبارک علی ہر اس نوجوان کی سرپرستی کرتے ہیں جو تحقیق اور تصنیف میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وفاقی اردو یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ عام کے تحت میرے دوست پروفیسر ناصر عباس نے تاریخ عام میں استعماریت کے اثرات پر کانفرنس کرائی اس وقت اردو یونیورسٹی نئی نئی بنی تھی ہمارے پاس کانفرنس کرانے کا تجربہ تھا اور نہ فنڈ موجود تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے یقین دلایا کہ وہ لاہور کے ۱۰ کے قریب دانشوروں کو اپنے خرچے پر کراچی لائیں گے جو اس کانفرنس میں مقالے پیش کریں گے۔ بدلتی دنیا کے روحِ رواں کمانڈر ایوب ملک نے ریجنٹ پلازہ میں ہال اور کھانے کا انتظام کرایا یوں یہ اردو یونیورسٹی کے ساتھ پہلی کانفرنس تھی اس کانفرنس میں ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ ایک نوجوان وکیل بھی آیا جس کے مقالے سے ڈاکٹر مبارک کی تحریک کی جھلک نظر آئی، بعد میں اس ہی شخص نے ڈاکٹر مبارک علی کی ایک کتاب میں تحریف کرکے ایسا مواد شائع کردیا جس سے مختلف ججوں، وکلاء، دانشوروں کی توہین ہوتی تھی۔ ڈاکٹر



مبارک علی کے خلاف لاہور کے مختلف تھانوں میں مقدمات درج ہوئے۔

ڈاکٹر مبارک علی امریکہ سے کراچی آئے تو ایوب ملک نے میرے مشورے پر سندھ ہائی کورٹ سے حفاظتی ضمانت کا بندوبست کرایا یوں پنجاب پولیس ڈاکٹر صاحب کو گرفتار نہیں کرسکی پھر ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے ناروا سلوک کے خلاف دستخطی مہم چلائی۔ لاہور میں دوستوں کی کوششوں سے کچھ دانشوروں نے آرٹیکل تحریر کیے۔ حسن نثار صاحب نے ایک خوبصورت کالم تحریر کیا، نجم سیٹھی کے روزنامہ ٹائمز کے اداریئے کو پڑھ کر گورنر پنجاب نے اس مسئلے کا نوٹس لیا۔ جب ڈاکٹر مبارک علی نے ایک طویل جدوجہد کے بعد کامیابی حاصل کی تو فیصلے کے وقت کئی قریبی لوگ آڑے آئے اور ڈاکٹر مبارک نے اس شخص کو معاف کردیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے ہمیں یہ شعور ملا کہ مذہبی قومی اور ذاتی ہیرو خامیوں سے پُر ہوتے ہیں انہیں خامیوں سمیت قبول کرنا چاہیے اس طرح بوڑھوں کو نوجوانوں پر حکومت نہیں کرنی چاہیے، جوانوں کو اپنے فیصلے خود کرنے چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے حاصل ہونے والے شعور کی بناء پر مجھ جیسے کئی لوگ شخصیت پرستی کا شکار نہیں ہوئے یوں ہم لوگ استحصال کی ایک خاص شکل کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہتے ہیں اور ان کی مشکلات حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا موضوع ابلاغ عامہ ہے مگر میں نے اس موضوع پر جب بھی کوئی کانفرنس منعقد کرائی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے کہنے پر بھارت اور پاکستان میں اساتذہ اور صحافیوں سے رابطے کیے اور انہیں کانفرنس میں شرکت کے لیے آمادہ کیا جب میں اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے لیے مختلف ماہرین سے انٹرویو کے لیے لاہور آیا تو ڈاکٹر صاحب نے ذاتی دلچسپی لے کر میرے کام کو مکمل کرایا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی سوچ کی بڑی سزا کاٹی وہ سندھ یونیورسٹی میں معروف شاعر شیخ ایاز کی وائس چانسلری کے دور میں معطل رہے پھر قوم پرست طلبہ تنظیم کے فاشسٹ رویئے سے مایوس ہوکر ریٹائرمنٹ سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی پھر انہیں ملک کی کسی یونیورسٹی میں جگہ نہیں ملی۔ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی ملازمت کی پیشکش انہوں نے قبول نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی استقامت میں ان کی اہلیہ کا اہم کردار ہے، جنہیں اس موقع پر خراج تحسین پیش نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کا اثاثہ ہیں مگر ہم ان کے لیے صرف چند جملے تحریر کرسکتے ہیں اور ایسے لوگ جب تک باقی ہیں تاریخ کا تسلسل جاری رہے گا۔

# ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر تسنیم صدیقی

ڈاکٹر صاحب سے میری باقاعدہ ملاقات تو اکتوبر 85ء میں اس وقت ہوئی جب حکومت نے مجھے حیدرآباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا لیکن اس سے پہلے سرسری واقفیت ڈاکٹر صاحب سے اس طرح ہو چکی تھی کہ ہم دونوں سندھ یونیورسٹی کے طالبِ علم تھے مبارک صاحب مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ جنرل ہسٹری اور پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ ایک ہی بلڈنگ میں تھے اس لئے آتے جاتے سلام دعا ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں سندھ یونیورسٹی کا معیار دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر تھے۔ جنرل ہسٹری کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر احمد بشیر اور پولیٹیکل سائنس کے ہیڈ ڈاکٹر نیاز الحق، انگلش کے پروفیسر جمیل واسطی، اردو کے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان فارسی کے ڈاکٹر قاضی، اسلامک کلچر کے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور معاشیات کے ڈاکٹر این اے جی خان تھے جو ناگ خان کہلاتے تھے۔ اسی طرح سائنس فیکلٹی میں نامی گرامی اساتذہ تھے۔ غرضیکہ یونیورسٹی میں ایک علمی و ادبی فضا تھی اور طلباء بڑی لگن اور محنت کے ساتھ آگے بڑھنے کی جستجو میں لگے رہتے تھے۔

غیر نصابی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور روزانہ کوئی نہ کوئی تقریری مقابلہ سیمینار یا کانفرنس اولڈ کیمپس میں منعقد ہوتا تھا جس میں سارے طالبِ علم جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ یونین کا سالانہ الیکشن بڑے معرکے کا ہوتا تھا اور شروع کے سالوں میں نظریاتی بنیاد پر لڑا جاتا تھا لیکن 1960ء کے اوائل سے اس میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی اور اب طالبِ علموں میں لسانی تقسیم نظر آنی لگی تھی محسوس ہوتا تھا کہ اردو اور سندھی بولنے والے طالبِ علموں میں آہستہ آہستہ کھچاؤ بڑھ رہا ہے۔ میں چونکہ جامشورو کیمپس کے ہوسٹل میں رہتا تھا اس لئے یہ علیحدگی وہاں زیادہ محسوس ہوتی تھی حتیٰ کہ دونوں گروپوں کے میس بھی



الگ الگ تھے۔ لگتا تھا کہ اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے جو کسی بھی وقت پھٹ پڑے گا۔ اس لسانی تقسیم اور باہمی چپقلش کی بنیادی وجوہات کیا تھیں؟ ون یونٹ کے قیام اور ایوب خانی مارشل لاء نے اس کو کتنا بڑھاوا دیا؟ ملازمتوں اور زرعی زمینوں کی بندر بانٹ میں بیوروکریسی کا کیا کردار تھا؟ ان تمام چیزوں کے اثرات سندھ یونیورسٹی پر کیا پڑے؟ یہ ایک الگ کہانی ہے جو بھی تفصیل سے لکھی جانی چاہئے۔

1965ء میں میں نے سپیریئر سروسز کا امتحان دیا اور سلیکشن کے بعد اپنی پوسٹنگوں کی وجہ سے مختلف شہروں اور صوبوں میں گھومتا رہا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب سے رابطہ تقریباً منقطع ہو گیا۔ تقریباً بیس سال بعد جب ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس وقت حالات بہت بدل چکے تھے۔ مبارک صاحب نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کر لی تھی اور سندھ یونیورسٹی کے جنرل ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین بن چکے تھے، میں ایک پختہ کار بیوروکریٹ بن چکا تھا۔ لیکن دونوں ہی حالات سے سخت غیر مطمئن تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ سندھ میں لسانی فسادات بے حد ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تقریباً ختم ہو چکا ہے، نہ طالبِ علموں کو پڑھنے کا شوق ہے، نہ اساتذہ کو پڑھانے کا۔ اس پر طرح یہ ہے کہ Violence کا زور ہے۔ ہتھیاروں کا استعمال عام ہے اور انتظامیہ بے بس ہے۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ لطیف آباد میں میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اس لئے اب ان سے تقریباً ہر ہفتے ہی ملاقات ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے اساتذہ کے برعکس ڈاکٹر صاحب کی ملکی مسائل پر گہری نظر تھی اور نوجوانوں سے مستقل رابطہ تھا۔ ان میں سندھی بولنے والے لوگ بھی تھے اور اردو بولنے والے لوگ بھی۔ ان کا گھر اوپن ہاؤس تھا جب کسی کا دل چاہے وہاں آ سکتا تھا اور حالات حاضرہ پر اپنا نقطہ نظر پیش کر سکتا تھا۔

کرنٹ افیئر سے دلچسپی رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ 1984-85ء میں ضیاء الحق کی حکومت عروج پر تھی لیکن ایک transition کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سیاست پر نسلی رنگ غالب آ رہا تھا۔ ایک طرف سندھی نیشنلسٹ پارٹیوں کو ملٹری حکومت سپورٹ کر رہی تھی تو دوسری طرف ایم کیو ایم مہاجر قوم پرستی کے نام پر اپنے آپ کو آرگنائز کر رہی تھی۔ پاکستان کے حالات پر گہری نظر رکھنے والے لوگ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ 1977ء کے مارشل لاء کے کچھ دنوں بعد ضیاء الحق کی سرکردگی میں حکومت اسلام پسندوں کے ہاتھ آ گئی تھی اور انہوں نے چن چن کر نہ صرف پڑھے لکھے لوگوں کو تعلیمی اداروں سے نکال باہر کیا بلکہ اسلامی نظام تعلیم کے نام پر تاریخ اور فلسفے جیسے مضامین کو

کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تقریباً دیس نکالا دے دیا۔ اسکولوں میں پاکستان اسٹڈیز اور اسلامک اسٹڈیز نے تاریخ کی جگہ لے لی۔ اسی عرصے میں فنونِ لطیفہ اور ان تمام اداروں کا بیڑا غرق ہوا جو لوگوں کو لبرل ازم کی طرف لے جاسکتے تھے۔ ہر وہ چیز اسلام کے خلاف گردانی گئی جو مقتدر طبقات کے مفادات کے خلاف تھی۔

جیسے کہ میں نے پہلے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی آف سندھ کے ماحول سے بہت نالاں تھے لیکن وہ نا اُمید ہو کر گھر نہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے نوجوانوں سے رابطے بڑھانے شروع کئے اور پروفیسر اے آر ناگوری، پروفیسر فرید اور خورشید قائم خانی اور دوسرے ہم خیال لوگوں کو بھی اس طرف راغب کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ گو کہ حالات بہت نامساعد ہیں لیکن لوگوں کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر نہیں بیٹھنا چاہئے۔

اسی زمانے میں، میں نے ایچ ڈی اے کے نوجوان افسروں کی مدد سے خدا کی بستی اسکیم کوٹری میں شروع کی جس کے ذریعے ایک سرکاری ادارے نے یہ ثابت کیا کہ اگر حکومت اور اس کے کارندے چاہیں تو کم آمدنی والوں کے مسائل انہی کی مدد سے آسان طریقے اور انتہائی کم قیمت میں حل کئے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس اسکیم میں مستقل دلچسپی لی اور اس کے مختلف سیمینارز اور ورکشاپوں میں بھرپور شرکت کی۔

شاید اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے چھوٹے چھوٹے کتابچے لکھنے شروع کئے اور اپنے خرچے پر انہیں چھپوانا شروع کر دیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کا ذہن اس بارے میں Clear تھا کہ تاریخ صرف بادشاہوں، شہزادوں، جنگوں اور فتوحات کا علم نہیں ہے اس کا Canvas بہت بڑا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ تاریخ کے مختلف زمانوں میں عام لوگوں کے کیا حالات تھے ان کے مسائل کیا تھے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ تاریخ کی تقسیم بدھوں، مسلمانوں یا انگریزوں کے ادوار پر نہیں ہونی چاہئے تاریخ ایک مسلسل عمل ہے اور حکمرانوں کا مذہب ایک Subsidiary چیز ہوتا ہے۔ اصل چیز اقتدار پر قبضہ اور اس کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کرتے ہیں جس میں مذہب بھی شامل ہے۔

1988-89ء کے لگ بھگ ڈاکٹر صاحب لاہور شفٹ ہو گئے اور وہاں جا کر اپنا حلقہ احباب وسیع کیا۔ انہوں نے ایک دارالترجمہ ادارے کے ذریعے بے شمار کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجز میں پڑھایا اور بے شمار طالب علموں کو اپنے خیالات سے متاثر کیا۔ کچھ عرصے کے لئے انہوں نے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا لیکن پھر ہمہ وقت پڑھنے لکھنے کے کام کے کام میں لگ گئے اور بے شمار کتابیں لکھ ڈالیں۔



ان کا دوسرا بڑا Contribution یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو عام فہم بنا کر اسے عام آدمی تک پہنچایا۔ تاریخ کے ہر پہلو پر کتابیں لکھیں چاہے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب ہوں یا پاکستانی معاشرے کی کمزوریاں، چاہے ہمارے دانشمندوں کا دوغلہ پن ہو یا سماجی ناہمواریاں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا تیسرا اہم Contribution یہ ہے کہ انہوں نے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے خصوصاً تاریخ جیسے خشک مضمون کی۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اندرونِ سندھ اور بلوچستان کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوئی کہ اگر کتاب اچھی ہو، دورِ حاضر کے مسائل سے اس کا تعلق ہو اور آسانی سے دستیاب ہو تو لوگ اسے ضرور پڑھیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی سے سب سے اہم سبق جو ہم سیکھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں لگن ہو اس کا جذبہ صادق ہو تو کامیابی یقیناً اس کے قدم چومتی ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کو ان کی 72 ویں سالگرہ پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے کام میں مگن رہیں اور نئی نسل کے لئے ان کی کتابیں مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

# شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

حسین صدانی

برسوں پہلے کی بات ہے جب فکشن ہاؤس سے چھاپی جانے والی ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں جن کی تعداد اب تقریباً 70 تک جا پہنچی ہے اس وقت ان کتابوں کی تعداد تین چار سے زیادہ نہ تھی یہ 1980ء کے شروعات کی بات ہے جب ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند دوستوں نے مل کر ایک چھوٹے سے اشاعتی ادارے کی بنیاد ڈالی جسے ''آگہی پبلی کیشنز'' کا نام دیا۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند دوستوں کی کچھ کتابیں اس ادارے کے تحت چھاپی گئیں لیکن کچھ ہی عرصے بعد شاید چند ایک برسوں بعد ہی کچھ وجوہات کی بناء پر یہ ادارہ ختم ہو گیا۔

لگ بھگ اسی دوران یا اس کے فوراً بعد چھپی ایک کتاب ''تاریخ اور روشنی'' (یہ کتاب بہت اچھی طرح سے فکشن ہاؤس نے دوبارہ چھاپی ہے) ڈاکٹر صاحب نے یہ مصرعہ لکھ کر دیا ''شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات'' ڈاکٹر صاحب نے خلوص کے کسی ایسے لمحہ قبولیت میں یہ لکھ کر کتاب دی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی بات، تاریخ کو، زندگی کو دیکھنے کا نظریہ اس طرح دل ہی نہیں بلکہ روح میں اتر گیا کہ گردشِ دوراں سے ہوتا ہوا اب گردشِ خوں میں شامل ہے۔

کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو، نجی زندگی سے لے کر پروفیشنل لائف، سیاسی، سماجی وغیرہ کسی بھی مسئلے کو اس کے مخصوص زاویے سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ ناممکن ہے کہ ذہن ایک خودکار میکنزم (Mechanism) کی مدد سے گویا اُس مسئلے کو جب تک مارکسٹ زاویے (Markist Angle) کسوٹی پر نہ پرکھ لے، ذہن اس تحقیق اور تجزیے کو ادھورا اور تشنہ محسوس کرتا ہے۔

ہمارے یہاں بہت سی اچھی روایات کے جاری نہ رہ سکنے کی طرح آگہی پبلی کیشنز جاری نہ رہ سکا۔ آگہی پبلی کیشنز سے کتابیں چھپنے کا عمل رُک جانے کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے ہمت نہ ہاری اور



لکھنے کا عمل ہی نہیں بلکہ چھپوانے کا عمل بھی اپنی محنت اور محدود ذاتی بجٹ سے جاری رکھا۔

ان دنوں ڈاکٹر صاحب اپنی تحریروں کو Rotring Pen سے خود ہی بٹر پیپر (Butter Paper) پر لکھتے پھر لطیف آباد یونٹ نمبر 7 میں واقع ایک چھوٹے سے پریس سے چھپواتے خود ہی اس کی پروف ریڈنگ کرتے پھر دوبارہ پریس میں پہنچایا کرتے اور چھپ گئی کتابوں کے بنڈلز اپنی 70 موٹر سائیکل کے کیریئر میں رکھ کر لاتے۔

دو ایک بار ڈاکٹر صاحب کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے راقم نے نظریاتی کمٹ منٹ کے اس عملی مظاہرے کو بچشم خود ملاحظہ کیا۔

حیدرآباد شہر کے علاقے صدر میں موجود ایک ہوٹل ''فاران'' ہے (یہ آج بھی موجود ہے) وہاں ہر ویک اینڈ کو ایک غیر رسمی (Informal) بیٹھک ہوا کرتی تھی جس میں شہر کے چند ایک پروفیسرز، زبیدا احمد فردوسی، فریدالدین شیخ، ڈاکٹر حسن منظر، خالد وہاب اور ڈاکٹر مبارک علی شامل ہیں، بیٹھا کرتے تھے۔

ترقی پسند سوچ رکھنے والے ان اصحاب میں کبھی کبھی اسی شہر یا کسی اور شہر کے دانشور، ادیب یا شاعر بھی شامل ہو جاتے مگر دو چار اسٹوڈنٹ اکثر ہی شامل رہتے۔

ان نشستوں کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ یہاں اکثر پہلے سے طے شدہ کوئی موضوع یا روایتی طور پر اشعار سننے اور سنانے کے بجائے زندگی اور اس سے جڑے مسائل، سیاسی، سماجی، معاشی وغیرہ کسی بھی موضوع پر گفتگو شروع ہو جاتی جس میں ان اصحاب کا تجربہ بھی شامل ہو جاتا تھا اور یہ سب انتہائی غیر رسمی (Informal) طریقے سے ہوتا تھا۔ شعور کی تربیت کا یہ انوکھا انداز پروگریسو سوچ کے حوالے سے اُس وقت کے حیدرآباد میں واحد ذریعہ تھا جو کسی بھی Formality کے بغیر اسٹوڈنٹ کو ترقی پسند سوچ کو سیکھنے کا موقع فراہم کرتا۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں میرا بھی یہاں جانا رہتا تھا اور مجھے ان اصحاب دانش سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا بالخصوص زندگی کے ترقی پسندانہ نظریہ کے بارے میں یہاں پر بھی ڈاکٹر مبارک علی سے میری اولین ملاقات ہوئی۔

ایک دن میں اپنے ایک عزیز اور محلے دار دوست ذیشان ساحل (شاعر) سے ملنے اُن کے گھر گیا ہوا تھا وہاں ہوٹل فاران میں ہونے والی بیٹھک اور اس کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی کا ذکر بھی آیا تو معلوم ہوا کہ ہم دونوں ہی ڈاکٹر صاحب کے زبردست مداح بن چکے ہیں۔ ذیشان نے بتلایا کہ دو تین ماہ ہوئے ہیں ڈاکٹر مبارک علی ہمارے محلے دار بھی بن چکے ہیں وہ پروفیسر عبدالحق کے گھر کی اوپری منزل میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ ذیشان ایک مرتبہ ان کے گھر بھی ہو آئے تھے بس تو پھر یہ طے ہو گیا کہ

کسی ویک اینڈ ڈاکٹر صاحب سے ملنے ان کے گھر جائیں گے اور ڈھیروں باتیں کریں گے۔

یہ 82-1981ء کی بات ہے پھر ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں بڑھتی ہی گئیں یہاں تک کہ کبھی ہفتہ میں دو بار بھی ان سے ملاقات رہنے لگی۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک واضح پُرخلوص نظریاتی انسان ہیں، اپنے نظریات کے حوالے سے اپنی تصنیفات اور عملی زندگی میں واضح دوٹوک رویہ رکھتے ہیں۔ نظریاتی اور عملی زندگی کو فرق کے ساتھ، کسی دوھرے پن سے گزارنے کے لئے انہوں نے خود کو کبھی مدبرانہ یا دانش ورانہ تاویلات کی مدد سے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی یا یوں کہیئے کہ انہیں اس کو ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی البتہ اتنا ضرور ہوا ہے کہ گزرے ہوئے وقت کے تلخ تجربات کے نتیجے میں کبھی کبھی تلخ ہو جاتے ہیں اور اب مجموعی طور پر ایک مستقل محتاط رویے رکھتے ہیں۔

زندگی اور نظریات کے بارے میں مسلسل دوٹوک رویہ رکھنا سماجی زندگی میں (بالخصوص ہمارے سماج میں) خود کو تنہا کرنے کا ایک مستقل عمل بھی بن جاتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب تنہا رہ جانے کے خوف کو برسوں پہلے بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

ان کے ساتھ اور بہت قریب رہنے والے لوگوں میں بہت کم لوگ یہ حقیقت پوری سچائی کے ساتھ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب وقت گذرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ بہت اکیلے ہو چکے ہیں مگر آج بھی نہایت کامیابی اور خوشی کے ساتھ اپنے نظریاتی کمٹ منٹ کی ترویج و اشاعت میں اسی طرح ثابت قدم ہیں، اور پروگریسو نظریات کی آبیاری میں مصروف آج بھی اس سوچ کے حامل نوجوانوں کے لئے انتہائی پُرکشش اور قابل تقلید ہیں۔ 1980ء کی دھائی سے لے کر آج (جنوری 2013ء) تک، تقریباً تین دھائیوں یا اس سے کچھ زیادہ وقت کو سمیٹے یہ دورانیہ بھتری سیاسی، سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے۔ بہت کچھ بدل گیا، وہ نشستیں، بیٹھکیں اور نظریاتی گروہ اور ان میں جاری تعمیری مسابقت، کچھ بھی ویسا نہ رہا ہے نظریاتی ہم آہنگی برائے سہولت کے اس دور میں پرانے نظریہ پرستوں/پسندوں میں سے کئی ایک کی ایک دوسرے سے اور آپس میں بنی ہوئی نہ رہی، بعض کی تو زندگی ہی سے بگڑ گئی اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے نظریاتی کمٹ منٹ سے ہی تائب ہو چکے ہیں مگر اس دور کے وہ نوجوان جو انجمن مصنفین حیدرآباد، لطیف آباد سات نمبر جمہور لائبریری میں ہونے والے اجلاس میں شریک ہوا کرتے تھے (سات نمبر میں جہاں اب موجود، حسین شاپنگ سینٹر اور پلازہ موجود ہے) یا ''فاران ہوٹل'' میں بیٹھنے والے ان دانشوروں سے علم حاصل کرتے ان جلسوں میں پیش کی



جانے والی تصنیفات، گفتگو، تجربات اور زندگی کے مختلف مسائل اور ان پر ہونے والے بحث و مباحثے، ان بزرگانِ دانش کی پھیلائی ہوئی ترقی پسندانہ سوچ کی وہ روشنی ہے جو اُس وقت کے مستقبل یعنی آج کے بہتیرے Radical Socialist (حیدرآباد میں) پیدا کرنے کا سبب بنی (بقول ڈاکٹر انور سجاد 70ء سے 80ء کی دھائی پاکستان میں ریڈیکل سوشلسٹ پیدا کرنے کا زمانہ ہے۔)

1990ء کے موسم خزاں کی ایک شام جب بھی ہلکی سرد ہوا کا کوئی جھونکا آنے والے یخ موسم کو باور کرا دیتا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی بیگم کے ساتھ موٹر سائیکل پر میرے گھر آئے، میری شادی سے ایک دن پہلے، بیٹھنے کے لئے اصرار کیا تو کہنے لگے۔ ابھی تم مصروف ہو گے۔ کل ضرور آؤں گا مگر زیادہ دیر بیٹھوں گا نہیں ان تقریبات میں عام طور پر میں اس لئے شریک نہیں ہوتا کہ ان میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب میری ہونے والی بیوی کے لئے ایک سویٹر اور ایک خوبصورت ملتانی لیمپ تحفے میں لائے تھے۔

گردشِ دوراں میں وہ سویٹر اور بیوی دونوں ہی ساتھ نہ رہے مگر وہ لیمپ آج بھی میرے پاس ہے اور روشنی دیتا ہے۔

1980ء سے لے کر آج تک ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقاتیں جاری رہیں، فون، خط اور پھر موبائیل ٹیکسٹ اس کے علاوہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات کے لئے کی گئی تقریبات میں شرکت اور کبھی کبھی ان تصنیفات پر مضامین پڑھنے کا بھی اتفاق رہا۔ اس میں وہ دور بھی شامل ہے جب ڈاکٹر صاحب ہمارے شہر کو چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور شفٹ ہو گئے جہاں وہ آج بھی مقیم ہیں۔

محلے میں حق صاحب کا وہ مکان جہاں اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب تقریباً سات برس بطور کرایہ دار مقیم رہے اور جہاں ڈاکٹر صاحب سے اولین ملاقاتیں رہیں وہ مکان برائے نام تبدیلی کے ساتھ اب بھی ویسے ہی موجود ہے۔

30، 32 برس پہلے کا نوجوان اور آج کا ادھیڑ عمر پروفیسر، شام کے وقت، واک کے دوران، اس گھر کے سامنے سے گذرتے ہوئے، اپنی بیوی کو وہ گھر دکھلاتا ہے۔ جہاں سیڑھیاں چڑھ کر ایک مختصر برآمدہ ہے (جو باہر سے بھی دکھلائی پڑتا ہے) اس کے پیچھے ایک بڑی سی کھڑکی جس کے ساتھ بنے کمرے میں اندرونی جانب ڈاکٹر صاحب کا بڑا سا ریڈنگ ٹیبل لگا ہوا ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب نظر آئے۔

بیل دینے پر، جوگر پہنے، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہشاش بشاش، سیڑھیاں اتر کے آئے، مسکراتے ہوئے بولے'' کیسے ہو صمدانی؟''

12 دسمبر 2012ء، آرٹس کاؤنسل کراچی میں ہونے والے سہ روزہ فیسٹیول میں آج کے دن کا ایک پروگرام، ابھی کچھ ہی دیر بعد ملک کے مایہ ناز محقق، دانش ور اور تاریخ داں، تقریباً 70 کتابوں کے مصنف، بین الاقوامی سطح پر جانے مانے، ڈاکٹر مبارک علی کو آج ایوارڈ دیا جاتا ہے۔

آرٹس کاؤنسل کے مرکزی دروازے کے باہر کار رکی، خوش آمدید کہنے والے کچھ لوگ دروازے پر بھی موجود تھے۔ کار سے ڈاکٹر صاحب، ان کی بیگم اور بیٹی برآمد ہوئے۔ بوڑھے ہوتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی، ہال کی جانب اپنے ایک دوست کے بازوؤں کا سہارا لئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

قریب ہی کھڑے ادھیڑ عمر حسین صمدانی اور اس کی ہم عمر بیوی یہ منظر دیکھا کئے۔۔۔!



# ڈاکٹر مبارک علی — ایک معروضی (Objective) مؤرخ

جاوید صدیقی

عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ برصغیر علمی طور پر ایک بنجر علاقہ رہا ہے۔ تاریخی طور پر اس میں کچھ سچ بھی ہے۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں ہونی چاہئے خاص طور پر جب ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ اس قدر وسیع وعریض قطعہ اراضی ہونے کے باوجود اس علاقے کے لوگوں نے انسانی ذہنوں کی ترقی میں شاید ہی کوئی خاطر خواہ کردار ادا کیا ہو۔ اس تناظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ماضی حال کو جنم دیتا ہے اور حال مستقبل عطا کرتا ہے۔ اگر ہم تاریخ سے نابلد ہوں اور جھوٹ کے ساتھ زندہ رہیں تو ہم تاریخ کو مسخ کر دیتے ہیں یا پھر زیادہ تر ہم تاریخ کو رومانوی کہانیوں (Fairy tales) کے طور پر تخیل کرتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں حال پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ امید حوصلہ ہار کہ تصوراتی قلعوں (Fictional Castles) میں بدل جاتی ہے۔ پاکستان میں ایسا ماحول ہے کہ یہاں لکھی جانے والی تاریخ میں بمشکل ہی سچ مل سکے گا۔ اس 'مقدس' سیاست کے وجود میں آنے کے بعد سے لے کر آنے والے سالوں میں دانستہ طور پر تاریخ کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ جھوٹ ایک عالمگیر حقیقت (Universal truth) اور سچ بالائی فطری حقیقت کے زیر دست دب کر رہ گیا ہے۔ اس طرح کے تاریک ماحول میں جہاں روشن خیالی (renaissance) اور reformation تحریکیں علم (Intellectual) کے کناروں کو نہ چھو سکی ہوں ایسے میں ڈاکٹر مبارک علی کا نام ان ذہنوں کو جو حقیقت کو فسانے سے علیحدہ کر کے دیکھنے کے خواہشمند ہیں ان کے لئے روشنی کی کرن کا کام کرتا ہے۔ وہ ایک ''معروضی تاریخ دان'' ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں ان کے علمی کام پر روشنی ڈالوں میرا دماغ ماضی کے دریچوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ ماضی سے وابستگی چار دہائیوں قبل کی ان یادوں میں چلی جاتی ہے جب 60ء کی دہائی میں ہم سندھ یونیورسٹی میں شاگرد تھے۔ ہم دونوں کا خمیر جدا ڈھانچوں سے اُٹھا تھا۔ وہ

ایک خاموش اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے جو شور مچانے اور ہلہ گلہ کرنے والے شاگردوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ میرا ثانوی گروہ (secondary group) سے تعلق ہونے کے باعث میں ان سے دوستی کا دعویدار ہونے کا اعلان تو نہیں کر سکتا لیکن یقیناً احترام کا رشتہ پیدا ہوتا رہا۔ طالب علمی کے دنوں میں میں نے ان کو مذہب کے قریب پایا جس کے باعث ہمارے درمیان قربت تو نہ آ سکی لیکن پھر بھی باہمی احترام کا رشتہ قائم ہو گیا۔ لیکن وہ بات جو کہ ہم لوگوں کو قریب لانے کا باعث بنی وہ تھی کالجوں کے باہمی تقریری مقابلے۔ یہ مقابلے ان دنوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بڑی ہی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ ان انٹر کالجز مقابلوں میں ہم دونوں نے مل کر یونیورسٹی کی اچھی ٹیم ترتیب دی۔ مجھے ان مقابلوں میں سے یہ ایک مقابلہ آج بھی بڑی اچھی طرح یاد ہے جو کہ جامعہ کراچی میں منعقد ہوا۔ یہ 60ء کی دہائی کی بات ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اور میں نے مل کر جامعہ سندھ کی اس مقابلے میں نمائندگی کی۔ زمانہ ماضی کا یہ ایک نہایت پُر وقار (prestigious) واقعہ ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم اس مقابلے میں شریک سب سے کم عمر مندوبین تھے۔ اس مقابلے میں دیگر کئی کالجوں اور جامعات کے بہترین مقررین شریک تھے۔ یہ تقریری مقابلہ بہت رات گئے تک جاری رہا اور بڑا دلچسپ رہا لیکن آخر میں ہماری مسرت اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہ مقابلہ جیت کر اپنی جامعہ کے لئے تالیوں کی گونج میں ٹرافی حاصل کی۔ یہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد یادگاری تقریری مقابلہ تھا۔ یہ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ میرا ابتدائی تعارف تھا۔ اس تعلق کے بعد ہمارے تعلقات میں ایک طویل وقفہ آیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر مبارک نے اپنا ایم اے کرنے کے بعد جامعہ سندھ میں ملازمت اختیار کر لی جبکہ میں نے ملازمت کے حصول کے لئے کراچی کا رخ کیا اور ابتدائی طور پر اسٹیٹ بنک آف پاکستان اور سول سروس میں عارضی ملازمتیں کرنے کے بعد بالآخر وکالت کا مستقل شعبہ اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے کے لئے ڈاکٹر مبارک علی سے رابطہ بالکل ہی منقطع رہا۔ جرمنی سے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کر کے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر مبارک علی سے جب رابطہ ہوا تو پتہ چلا کہ اب ان کے اندر ایک اعلیٰ درجے کا عالم بسنے لگا تھا۔ اب ان کے خیالات اور بول چال میں عالمانہ رنگ جھلکنے لگا تھا اور تحقیق کی دلچسپی بن گئی تھی۔
ان کی اخبارات میں شائع ہونے والی تخلیقات اور کتب ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی تھیں جو کہ اب تک جھوٹ اور گمراہی کی باتیں پڑھتے اور اس کو ہی سچ سمجھتے آئے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں نے ان جھوٹ کے پلندوں کو کھول کر عریاں کر دیا۔ اگر ”تاریخ کی درستگی“ کی بات ہو گی تو یقیناً یہ بات کہی جائے گی کہ ڈاکٹر مبارک علی نے یہ اہم کام کیا کہ انہوں نے رومانوی (Fictional)



طرزِ تاریخ کو حقیقی تاریخ نویسی سے بدل کر رکھ دیا اور خاص طور پر برصغیر میں مسلمان معاشرے کے المیے پر انہوں نے بڑے حقیقت پسندانہ طریقے کے تحت لکھا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں ان واقعات کی سچائی اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے جھوٹ اور لغو کے گہرے سمندروں سے سچ کو تلاش کر کے نکالنا پڑا۔ ان کی زیادہ تحریریں تاریخ کو ”درست“ کرنے کے عمل کے بارے میں ہیں اور ان کی یہ کاوشیں اب رنگ بھی لا رہی ہیں۔ ایسی کاوشیں صرف ایک ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو کہ اپنی سوچ میں مکمل طور پر سیکولر ہو اور وہ بغض اور نفرتوں سے بالاتر ہو خاص طور پر مذہبی منافرت کے عمل سے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے سیکولر سوچ کا اختیار بڑی سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کی اس راہ پر چلنے کے پس پشت سب سے اہم وجہ ان کا جرمنی جیسے روشن خیال معاشرے میں طویل عرصے تک قیام ہے۔ جرمن زبان میں مہیا ہونے والے علم نے ان کے اندر ایک حقیقی عالم کو جنم دیا جس کی دلچسپی تاریخ کو حقیقت پسندی کی نگاہ سے تلاش کرنا تھا۔ انہوں نے کس طرح سے اس علم سے استفادہ کیا اور کس طرح اپنے قارئین کو اس سے مستفید کرنے کا سوچا اس کی جھلک ان کی تحریروں میں ہمیں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کا زیادہ تر تحقیقی کام برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ حکمرانی کے متعلق ہے۔ درحقیقت برصغیر میں کوئی اور شخص ڈاکٹر مبارک کی علمی مرتبت کے قریب سے بھی نہیں گزر سکتا۔ درحقیقت یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی سے قبل کوئی تاریخ نہ تھی۔ یہ بات میں کیوں کہہ رہا ہوں اس کا اندازہ صرف وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں جنہوں نے کہ مغربی روایات کے تحت رقم کی جانے والی تاریخ کا تجربہ حاصل کیا ہو۔ مورخ کون ہے؟ مورخ ایک ایسا شخص ہے جو کہ ماضی کے متعلق پڑھتا اور لکھتا ہے اور اس پر مکمل دسترس بھی رکھتا ہو۔ مورخوں کی دلچسپی تاریخی واقعات کے تسلسل، ان کے متعلق طریقہء تحقیق اور انسانی نسلوں کے ماضی سے تعلق رکھنے والے واقعات کے متعلق تحقیق کرنا ہوتا ہے۔ ان کا کام ماضی اور حال کے واقعات کو معروضی طریقہ کے تحت پیش کرنا ہوتا ہے۔ تاریخ کے ان واقعات کو تجربہ کار اور نئے آنے والے محقق بھی بڑے عمدہ طریقے کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔ کچھ مورخین بہرحال اپنی شائع شدہ تخلیقات، تربیت اور تجربے کی بنیاد پر شناخت کئے جاتے ہیں۔ ”مورخ“ انیسویں صدی میں باقاعدہ طور پر (Professional) مورخ اس وقت بنے جب انیسویں صدی کے اختتام پر جرمنی کی جامعات میں عمدہ تحقیق ہونے کے بعد تاریخ کے نئے پہلو سامنے آنے لگے۔
ڈاکٹر مبارک علی مورخ کی اس تعریف میں بالکل فٹ آتے ہیں۔ جدید دنیا کے تناظر میں تاریخ اب صرف ماضی کے واقعات کو بیان کرنے کا نام نہیں رہی جو کہ ماضی کے متعلق کہانیاں اور افسانے سناتی

ہو بلکہ یہ اب مکمل طور پر ایک منفرد مضمون بن گیا ہے۔

میں جب یہ بات کرتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک ایک معروضی (Objective) مورخ ہیں تو یہ بات اس تاریخی فیصلے (Judgement) پر مبنی ہے جو کہ ارونگ مقابل پنگوئین کتب اور لپ سٹڈ (Irving Vs Penguin Books and Lipstadt) کے مقدمے میں عدالت کو "معروضی مورخ" کیا ہے کہ سوال کے جواب میں دینا پڑا۔ یہ بات بالکل اسی طرح مناسب (reasonable) لگتی ہے جس طرح کہ انگریزی لغت کو استعمال کرنے کا کوئی شخص انگریزی قانون میں استعمال ہونے والی ترتیب "The Man on the Clapham Omnibus" کا اندازہ رکھتا ہو۔ اس کی وجہ سے یہ ہے کہ ہمیں حقیقت جاننے کے لئے کسی ایک قانونی نشان (Bench mark) کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر ایک معروضی مورخ کی تحریر کا موازنہ اور مقابلہ کر سکیں۔ ڈیوڈ ارونگ کی طرف سے Irving Vs Penguin Books and Lipstadt میں اپنائے جانے والے اصول سے قبل اس سلسلے میں ہمیں کوئی اور نظیر نہیں ملتی جس کو کہ ہم قانونی مثال قرار دیتے ہوئے اسے معروضی مورخ کے طریقہ "تاریخ" کا نام دے سکیں!

جسٹس چارلس گرے نے ہولوکاسٹ (Holocaust) کے منکرین کی تحقیقات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک تجربہ کار عینی شاہد رچرڈ ایونز کی تحقیق پر بڑی حد تک انحصار کیا جس نے تاریخ کو تاریخی تحقیق کے عمل میں مسخ کرنے کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ وینڈے اسکیونڈر (Wendie E.Schneider) جسٹس گرے کے تاریخی فیصلے کی بنیاد پر ویل کے تحقیقی جریدے (Yale Law Journal) میں درج ذیل سات نکات کو بیان کرتا ہے جو کہ ایک معروضی مورخ ہونے کے لئے نہایت ضروری ہیں:

1- ایک مورخ کو تمام مواخذ کو تمام مناسب خدشات کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔
2- مورخ کو تمام ضدی شواہد (Counter evidence) کو تحقیق کے سوا مسترد نہیں کر دینا چاہئے۔
3- مورخ کو شواہد اور ضائع شدہ اکٹھے مواد (eschew cherry-picking) کو یکساں نظر سے دیکھنا چاہئے۔
4- مورخ کو کسی بھی قسم کے قیاس کو بالکل واضح طور پر بیان کرنا چاہئے۔
5- مورخ کو مسودات کو کسی بھی طرح غلط ترجمہ یا پھر کچھ حصوں کو حذف کر کے قاری کو گمراہ نہیں کرنا چاہئے۔



6- مورخ کو تمام واقعات کی صحت کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینا چاہئے نہ کہ صرف ان متضاد پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہئے جو کہ ایک مخصوص نقطہ نظر کی تائید کرتے ہوں۔
7- مورخ کو تاریخی کرداروں کے اصل مقاصد (motives) کو ضرور زیر غور لانا چاہئے۔

اسکیونڈر (Schneider) معروضی مورخ (Objective Historian) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ اصطلاح مورخ کو امریکی ڈیوبرٹ معیار (Daubert Standard) کے مقابل آنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اسکیونڈر کا خیال ہے کہ اس کے خیال میں ارونگ (Irving) ڈیوبرٹ معیار کے امتحان کو اس وقت پاس کر سکے کہ جب عدالت کو "مورخوں کی طرف بڑی بھرپور معاونت" فراہم کی جا سکی۔ میرے خیال میں ڈاکٹر مبارک علی "معروضی مورخ" کے اس امتحان سے بڑی خوبی سے پاس ہو کر گزرے ہیں کیونکہ ان کی تحریروں نے جدید مورخین کو نئی راہیں دکھائی ہیں اور خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں پہلے سے ایسی کوئی روایات موجود نہ تھیں۔

ڈاکٹر مبارک کی کتب اور دیگر تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے اور خاص طور پر ان کے "تاریخی تجزیے" کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی بات جو کہ تاریخی تحریروں میں بڑی ناپید نظر آتی ہے وہ ہے ان کی تحریر کا "تاریخی عمل کا تجزیہ ہے جو کہ تفتیش اور تقابلی خیالات کا بھرپور جائزہ ہے جو کہ حقائق کے جائزے اور ایک مربوط طریقے سے حقائق کا جائزہ لیتے ہوئے ان معمات کی وضاحت کرتا ہے کہ "کیا ہوا" (What happened) اور "کیوں یا کیسے یہ ہوا" (Why or how it happened)۔

جدید مورخ اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے سماجی علوم کے دیگر شعبوں مثلاً سیاسیات، اقتصادیات، بشریات، عمرانیات، فلسفے اور لسانیات کو بھی زیر غور رکھتے ہیں۔ قدیم مورخ جدید مورخین کے طریقہء کار سے عمومی طور پر مطابقت نہیں رکھتے لیکن پھر بھی ان کا کام اپنے وقت کے تناظر میں واقعات کے متعلق بڑی اندرونی معلومات فراہم کرتا ہے۔ جدید مورخین کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ نئی آنے والی تحقیق اور حاصل ہونے والی اضافی معلومات کے نتیجے میں تاریخی بیان کردہ حقائق کو یا تو قبول کرنا یا پھر ان کو مسترد کرنا ہے۔ جدید مورخین کی یہی خصوصیت بڑی منفرد خوبی ہے جو کہ ڈاکٹر مبارک علی کے یہاں بڑے بھرپور انداز سے نظر آتی ہے۔ یہ انتہائی مشکل عمل ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی کی کسی خاص کتاب کا نام لیا جائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تمام تحریریں تاریخی تناظر کے عمل کے زمرے میں آتی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی جدید مورخوں کی فہرست میں وہ نام ہیں جو کہ برصغیر کی تاریخ اور خصوصاً انڈیا میں مسلمانوں کی تاریخ کو ایک خاص حوالے سے بالکل نئے طریقے سے لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے کام کا وہ پہلو جو کے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو سیکولر انداز سے لکھنا ہے اور یہی چیز اس وقت سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔



## ڈاکٹر مبارک علی ــــ جدوجہد کی ایک کہانی

سلمان عابد

ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کے سیاسی، سماجی اور علمی حلقوں میں ایک بڑے معتبر نام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے خیالات سے فکری طور پر اتفاق کرنے والے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ پایا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں ان کے خیالات سے اتفاق کرنے والوں کا حلقہ ہے وہیں ان سے اختلافات کرنے والے لوگوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہمارے یہاں شخصیات سے اختلافات کرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ ان وجوہات میں علمی اور تحقیقی بنیاد بھی ہوتی ہے اور شخصیات کے بارے میں کچھ جانے بغیر تعصب اور گمراہ کن تصورات بھی ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں 90ء کی دہائی میں پہلی بار ڈاکٹر مبارک علی سے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور میں ملا۔ ڈاکٹر مبارک علی یہاں بطور ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس ملاقات سے قبل میرا بھی ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں وہی روایتی تصور تھا جو دائیں بازو کے مذہبی لوگوں کے خیالات ہوتے ہیں۔ ہمیں ابتداء میں یہ ہی بتایا گیا تھا کہ لبرل اور سیکولر خیالات کے لوگ لادین ہوتے ہیں۔ مذہب اور خدا کے بارے میں ان کے تصورات گمراہ کن ہیں اور ان سے دور رہنا چاہیے۔ اس خیال کو مضبوط بنانے میں ہمارے کچھ لبرل، روشن خیال اور سیکولر دوستوں کا بھی کمال تھا، جو ہمیشہ سے مذہب اور خدا کے بارے میں تعصب پر مبنی گفتگو کیا کرتے تھے۔ پہلی بار ہمیں سیکولرازم کا مطلب خدا کے وجود سے انکاری کا دیا گیا تھا۔ اس لیے جب میری ڈاکٹر مبارک علی سے ابتدائی ملاقات ہوئی تو کچھ اسی طرز کے خیالات میرے ان کے بارے میں بھی تھے۔

میرے مرحوم والد عبدالکریم عابد جو دائیں بازو کی پاکستانی صحافت کے چند بڑے صحافیوں میں شمار ہوتے تھے۔ دائیں اور بائیں بازو کے صحافتی اور دانشوروں کے حلقوں میں ان کی رسائی خوب تھی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈاکٹر مبارک علی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر ان سے بھی کیا تھا۔ میرے لیے یہ بات بڑی حیرانگی کی تھی کہ میرے والد کے خیالات ان کے بارے میں بہت شاندار تھے۔ مجھے انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر مبارک علی پاکستان اور ہندوستان میں تاریخ نویسی کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے۔ ان کے بقول میں ڈاکٹر مبارک علی کے بہت سے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا، لیکن ان کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہوں کیونکہ وہ لکھتے وقت کسی شخصیت اور ادارہ سمیت کسی کے بارے میں تعصب کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ میرے والد کے ان خیالات نے مجھے عملی طور پر ان کے قریب کرنے اور بار بار ملنے میں خاصی تقویت دی۔ لاہور میں ڈاکٹر مبارک علی سے پہلی ملاقات کے پیچھے ایک پس منظر بھی ہے۔ ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر ندیم عمر، بلال احمد اور اسد جمال ایڈووکیٹ جو اس وقت 90ء کی دہائی میں ہماری طرح کے طالب علم تھے۔ ان دوستوں نے نوجوانوں کی سطح پر کام کرنے کے حوالے سے ینگ تھنکرز فورمز کی بنیاد ڈالی۔ اس فورم کے اجلاس گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ہوتے تھے اور ہمیں بھی ان اجلاسوں میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔ اگرچہ بعض اوقات ان فورمز میں انگریزی زبان کا بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا، جو میرے جیسے لوگوں کے لیے سمجھنا خاصہ مشکل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی بھی ان اجلاسوں میں خصوصی لیکچرز دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اردو زبان میں اور وہ بھی آسان انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ہمیں اجوکا تھیٹر کے ڈرامے بھی دیکھنے کو ملے جو ڈاکٹر مبارک علی کی مدد کے ساتھ اس ادارے میں ہوتے تھے۔ یہیں پر ہماری ملاقات اقبال احمد خان سے بھی ہوئی جو ڈاکٹر مبارک علی کے دوستوں میں سے تھے۔ وہ ڈاکٹر مبارک کی خواہش پر پاکستان آئے اور ڈاکٹر صاحب کے بقول وہ تو بھارت جانا چاہتے تھے، لیکن میں نے انھیں پاکستان میں کام کرنے پر آمادہ کیا۔ ڈاکٹر مبارک علی ان لوگوں میں سے تھے جو نوجوانوں کی ہمیشہ سے حوصلہ افزائی کرتے اور جہاں بھی نوجوان طبقہ ان سے مدد مانگتا یا انھیں دعوت دیتا وہ بلا تکلف آجایا کرتے تھے۔ آج جب میں پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ینگ تھنکرز فورمز جیسے اداروں کی راہنمائی کر کے ہمیں آگے بڑھنے اور کچھ سیکھنے اور سمجھنے کے خوب مواقع فراہم کیے۔ لیکن یہ فورم اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا اور ڈاکٹر مبارک علی سے رابطے کا سلسلہ بھی ٹوٹتا گیا۔

میرے اور ڈاکٹر مبارک علی کے مشترکہ دوست عزیز سندھی مرحوم بھی کمال کی شخصیت تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ہر ہفتے باقاعدگی سے مزنگ میں فکشن ہاؤس میں بیٹھتے ہیں اور کوئی



بھی اس محفل کا حصہ بن سکتا ہے۔ یہاں پھر ڈاکٹر مبارک علی سے رابطوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اور اکثر اوقات یہاں آنے کے لیے مجھے عزیز سندھی ہی پابند کیا کرتے تھے۔ یہیں فکشن ہاؤس سے ڈاکٹر مبارک علی کی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کیا، اکثر کتابیں رانا عبدالرحمٰن مجھے گفٹ میں بھی دیا کرتے تھے۔ میری دلچسپی کا اہم محور کیونکہ سیاست تھا، لیکن ڈاکٹر مبارک علی بہت کم عملی سیاست اور روزمرہ کے سیاسی مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ زیادہ علمی موضوعات کو اپنی گفتگو کا حصہ بنایا کرتے تھے، لیکن وہ ہماری سیاسی معاملات پر گفتگو سنتے بھی تھے اور اس پر مختصر تبصرہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی ہفتہ وار نشست فکشن ہاؤس سے امجد سلیم منہاس کے سانجھ پبلیکیشنز میں منتقل ہوئی اور اب یہ نشستیں ہفتہ وار نیرنگ گیلری میں جاری ہیں۔ اس محفل میں راقم سمیت اسلم گورداسپوری، قاضی جاوید، شہزاد احمد، رفاقت علی، شہزاد بشیر ایڈووکیٹ، زمان خان، ڈاکٹر انیس عالم محمود مرزا، ڈاکٹر صاحب کی سربراہی میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر مبارک علی کا ہی کمال ہے کہ یہ محفل ان ہی کی وجہ سے قائم دائم ہے۔ وہ اس محفل کی حقیقی رونق ہیں اور ان کا تسلسل کے ساتھ آنا بہت سے لوگوں کو بھی آنے پر پابند کرتا ہے۔ میں لاہور میں ہوں اور ہفتے کا دن ہو تو پہلی کوشش ڈاکٹر مبارک علی سے ملاقات ہی کی ہوتی ہے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس محفل کے دوستوں اور بالخصوص ڈاکٹر مبارک علی سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور مل رہا ہے جس نے عملی زندگی میں مجھے کافی مدد فراہم کی ہے۔ یہ نشستیں اگرچہ غیر رسمی ہوتی ہیں، لیکن کچھ نوک جھونک کے باوجود سیاسی، سماجی، تاریخی، مذہبی، سائنسی اور بین الاقوامی تعلقات عامہ کے موضوعات پر گفتگو بہت خوب ہوتی ہے اور بالخصوص ڈاکٹر صاحب کی موجودگی مکالمہ کی فضا کو برقرار رکھتی ہے۔ ایک نیا سلسلہ ڈاکٹر مبارک علی ہی کی خواہش پر ایک منتخب کردہ کتاب پر گفتگو کا بھی رکھا جاتا ہے۔ اس گفتگو میں حصہ لینے کے لیے یقیناً پہلے کتاب پڑھنا ہوتی تھی اور کتاب کو پڑھے بغیر اگر کوئی تبصرہ کرے تو ڈاکٹر صاحب کی ناراضگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی بنیادی طور پر مکالمہ کے حامی ہیں۔ وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کسی زعم کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ان کی شخصیت کے پہلو میں ان کی عاجزی کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ وہ دوسروں پر اپنی رائے ٹھونسنے کی بجائے ہر طرح کے خیالات اور افراد کا احترام کرتے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر مبارک علی کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مکمل سچ نہیں سمجھتے، بلکہ اپنے خیالات کی اصلاح میں بھی پیش پیش ہوتے ہیں۔ وہ گفتگو اور مکالمہ میں جذباتی انداز اختیار نہیں کرتے، بلکہ ان کا انداز منطق اور دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی ان کی بات سے اتفاق نہ کرے تو وہ اس سے الجھنے کی بجائے خاموش رہتے

ہیں۔ان کے بقول ہمیں اس طرزِ عمل سے گریز کرنا چاہیے کہ ہر کوئی ہماری بات کو سچ سمجھے۔بہت سے لوگ ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں غلط تصورات رکھتے ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ ان کے بارے میں سنی سنائی باتیں ہوتی ہیں۔لیکن جب لوگ ان سے ملتے ہیں اور کچھ وقت گزارتے ہیں تو ان کے خیالات اور تصورات میں فرق بھی نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر وہ کسی بھی مذہب، فرقہ، برادری اور لسانیات کی بنیاد پر شخصی اور عقائد پر کیچڑ اچھالنے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔جو لوگ اونچی آواز میں ان سے بات کرتے ہوئے جھگڑے کا انداز اختیار کرتے ہیں اس پر ڈاکٹر صاحب کی خاموشی بھی کمال کی ہوتی ہے۔وہ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہوئے کسی علمیت کا شکار نہیں ہوتے۔جو لوگ ان کی تحریریں پڑھتے ہیں وہ یہ اعتراف کریں گے کہ ان کی زبان و فہم بہت سادہ اور آسان ہے۔حالانکہ وہ تاریخ کے استاد ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ مشکل بات کو آسان انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔انھوں نے تاریخ نویسی کا جو انداز اپنایا ہے وہ کم تاریخ دانوں کے حصہ میں آیا ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔مجھے یاد ہے کہ 2011ء میں مجھے ان کے ساتھ کوئٹہ جانے کا موقع ملا وہاں جس انداز میں کوئٹہ کے لوگوں اور بالخصوص نوجوان طبقہ نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔اہم بات یہ تھی کہ نوجوانوں نے ان کی بیشتر کتابیں پڑھی ہوئی تھیں اور ان کا حوالہ بھی ان لوگوں نے اپنی گفتگو میں دیا۔ڈاکٹر مبارک علی کوئٹہ کے اس دورے میں خود بھی حیران تھے اور ان کے بقول انھیں اندازہ نہیں تھا کہ لوگ ان کو پڑھتے بھی ہیں اور محبت بھی کرتے ہیں۔اسی طرح گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں ایک ٹی وی ٹاک شو کی ریکارڈنگ سے ہم اکٹھے باہر نکلے، تو ڈاکٹر صاحب نوجوان طبقہ کا ماتم کرنے لگے کہ یہ لوگ ہر ایک کی باتوں پر تالی بجاتے ہیں۔اسی اثناء میں کچھ نوجوان ہمارے پاس آئے اور ڈاکٹر صاحب سے آٹوگراف مانگے، لیکن ان کے الفاظ مجھے یاد ہیں ان کے بقول ڈاکٹر صاحب آپ ہال میں موجود لوگوں کی جذباتیت اور تالیوں کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔ہم آپ کے قاری ہیں اور بہت شوق سے آپ کی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور آپ ہمارا قومی علمی اثاثہ ہیں۔یہ الفاظ ڈاکٹر مبارک علی کی علمی صلاحیتوں کا عملی اعتراف تھا جو بہت کم لکھنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ڈاکٹر مبارک علی کی تحریروں کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ بہت لمبی بات کرکے اپنا مقدمہ پیش کرنے کے عادی نہیں۔ان کے مضامین اور ان میں موجود تحریریں مختصر اور جامع ہوتی ہیں اور زبان کی شگفتگی کا بھی وہ خاص خیال رکھتے ہیں۔جو بھی قاری ان کی کتاب کا مطالعہ شروع کرے گا وہ ایک ہی سانس میں کتاب پڑھنے کو ترجیح دے گا، کیونکہ کتاب کا ربط آپ کو مکمل کتاب پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔طلبہ سیاست، سیاسی جماعتوں کے



داخلی مسائل، جمہوری تضادات، ہیرو ازم، جاگیردرانہ طبقہ کے مسائل، موروثی سیاست، مزاحمت کی سیاست، انتہا پسندی، دہشت گردی، تعلیمی زوال، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، طرزِ حکمرانی، عورت اور تاریخ، مسلمان معاشرے کا المیہ، دانشوروں کا بحران، تاریخ کے نئے زوایئے، پاکستانی معاشرہ پر ان کی تحریریں لاجواب ہیں۔لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان کی بیشتر کتابیں ہمارے تعلیمی نصاب کا حصہ نہیں۔ہم نے بہت سے ایسے اچھے لکھنے والوں کو اپنی تعلیمی زندگی سے دور کیا ہوا ہے۔ڈاکٹر مبارک علی کیونکہ ریاست کے دانشور یا مصنف نہیں، وہ عوام کو سامنے رکھ کر اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں۔یہ ہی وجہ ہے کہ بہت سے اہم فورمز پر لوگ ان کو بطور مقرر بلاتے تو ہیں، لیکن ان کی صاف گوئی سے ناراض بھی ہوتے ہیں۔وہ اپنی بات کرتے وقت کسی بھی مصلحت پسندی کا شکار نہیں ہوتے۔جو بات وہ سچ سمجھتے ہیں اس کا اظہار کرنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔یہ ہی وجہ ہے کہ اب بہت سے لوگ ان کو بلانے سے قبل خوب سوچتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی بنیادی طور پر لبرل اور سیکولر خیالات کے حامی ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کے بہت سے لوگ انھیں اپنے لیے خطرہ بھی سمجھتے ہیں۔دائیں بازو کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن بائیں بازو کے لوگ ان کی سچی اور کھری باتوں سے اکثر نالاں رہتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر مبارک علی ان باتوں میں الجھنے کی بجائے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں اور وہ اپنے اوپر ہونے والی تنقید کو بھی کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی نے بہت سی کتابیں اردو میں لکھی ہیں جو ہم جیسے لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں، لیکن آج کل ان کی ہفتہ وار تحریریں زیادہ تر انگریزی اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اردو اخبارات میں اس طرز کے لکھنے والے لوگوں کے لیے بہت زیادہ حالات سازگار نہیں۔حالانکہ اگر اردو اخبارات میں ان کے مضامین تواتر سے شائع ہوں تو یہ لوگوں کی علمی اور فکری صلاحیتوں کو بڑھانے میں کافی مدد فراہم کرسکتی ہے۔لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی ادارت میں ایک مجلہ ''تاریخ'' کے نام سے بھی گذشتہ کئی برسوں سے جاری رکھا ہوا ہے۔اس مجلہ میں بہت ہی تحقیقی مضامین ہوتے ہیں اور موضوعات کی بنیاد علمی اور فکری ہوتی ہے۔اس مجلہ کی کم وسائل کے باعث تشہیر بہت زیادہ نہیں ہوتی لیکن مجلہ بہت کمال کا ہوتا ہے۔اسی طرح ڈاکٹر مبارک علی ہر سال باقاعدگی سے کسی نہ کسی شہر میں تاریخ کے موضوع پر قومی کانفرنس کا انعقاد بھی کرتے ہیں جو ان کی بڑی قومی خدمت کے زمرے میں آتی ہے۔میں نے ڈاکٹر مبارک علی کو ہمیشہ اس وقت بہت زیادہ دکھی پایا جب وہ پاکستان کے تعلیمی زوال کی کہانی پیش کرتے

ہیں اور جس انداز سے ہماری یونیورسٹیوں میں بگاڑ پیدا ہوا اس کی ایک وہ مکمل کہانی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے بقول پاکستان میں نوجوان طبقہ کے ساتھ تعلیم میں بہت ظلم ہوا ہے۔ ایک دفعہ میں نے پاکستان میں ڈاکٹر عطاالرحمٰن کے تناظر میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کا ماتم کیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب جس ملک میں پرائمری انفرسٹرکچر نہ ہو وہاں ہائر ایجوکیشن کمیشن نہیں بلکہ پرائمری کمیشن کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے میری بات سے اتفاق بھی کیا اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر پی ایچ ڈی کی بندر بانٹ کا بھی خوب ماتم کیا۔ وہ تعلیم کی نجکاری پر بھی اپنا سخت موقف رکھتے ہیں اور ان کے بقول اگر ان کے دور میں تعلیم اتنی مہنگی ہوتی تو شاید ان کے والدین انھیں تعلیم نہیں دے سکتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ پاکستان کی ریاست اور حکمران طبقات ڈاکٹر مبارک علی کی علمی صلاحیتوں سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکے جس کے ڈاکٹر صاحب مستحق تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی بنیادی طور پر سمجھوتے کے آدمی نہیں۔ وہ اپنے اصول، خیالات اور نظریات پر کھڑے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اگر آپ ان کے حالات زندگی پر مبنی آپ بیتی پر دونوں کتابیں ''در در ٹھوکر کھائے'' اور ''میری دنیا'' پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اپنے اصول اور نظریات کی اس جنگ میں عملی طور پر انھوں نے کیا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ایک در سے دوسرے در کا سفر میں اپنی انا پرستی اور خودداری سمیت دیانت کو سنبھالنا ان کے چاہنے والوں کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ وہ گھٹن میں کام کرنے کے عادی نہیں اور جہاں انھیں گھٹن کا احساس ہوا وہاں انھوں نے اپنا سفر تبدیل کرنے میں کسی بھی طرح کی کوئی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سادگی اور قناعت پسندی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ان کے بقول اگر انسان کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے حالات وواقعات کے دائرہ کار میں رہ کر جینا سیکھنا چاہیے۔ ہمارے یہاں بہت سے اچھے دانشور موجود ہیں، لیکن مجھے جو چیز ڈاکٹر مبارک علی میں ممتاز کرتی ہے وہ ان کی اخلاقی معیارات اور قدریں ہیں۔ آج اخلاقیات کے سوال کو ہمارے اہل دانش نے محض مذہب کا مسئلہ سمجھ لیا ہے اور جب کبھی کوئی اخلاقی پہلو پر بات کرے تو اسے مذہبی ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر مبارک علی کے بقول اخلاقیات اور دیانت کے پہلو کے بغیر آپ کچھ بھی ٹھیک نہیں کر سکتے، کیونکہ معاشرے کو بنانے کے لیے جو بنیادی اصول درکار ہوتے ہیں ان سے انحراف کر کے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے علم کے فکری میدان میں جو عملاً آوارہ گردی کی ہے اس کی لاتعداد مثالیں ہمیں ان کی دونوں آپ بیتی میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ ایک اور اہم پہلو ڈاکٹر مبارک علی ہمارے ان اہل دانش میں سے نہیں جو مغرب سے بہت



زیادہ مرعوب ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب دونوں نظاموں کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکے ہیں اور کسی تعصب کے بغیر دونوں نظاموں کے اچھے اور برے پہلوؤں کو کھلے عام تسلیم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ میرے تعلق کا یہ سلسلہ جاری ہے اور ہمیشہ ان سے مل کر ایک انجانی سے خوشی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس احساس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اپنی کم علمی کے باعث میں ان خوش نصیبوں میں ہوں جو ڈاکٹر مبارک علی کی قربت سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا رویہ میرے ساتھ بہت شفیق کا ہے اور جب کبھی ان سے ڈانٹ بھی پڑی تو اس میں بھی محبت اور شفقت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ بڑے آدمی کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ عاجزی کے ساتھ اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ خوبی ڈاکٹر مبارک علی میں موجود ہے۔ میں اپنے آپ کو اس لحاظ سے بھی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میں ڈاکٹر مبارک علی کی شخصیت پر کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ ہمت اور حوصلہ بھی ڈاکٹر مبارک علی نے ہی دیا ہے، وگرنہ ان کے بارے میں کچھ لکھنا بہت مشکل ہوتا۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ میرا تعلق ہمیشہ برقرار رہے اور میں ان کی صحبت سے اور بہت کچھ سیکھ سکوں۔ اپنی بات ڈاکٹر مبارک علی کی اس تحریر پر ختم کرتا ہوں جو ان کی عظمت کی دلیل دیتی ہے۔ ان کے بقول ''میرا سرمایہ میری تحریریں ہیں۔ ان تحریروں کے پس منظر میں میری جدوجہد، اور میرا علم ہے۔ علم کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں تکمیل حاصل کر لی ہے کیونکہ بقول کارل پوپر My Knowledge Increase my Ignorance یعنی جتنا علم حاصل کیا جاتا ہے اسی قدر اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔''

# ڈاکٹر مبارک علی کا تاریخی کارنامہ

افضال ریحان

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی فرد ہو یا قوم، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ ہمیں ماضی سے نکل کر محض حال کی بات کرنی چاہئے، افراد کے لئے تو شاید اس کی کچھ گنجائش ہو، لیکن اقوام کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ یہ تینوں ادوار آپس میں گہرے مربوط اور باہم پیوست ہوتے ہیں۔ بہر حال زندہ اقوام کی یہ خوش بختی ہوتی ہے کہ وہ ماضی کے تجربات سے روشنی لیتے ہوئے اپنا حال اس طرح بہتر بناتی ہیں کہ نظر مستقبل کے ٹارگٹ پر رہتی ہے، جبکہ پسماندہ اقوام کی نظر ماضی کی طرف اور پیٹھ مستقبل کی جانب ہوتی ہے۔ وہ یا تو ماضی کے معاملات و مسائل پر الجھتی اور جھگڑتی رہتی ہیں یا اسے افسانوی رنگ دے کر اس پر اتراتی اور داد و تحسین کے ڈنکے بجاتی رہتی ہیں، جس کی آؤٹ پٹ سوائے قومی تفاخر کے اور نتیجتاً اقوام دیگر سے آویزش کے اور کچھ نہیں ہوتی۔

ایسی اقوام اپنی نئی نسلوں کے لئے تاریخ بناتی ہوں یا نہ بناتی ہوں، البتہ تاریخ بگاڑتی ضرور ہیں، جس میں حسب ذوق و ضرورت من پسند نمک مصالحے خوب لگائے جاتے ہیں۔ قومی ذوق کی مطابقت میں جو شخص اس مصالحے بازی کے فن میں زیادہ مہارت رکھتا ہے، وہ اس قوم کا بڑا محقق تسلیم کر لیا جاتا ہے اور جو حقائق کو حقائق مانتے ہوئے، اس ہیرا پھیری کی بجائے اصلیت سامنے لا کر اپنی قوم کو سچائی کے آئینے میں اصل چہرہ دکھاتا ہے، وہ ناپسندیدہ قابل ملامت قرار پاتا ہے۔ کسی کی خواہشات اور آرزوؤں سے حقائق بظاہر مسخ تو کئے جا سکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ اپنی جگہ موجود رہتے ہیں، جب بھی تاریخ کا کوئی محقق تحقیق کی بازی لگائے گا تو وہ انہیں حاضر موجود پائے گا۔ اگر جذباتیت سے ہٹ کر حقیقی کارکردگی کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو وطن عزیز میں اس نوع کا تاریخی محقق ہمیں ڈاکٹر مبارک علی کے نام کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، جنہوں نے تاریخ نگاری میں حقائق کو جانچنے کے لئے



سائنٹیفک اسلوب کو ہی اپنا رہنما اصول بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں تاریخ نویسی تین قسم کی روایات پر مبنی ہے، ایک وہ جو صوفیاء کے کشف و کرامات کے زیر اثر لکھی جاتی ہے، اس کے ابتدائی نمونے ہم ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں بھی دیکھتے ہیں، جب مریدوں نے اپنے مرشدوں کی تاریخ لکھی تو ہر کارنامہ ان سے منسوب کر دیا۔ محمود غزنوی شہاب الدین غوری اور بعد میں آنے والے سلاطین کی تمام فتوحات اس قسم کی تاریخ میں ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں...... ان تاریخوں میں خواب بھی ہیں، غیبی اشارے بھی ہیں اور پیروں کی روحانی طاقت و قوت کا اظہار بھی۔ دوسری قسم کی تاریخ وہ ہے جو داستانوں، افسانوں اور شاعری کی صورت میں ہے۔ اس میں شاعر و افسانہ نگار اپنے تخیل کی مدد سے حقائق کو افسانوی بنا کر لوگوں کے لئے دلکشی کا باعث بنا دیتے ہیں؛...... اس میتھ میں اس قدر جاذبیت ہوتی ہے کہ لوگ اصل حقائق کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے ہیں۔ تاریخ کی تیسری قسم وہ ہے، جسے سائنس کہا جاتا ہے۔ اس میں اول واقعات کا تعین کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی شہادتیں اکٹھی کی جاتی ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا شہادت اس واقعہ سے کوئی مطابقت رکھتی ہے یا نہیں......"

پسماندہ معاشروں کی تاریخ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے، وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں: "پسماندہ معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ ان کے ہاں نظریات و افکار اور خیالات سے زیادہ شخصیات پر زور دیا جاتا ہے اور انہیں اس قدر مقدس و متبرک بنا لیا جاتا ہے کہ ان کا کہا ہوا ہر لفظ درست تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخصیت اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے نام سے منسوب کر کے یا اس کے بیانات و خیالات کو مسخ کر کے سیاستدان اور رہنما اس سے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ یہی صورت پاکستان میں قائداعظم کی ہے، جنہیں دائیں اور بائیں بازو کے لوگ اپنے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ دونوں ان کی تقریروں اور بیانات سے اپنے مطلب کی باتیں ڈھونڈ لاتے ہیں، جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ شخصیت سے علیحدہ ہو کر نظریات و افکار کی بنیاد پر لوگوں کے ذہنوں کو بدلا جائے، کیونکہ شخصیت ایک عہد اور وقت کی پیداوار ہوتی ہے، جبکہ زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ نظریات و افکار بھی وقت کے تقاضوں کے

تحت تشکیل پاتے رہتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخصیت معاشرے کے ذہن و دماغ پر چھا جائے تو پھر نئے خیالات تخلیق نہیں ہوتے اور معاشرہ محض تقلید کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔"

ہمیں ڈاکٹر صاحب کے متذکرہ بالا نتیجہ فکر سے اس وجہ سے بھی اتفاق ہے کہ ہمارے سماج میں شخصیات کے بت بنانے کی ریت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک بت اگر پرانا ہو کر ذرا فاصلہ پکڑتا ہے تو بہت سی دیگر "ہستیاں" اس انتظار میں بیٹھی ہوتی ہیں، بلکہ ان کی زندگی بھر کی کاوشوں کا محور ہی یہ اپروچ رہتی ہے کہ انہیں بھی قوم میں ایک بڑے بت کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اپنی شخصیت بنانے اور منوانے کا داعیہ و چسکا یہاں نظریے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ان دیکھی الوہی وحدت کے دعویداروں نے بت تراشی کے فن میں ہر قوم کو مات دے دی ہے۔

مغرب کی ترقی پر ہزار تنقیدوں کے باوجود کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی سوسائٹی سے ایسے ہر بت کو پاش پاش کر دیا ہے، اپنی پوری تاریخ میں کوئی بھی شخصیت تنقید سے بالاتر نہیں رہنے دی، حتیٰ کہ Jesus Christ جیسی ہستی کی الوہیت کو بھی کھلے عام چیلنج کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ شخصیات کا احترام اپنی جگہ، لیکن تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے وہ کچھ کہا جاتا ہے، جس کا ہمارے ہاں تصور کرتے ہوئے بھی روح کانپنے لگتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وحدت کا سب سے بڑا نچارک اس وقت مغرب بن چکا ہے جو کسی الوہی شخصیت کا عکس انسانی وحدت کی صورت میں سامنے لا رہا ہے، اگرچہ ہنوز اس کے اہداف محدود ہیں، لیکن آزادیٔ اظہار اور حرمت فکر نے نظریاتی اذہان سے شخصی بتوں کا صفایا کرتے ہوئے عظمت انسانی کا لوہا منوا لیا ہے، جبکہ اپنی حالت یہ ہے کہ ہم آج بھی تاریخ کے پیروکار ہیں، تم تاریخ کی فلاں بڑی ہستی کے دشمن ہو، اس لئے میں تمہارا دشمن ہوں، تمہیں برداشت نہیں کر سکتا، تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم "جمل" اور "صفین" کے معرکے آج بھی اپنی مساجد اور امام بارگاہوں میں لڑ رہے ہیں۔ گزرے ہوئے مختلف کرداروں کے لئے زندہ انسانوں کو مار رہے ہیں۔ مظلوم دکھی عورتوں کو بیوگی اور معصوم بچوں کو یتیمی بانٹ رہے ہیں یا پھر مخصوص ادوار کے نظریات کو بزور منوانے کے لئے پوری دنیا کا سکون برباد کئے ہوئے ہیں۔

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو ہمیں موجودہ تمام فتنوں اور فسادات کی جڑیں ماضی کی اس تاریخ میں ملیں گی، جو ہم نے اپنے مخصوص مقاصد کے تحت بڑی افسانوی بنا رکھی ہے، جس پر کئی ناول و افسانہ نگاروں، عالمی ذاکروں اور قومی شاعروں نے جذباتیت کے تہہ در تہہ چڑھا رکھے ہیں اور مرچ مصالحے سے حقائق کو کیا سے کیا بنا رکھا ہے اور اقوام دیگر کے خلاف نفرتوں کے طوفان اٹھا رکھے ہیں۔



اگر آج بھی ہم اپنے بچوں کو یہ پڑھائیں گے کہ مہاتما گاندھی مکار تھا اور ہندو بحیثیت قوم دھوکے باز، تو پھر اپنی نئی نسلوں کو کون سی رواداری و انسان نوازی سکھا رہے ہوں گے؟ اور یہ تاریخ کی کون سی خدمت ہے؟ ظاہر ہے جب کسی خطے میں دو مخصوص اقوام کے مفادات کا حریفانہ ٹکراؤ ہوگا تو اس میں اپنی اپنی بہتری کے لئے سیاسی چالیں بھی چلی جائیں گی۔ خود مسلمانوں کے اندر عربوں اور ترکوں یا عربوں اور عجمیوں (ایرانیوں) کے درمیان کیا کچھ نہیں ہوا؟ تو کیا دوسری قوم کو ابدی طور پر دھوکے باز قرار دے دیا جائے، جبکہ نہلے، دہلے تو ہر قوم میں ہر وقت موجود ہوتے ہیں اور روادار انسانوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ کیا مہاتما گاندھی وہی ہندو رہنما نہیں ہیں، جنہوں نے پاکستان اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دی، اس کے باوجود ہمارے بچوں کو یہاں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ گاندھی جی مکار تھے، بلکہ "جی" لکھنا بھی ہماری طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔ اس اصول پر دنیا بھر کی باہم حریف اقوام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو کر ہمارے سامنے آئے گی کہ محض سیاسی و مذہبی مفادات و اختلافات کے کارن اکثر و بیشتر تاریخ کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فلسطینی بچوں کو پہلی کلاس سے ہی جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، اس کے مطابق یہودی دنیا کی ذلیل ترین اور خداوند کی ہمیشہ کے لئے مغضوب قوم ہیں۔ پہلے دن سے جن کے کھاتے میں نیکی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

جب تاریخ کی کتابوں کو اپنے مخصوص مقاصد کے رنگ میں رنگتے ہوئے اپنے بچوں کے معصوم ذہنوں میں اتارا جائے گا تو وہ اذہان بھی کبھی نارمل انداز میں بالمقابل قوم کی خوبیوں اور خامیوں کا سائنٹیفک جائزہ نہیں لے سکیں گے۔ بلاشبہ یہ عمل دوطرفہ ہے، بالمقابل بھی یہی کارنامے سرانجام دیئے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً امریکہ جیسی طاقت کا اقوام عالم کی معاونت میں دیا ہوا روڈ میپ بھی سپیڈ پکڑنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور بزور کروائی گئی، ایسی کسی کامیابی کے بعد آگے چل کر یہ ابدی نفرت نامعلوم کون سا روپ دھار لے گی؟...... لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم تاریخ کو مسخ کرنا چھوڑ دیں۔ ہر قوم کے ساتھ جہاں ماضی کی تلخیاں ہوتی ہیں، وہاں کچھ شیرینیاں بھی ہوتی ہیں، کچھ امن کے معاہدے اور دوستی کے وعدے بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں ہمہ وقت گندی مکھی کی بجائے کبھی شہد کی مکھی جیسا طرز عمل بھی اپنا کر دیکھ لینا چاہئے۔ اس سے آؤٹ پٹ خود بخود میٹھی ہو جائے گی۔ پھر ہر وقت ماضی میں جھانکنے کی بجائے کبھی مستقبل کی جانب بھی اپنی منزل تلاش کرنے کے لئے دیکھنا چاہئے کیونکہ منزل ماضی میں نہیں، ہمیشہ مستقبل میں ہوتی ہے۔ ہماری نظر میں ڈاکٹر

مبارک علی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جنوبی ایشیاء کی تاریخ کو بگاڑنے یا سنوارنے کی بجائے، جیسی وہ ہے بلاکم وکاست، بغیر کسی قطع و برید، کاٹ چھانٹ یا ملمع کاری کے نئی نسلوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس خطے کی تاریخ کو مسخ ہونے سے بچایا ہے اور ہماری یہ آرزو ہے کہ وہ مختلف متنوع ادوار کی اسلامی تاریخ کو بھی اسی اسلوب اور نقطہ نظر کے ساتھ نوجوان نسلوں کے سامنے لائیں۔ موجود تو سب کچھ ہے، اصل مسئلہ خالص اور نایاب موتیوں کو کھنگال کر اپنی اصلی حالت میں سامنے لانا ہے۔

مجھے ان کے اس نقطہ نظر سے بھی پوری طرح اتفاق ہے کہ ہم نے قائداعظمؒ کی شخصیت کو بھی اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر تحریف کے زور سے مسخ کر کے قوم کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسے معلوم نہیں کہ قائد انگریزی زبان بولتے تھے، انگریزی لباس پہنتے تھے، مغربی اطوار واسلوب رکھتے تھے اور روایتی معنوں میں کوئی مذہبی شخصیت نہ تھے لیکن ہم اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گویا وہ سوتے بھی شیروانی میں تھے اور ان کے ماتھے پر ہی نہیں مصلے پر بھی محراب پڑ گئی تھی۔ قائد تو اتنے سچے اور کھرے انسان تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی سیاسی مفادات کے لئے بھی پارسائی کے دعوے نہیں کئے۔ قائداعظم کے متعلق یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپوزیشن کو قطعی برداشت نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کے اردگرد جو لوگ تھے، وہ ان کے رعب میں رہتے ہوئے اکثر خاموشی ہی اختیار کرتے تھے۔

اسی وجہ سے پاکستان بننے کے بعد ہر ایک نے یہی کہا کہ پاکستان محض ان کی ذہانت اور وکالت کی بناء پر بنا۔ پاکستان بننے کے بعد جب وہ گورنر جنرل بنے تو انہوں نے اس کا صاف طور پر اظہار کیا کہ وہ برائے نام گورنر جنرل نہیں رہنا چاہتے، اس لئے 1935ء کے ایکٹ میں تبدیلی کر کے ان کے اختیارات کو وسیع کیا گیا اور انہی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے سرحد کی صوبائی حکومت کو توڑا اور ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اسی کے تحت سندھ میں کھوڑو کو چیف منسٹری سے معزول کر دیا۔ وہ گورنر جنرل بھی تھے اور دستور ساز اسمبلی کے صدر اور مسلم لیگ کے سربراہ بھی...... کچھ لوگوں نے تو انہیں ”شہنشاہ پاکستان“ کہنا بھی شروع کر دیا تھا اور کراچی میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور انہیں امیر المومنین کا خطاب دیا گیا۔

ہم ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹر صفدر محمود سے ہونے والی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ قائد نے یہ کہا تھا یا نہیں کہ ”پاکستان انہوں نے اور ان کے ٹائپ رائٹر نے بنایا تھا“ یا یہ کہ ”ان کی جیب میں چند



کھوٹے سکے ہیں۔“ علمی نقطہ نظر سے دونوں صاحبان نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے قومی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص اس بحث کو پڑھ سکتا ہے، البتہ عوامی سطح پر ہم نے ان دونوں فقروں کو زبان زد عام وخاص پایا ہے، بالخصوص ایوان کارکنان تحریک پاکستان کی مختلف تقاریب میں ہم نے تحریک پاکستان کے جن کارکنان کو بھی سنا ہے، وہ اپنے خطاب میں ان ہر دو فقروں کا استعمال بہتات کے ساتھ کرتے رہے ہیں، لیکن یہ کوئی کارآمد موضوع نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ شخصیات کو مسخ کرنے کی بجائے واقعات وحقائق کے تناظر میں پرکھا اور سمجھا جائے اور شخصیات سے زیادہ نظریات پر غور فرمایا جائے۔

نوٹ: افضال ریحان صاحب نے ڈاکٹر مبارک علی کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اور تاریخ کے بارے میں جو اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے، اس میں کئی نکتے ایسے ہیں جنہیں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ قائداعظم کی شخصیت کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بھی تاریخی حقائق سے لگا نہیں کھاتا۔ افضال ریحان صاحب نے جو بھی لکھا ہے، اسے خلط مبحث کی مثال ہی کہا جائے گا۔ اس بارے میں انشاء اللہ جلد میں اپنی معروضات بھی پیش کروں گا۔ (ایڈیٹر)

# ڈاکٹر مبارک علی — تاریخی دنیا کا درویش

امرناتھ موٹومل ایڈووکیٹ
وائس چیئر پرسن ایچ آر سی پی سندھ

میں ڈاکٹر صاحب کو درویش نہ کہوں تو کیا صرف تاریخ دان کہوں۔ جو شخص نا صرف ایشیا کی تاریخ لیکن ساتھ میں یورپ اور باقی دنیا کی تاریخی معلومات کا بے بہا خزانہ اپنے سینے میں سموئے ایک پھل دار درخت کی طرح بڑے ہی پیارے جھکاؤ کے ساتھ چل رہا ہو، وہ ایک درویش ہی ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے نام نہاد اسکالر دیکھے لیکن ڈاکٹر جیسا تاریخ دان اور ادب کی جانکاری رکھنے والا نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا شرف مجھے میرے دوست سیّد شمس الدین کے ذریعے حاصل ہوا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بڑے دھیمے اور رکھ رکھاؤ والے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ جو بھی تاریخی بات کی بڑی مدلل، صداقت اور حقیقت سے بھرپور تھی۔ پہلے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب کے ڈان میں چھپنے والے مضامین کو بڑے غور سے مطالعہ کیا جب میں نے ڈاکٹر صاحب کی روزنامہ ڈان میں پاسٹ اینڈ پریزنٹ کالم کے تحت مختلف عنوانوں سے آرٹیکلز پڑھے تو اُن کی تاریخی اور ادبی معلومات کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ 16 اپریل 2008ء کے آرٹیکل ''Why we need heroes?'' (ہمیں ہیروز کی کیوں ضرورت ہے؟)، 28 جون 2009ء کے آرٹیکل ''Shades of Violence''، 23 ستمبر 2009ء کے آرٹیکل ''دی سلاطین''، 30 دسمبر 2012ء کے آرٹیکل ''Conflict and Change'' جیسے آرٹیکل پڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی تاریخی اور ادبی معلومات کی گہرائی اور جانکاری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ دل تو چاہتا ہے ڈاکٹر صاحب کے ہر آرٹیکل کے اوپر ایک وسیع تبصرہ کروں اور صدقِ دل سے اُن کے تاریخی اور ادبی معلومات کی گہرائی کو سر آنکھوں پر رکھوں، لیکن میں یہاں پر صرف 2 آرٹیکل پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایک تو آرٹیکل ''چرچل سیڈ، نالج از پاور'' چرچل کی کہی ہوئی باتیں اور نالج کے پھیلاؤ کا



دھیما پن جن حسین لفظوں میں ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے، میں نہیں سمجھتا اس سے بہتر انداز میں کوئی کر سکتا ہے۔ اپنے اظہار کو محدود کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے متعلق اور لکھی ہوئی کتابوں کے متعلق یا کہی ہوئی باتوں کے متعلق بھی کچھ کہنے کو دل چاہتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی ہندوستان کے علاقے راجستھان کے شہر ٹونک میں پیدا ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان منتقل ہوئے۔ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم انہوں نے حیدرآباد میں ہی حاصل کی۔ 1976ء میں انہوں نے جرمنی سے PHD کی ڈگری حاصل کی اُن کا موضوع مغل دور کا ہندوستان تھا۔ وہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ تاریخ کے سربراہ بھی رہے۔ بعد ازاں وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ جہاں 1995ء تک گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر رہے۔ ڈاکٹر مبارک علی 70 سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کا شمار پاکستان کے ان مورخین اور محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے نا صرف پاکستان بلکہ برصغیر کی تاریخ کو مسخ کرنے کے اسباب کو تحریروں کے ذریعے اُجاگر کیا۔ اُن کی تحریریں پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حکمرانوں نے اپنی حکومتوں کو طول دینے کے لئے کس طرح تاریخی حقائق کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اب ان حکمرانوں کا تعلق دورِ قدیم سے ہو یا دورِ جدید سے اُن کا مطمع نظر ایک ہی تھا اپنے اقتدار کو کس طرح مضبوط بنایا جائے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے پاکستان کی درسی کتابوں میں تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کے حوالے سے شدید تنقید کی ہے اُن کا کہنا ہے کہ پاکستانی درسی کتب میں ہیروازم کو فروغ دیا گیا جس کے ذریعے اُن مسلمان حکمرانوں کو جو صرف حکمران تھے اور اُن کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا کو بہت بڑے مذہبی مفکرین کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ مسلمان حکمران ہندو امراء سے بھی بہت اچھے تعلقات رکھتے تھے اور انہیں جاگیریں اور مراعات عطا کرتے تھے، تاکہ اُن کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ انہوں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے پاکستان اور ہندوستان میں تاریخ کی کتابوں کے ذریعے ہندو مسلم نفرت کو فروغ دینے کی کوششیں متواتر جاری ہیں۔ دونوں ملکوں کی درسی کتابوں میں ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت تاریخ کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جو نظام ظلم استبداد اور آمریت کی بنیاد پر موجود ہو اس میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کو اپنے مفاد میں کس طرح استعمال کیا جائے۔

2007ء میں اپنی کتاب قدیم ہندوستان کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی درسی کتب میں اشوکِ اعظم کا کوئی ذکر نہیں ہے دراصل پاکستان اور ہندوستان یا ہندو

اور مسلمانوں کے درمیان نفرتوں کے بیج برطانوی استعمار کی جانب سے بوئے گئے تھے۔

ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں میں تبدیلی کا آغاز 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہوا جب مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ بعدازاں فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے اس میں مزید اضافے کئے اور پاکستانی بچوں کو یہ پڑھایا جانے لگا کہ پاکستان مذہب کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ غالباً پاکستان میں دوسرے مذاہب کے بارے میں نفرت اور عدم برداشت کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ اور نصابی کتب'' میں لکھتے ہیں:

> ''کہا جاتا ہے کہ علم طاقت ہے اسی وجہ سے ریاست کوشش کرتی ہے کہ علم پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے اس کے ذریعہ معاشرہ کو کنٹرول کیا جائے۔ یہ سرکاری علم خاص طور پر نصاب کی کتابوں کے ذریعہ نوجوان نسل کے ذہنوں کو تبدیل کرنے اور انہیں ریاستی نظریات کے تحت ڈھالنے میں استعمال کیا جاتا ہے اگر ریاست نظریاتی ہوتی ہے تو اس صورت میں سرکاری اور ریاستی علم کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے اور اس علم کے ذریعہ ریاست معاشرے کے ذہن کو یکساں سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جمہوری معاشروں میں ریاست کے اس علم اور اس کے نظریات کو سیاسی، سماجی اور مذہبی گروہ چیلنج کرتے ہیں اور عوامی دباؤ کے تحت ریاست کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نصاب کی کتابوں کو ان کے نظریات کے تحت تبدیل کرے۔ اگر ریاست جمہوری نہ ہو اور نظریاتی ہو تو اس صورت میں ترقی پسند تحریکوں کا اثر کم ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی تحریروں میں بارہا اقلیتوں کی پاکستان میں موجودہ صورتحال کا ذکر کیا ہے اور اس بات کا تجزیہ بھی کیا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی وجوہات کیا ہیں اپنی کتاب ''تاریخ کیا کہتی ہے'' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''آخر اقلیتوں کو قومی دھارے اور قومی تاریخ سے کیوں نکالا جا رہا ہے اس کی وجوہات کیا ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ کسی نئے ملک کی تشکیل نہیں بلکہ فتح تھی اور جس طرح فاتح افواج ملک کی فتح کے بعد خود کو اس کا حقدار سمجھنے لگتی ہیں اور اس ملک کی مال و دولت کو مال غنیمت



> سمجھ کر اس کی لوٹ مار میں مصروف ہو جاتی ہیں یہی کچھ ہمارے ملک میں ہوا۔
> تحریک آزادی کے کارکنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس ملک کے ذرائع کو کم سے کم کر دیا۔ اب ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ خود کو تحریک آزادی کا کارکن ثابت کرے اور اس کے معاوضہ میں ملک کے ذرائع کو لوٹے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں محب وطن اور غدار وطن کی اصطلاحات اس قدر عام ہیں اور جو بھی اقتدار میں ہوتا ہے وہ مخالفین کو غدار قرار دے کر لوٹ کھسوٹ کے سارے حقوق اپنے لئے محفوظ کر لیتا ہے۔''

پاکستان کا اس وقت ایک بہت بڑا مسئلہ ملک میں جاری دہشت گردی کی لہر ہے جس میں اب تک چالیس ہزار (40,000) سے زائد افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ دہشت گردی کی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''گمشدہ تاریخ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''دہشت گردی کی ایک شکل وہ ہے کہ جس میں فرقہ وارانہ اور سیاسی جماعتیں ملوث ہوتی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تشدد کے واقعات کے ذریعہ حکومت کو کمزور کریں تاکہ عوام میں یہ تاثر ہو کہ حکومت ان کے تحفظ میں ناکام ہو گئی ہے۔ ان کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ یہ دہشت گردی کے اقدامات عوامی جگہوں پر کرتے ہیں۔ مثلاً بسوں میں یا مارکیٹ میں بموں کے دھماکے کرنا، ریلوے پٹڑیوں کو اکھاڑنا، یا ریل گاڑی میں بم رکھ کر اسے اڑا دینا، عام طور سے اس قسم کے واقعات غریبوں کی آبادیوں، منڈیوں، یا بس اڈوں پر ہوتے ہیں جن میں مرنے والے غریب لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سے خوف و دہشت تو پھیلتی ہے مگر بہت زیادہ شور نہیں مچتا ہے اور نہ احتجاج ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو ان حادثات سے حکومت کے اعتماد پر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ اخباروں میں بیانات آجاتے ہیں، وارننگ دے دی جاتی ہے اور پھر ہر چیز کو بھلا دیا جاتا ہے۔''

مسلمانوں میں فرقہ بندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے بارے میں ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ برطانوی دورِ حکومت میں سیاسی آزادیوں کا نا ہونا تھا کیوں کہ برطانوی حکومت سمجھتی تھی کہ اگر انہوں نے ہندوستان میں سیاسی آزادیوں کا آغاز کیا تو اس کے نتیجے میں اُن کی حکومت ختم

ہونے کے خدشات تھے اس کے برعکس انہوں نے مذہبی آزادیوں پر کوئی قدغن نہیں لگائی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندی کو فروغ حاصل ہوا اپنی کتاب ''تحقیق کے نئے رجحانات'' میں اس صورتحال کا تجزیہ انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں سیاسی حالات کے پیشِ نظر اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ مسلمان معاشرہ میں مذہبی فرقوں اور صوفیاء کے سلسلوں کے اختلافات کو ختم کر کے یا گھٹا کر انہیں باہم ملایا جائے لیکن کولونیل دور میں کہ جہاں سیاسی آزادی تو نہ تھی، مگر مذہبی آزادی تھی، وہاں مسلمانوں کے فرقوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کو علیحدہ کر کے صرف اپنی بالادستی قائم کی جائے۔ اس سلسلہ میں بعض فرقے اس حد تک گئے کہ انہوں نے اپنے مخالفین کو گمراہ، اور کافر تک قرار دے دیا۔ چنانچہ ان اختلافات کو ہم دیوبندیوں، اہل حدیث، احمدیوں، تبلیغی جماعت کے پیروکاروں، اور بریلویوں میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام جماعتیں اور تحریکیں اسلامی تھیں اور انہوں نے اپنے خیالات و افکار کی تشہیر کے لئے تمام جدید ذرائع کو استعمال کیا جن میں چھاپے خانے، مدارس، مساجد، مزار، فتوے اور اجتماعات شامل تھے۔ ایک خاص بات اس عہد کی یہ بھی ہے کہ ان میں اکثر فرقے اپنے فتووں کی تصدیق مکہ کے علماء سے کراتے تھے تاکہ ان کے فیصلوں میں وزن ہو جائے۔''

قائداعظم محمد علی جناح کی قیامِ پاکستان کے بعد 11 اگست کو ہونے والی پہلی قانون ساز اسمبلی میں کی جانے والی تقریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں ایک سیکولر پاکستان کا تصور تھا جس میں تمام مذاہب اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی مذہبی رسومات آزادی سے ادا کر سکتے تھے لیکن آخر وہ کیا وجوہات تھیں کہ قائداعظم کے انتقال کے بعد لیاقت علی خان مرحوم کو قراردادِ مقاصد اسمبلی میں پیش کر کے منظور کروانی پڑی۔ اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ اور آج کی دنیا'' میں لکھتے ہیں کہ

''جب مسلم لیگ اور اس کے راہنماؤں نے ایک علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا تو اس کی زبردست مخالفت کرنے والوں میں مذہبی جماعتیں تھیں، جن میں جمعیت علمائے ہند، جماعت اسلامی اور احرار قابل ذکر ہیں۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ مسلم



لیگ کے راہنما مغربی تعلیم یافتہ ہیں، ان کی مذہبی معلومات بہت محدود ہیں، اس لئے وہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کی راہنمائی کریں اور ان کے لئے ایک علیحدہ ملک کا مطالبہ کریں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ حق صرف علماء کو ہے کہ وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کی راہنمائی کریں۔ لیکن جب 1947ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا تو جمعیت علمائے ہند تو ہندوستان میں رہی مگر جماعت اسلامی کہ جس کا ہیڈ کوارٹر پٹھان کوٹ میں تھا، وہ فوراً پاکستان چلی آئی اور لاہور میں اپنا صدر مقام قائم کر لیا، تاکہ نئے بننے والے ملک کو اسلامی بنانے کی جدوجہد کی جائے۔ مجلس احرار کہ جس کے اکثر راہنماؤں کا تعلق پنجاب سے تھا، انہوں نے اپنی توجہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے میں کر دی۔ اس طرح پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی وہ مذہبی اور سیاسی جماعت تھی کہ جس نے عملی طور پر پاکستان کی سیاست میں حصہ لیا، اور ابتداء ہی سے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ پاکستان کے دستور کو اسلام کی روشنی میں تیار کیا جائے۔

ان حالات میں لیاقت علی خان (وفات 1951ء) نے یہ فیصلہ کیا کہ علماء کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ریاست مذہب استعمال کرے تاکہ مذہبی راہنمائی کے لئے عوام علماء کے بجائے ریاست کی جانب دیکھیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوستان سے بھی اہم علماء کو دعوت دی جن میں سیّد سلیمان ندوی اور پروفیسر حمید اللہ قابل ذکر ہیں کہ یہ ایک ایسا دستور بنائیں جو کہ پاکستان کے لئے مناسب ہو۔ ان علماء کے مشوروں اور بحث ومباحثہ کے بعد تو دستور تو نہیں بنایا جا سکا لیکن ''قرارداد مقاصد'' کے نام سے ایک دستاویز ضرور تیار ہوئی جسے 1949ء میں دستور ساز اسمبلی نے منظور کر لیا۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا کہ اقتدار اعلیٰ خدا کے پاس ہے اور کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ آگے چل کر قرارداد مقاصد نے پاکستان کی دستور سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کے تینوں دساتیر میں، اسے ''اسلامی ریپبلک'' کہا گیا اور ان میں کئی مذہبی دفعات کو شامل کیا گیا، ضیاء الحق کے دور حکومت میں، قرارداد مقاصد کو 1973ء کے دستور کا ایک حصہ بنا لیا گیا۔''

غرض کہ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی تحریروں کے ذریعے نا صرف تاریخی حقائق کا سائنسی تجزیہ کیا ہے بلکہ اُن کی جمہوریت اور روشن خیالی کے ساتھ وابستگی بھی اُن کی تحریروں سے عیاں ہے ایک وقت وہ بھی تھا کہ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتابیں خود بٹر پیپر پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر چھپواتے تھے کیوں کہ کوئی ناشر ان کی کتابیں چھاپنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آج اُن کی 70 سے زائد کتابیں ملک کے ہر چھوٹے بڑے بک اسٹال پر باآسانی دستیاب ہیں اور ان کتابوں سے تاریخ کے طالبعلموں کے علاوہ سیاسی کارکن روشن خیال اور انسانی حقوق کے علم بردار استفادہ کرتے ہیں۔



# ڈاکٹر مبارک علی......سماجی علوم اور تاریخ نویس

رؤف نظامانی

کسی بھی سماج میں سماجی علوم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ نہ صرف ایک ایسی اساس فراہم کرتے ہیں جس پر سماج اور اس کے اداروں کی تعمیر ہوتی ہے بلکہ ان اداروں کو چلانے اور سدھارنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ فطری علوم کو بڑھاوا دینے میں بھی لوگ متحرک کارکردار ادا کرتی ہیں۔ سماجی علوم سماج کے اداروں، نظریات، خیالات اور عقائد کے متعلق مختلف سوالات کو جنم دیتے ہیں جن کی تحقیق اور جوابات کی تلاش فطری علو مکے ذمہ آتی ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ جس سماج میں سماجی علوم پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور ان کی ترقی و ترویج پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی وہاں نہ صرف فطری علوم زوال پذیر ہوتے ہیں بلکہ مجموعی طور پر پورا سماج جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے تعلیمی نظام میں سماجی علوم کو ثانوی بلکہ اس سے بھی کم ترحیثیت دی جاتی ہے۔ اکثر ایسے طلباء ان مضامین کا انتخاب کرتے ہیں جن کے لیے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فطری علوم پڑھنے کے اہل نہیں ہیں اور بس چھوٹی موٹی نوکری کر کے اپنے خاندان کا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خاص طور پر ملک کے حکمران طبقے اس کی نہ صرف یہ کہ ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لحاظ سے ملک کے سارے امور طے شدہ ہیں اور نظریات، معاشی اور سیاسی لحاظ سے کسی بھی تبدیلی کی ضرورت تو کجا اس متعلق سوال اٹھانے اور بات کرنے کو بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اسی وجہ سے تعلیمی اداروں اور جامعات میں کرپشن اقربا پروری اور پیسوں کے عوض ڈگریوں کا حصول تو ایک معمول ہے اور اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ تحقیق اور عالموں کی تربیت کا عمل ہے۔ یہ صرف سماجی علوم تک محدود نہیں ہے بلکہ اس نے پورے تعلیمی نظام کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔

سماجی علوم کے حوالے سے بھی جن علوم کو اور بھی کم ترحیثیت دی گئی ہے ان میں تاریخ کا علم

سرفہرست ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں روزگار حاصل کرنے کے امکانات محدود ہوتے ہیں جو کہ تعلیمی نظام کا بنیادی خاتمہ ہے۔تاریخ صرف ماضی کا علم نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو کہ حال کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔سماج کے نظریاتی ڈھیانچے میں تاریخ کا کلیدی کردار ہے۔تاریخ اور تاریخ داں کا کردار غیر جانبدار نہیں ہوتا۔واقعات کی تشریح، ہیروز اور ولین کی ترتیب اس طرح کی جاتی ہے جو کہ ریاست پر قابض طبقات کے نظریات کو صحیح اور جائز ثابت کر سکے۔نصابی کتب اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں جس طرح کی تاریخ پڑھائی جاتی رہی ہے اس نے کئی نسلوں کے ذہن کو اس طرح خراب کر دیا ہے کہ اگر اس وقت کوئی اسے رد کرے یا اس کے متعلق سوالات اٹھائے تو اسکا کیرئیر روزگار اور یہاں تک کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑھ جاتی ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود بھی سوالات اٹھتے رہے ہیں۔سیاسیات اور معاشیات وغیرہ کی طرح تاریخ سمیت دوسرے سماجی علوم میں بھی ایسے سر بمہر سوالات اور تجاویز کے ساتھ آتے رہے ہیں جنہیں اس بات کا اندازہ پہلے سے تھا کہ اس طرح سے وہ اپنا سب کچھ ہی داؤ پر لگا رہے ہیں۔انفرادی کاوشوں کے ساتھ یہ لوگ اس بات کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے کہ ملک میں ایسے اداروں کا قیام ضروری ہے جہاں نہ صرف سائنسی بنیادوں پر ملک ان علوم کی ترویج ہو سکے بلکہ ایسے ماہرین کی تربیت بھی ہو جو تحقیق میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ملک میں ایسے ماہرین کی کمی کا اندازہ ڈاکٹر مبارک علی کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ملک کی جامعات میں تاریخ پڑھانے والے استاد تو موجود ہیں لیکن کوئی تاریخ داں نہیں ہیں۔اس طرح ملک کی جامعات میں جس طرح کی صوررت حال ہے اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جاستکا ہے کہ جامعہ پنجاب انہیں اپنے یہاں استاد رکھنے کے لیے اس لیے تیار نہیں ہے کہ وہ ان کے نظریات سے متفق نہیں ہیں۔ایسے متبادل اداروں کے قیام کا ایک خواب ڈاکٹر اقبال احمد نے اسلام آباد میں ابن خلدون یونیورسٹی کے قیام کی صورت میں دیکھا لیکن وہ زندگی سے وفا نہ کر سکنے کی وجہ سے اسے پورا نہ کر سکے جبکہ دوسرا خواب ڈاکٹر مبارک علی کا لاہور میں سماجی علوم کے کالج کا قیام ہے۔اس وقت وسائل کے علاوہ ایسے ادروں کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ملک کی نظریاتی اور سیاسی صورت حال ہے۔سماج میں انتہا پسندی، جنون اور عدم برداشت گمراہیوں تک پیوست ہو گئے ہیں۔سوالات، اختلاف اور شک کا اظہار ممنوع اور قبل تعذیر جرم قرار پائے ہیں۔اس صورت حال کا اندازہ ملک کی جامعات میں ان استادوں کی حالت زار سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو کہ



اختلافی مباحث تو کجا صرف اپنے آپ کو علمی مسائل تک محدود رکھتے ہیں۔نہ صرف طلباء بلکہ ساتھی اساتذہ کی جانب سے ہراساں کیا جانا اور دھمکیاں دینا بھی ایک معمول بن گیا ہے۔اس صورت حال میں جہاں اپنے نظریات کی برتری کو برقرار رکھنے اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے بجائے دلائل اور تاریخی حقائق کے طاقت کے استعمال کو جائز سمجھا جائے اور اپنے اصولوں پر کاربند رہنا اور ان کے لیے قربانی دینا کسی جہاد سے کم رہے۔یاد رہے کہ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں بھی ایسے ہی حالات تھے لیکن اب ایک واضح فرق یہ ہے کہ مخالف خیالات اور نظریات کو دبانا اور ختم کرنا صرف ریاست کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ایک لحاظ سے سماج کی مجموعی نفسیات کا حصہ بن گیا ہے۔ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ایسی سیاسی جماعتیں اور ادارے بھی کمزور حالت میں ہیں جو متبادل اور مخالف نظریات کے حامل افراد کے لیے ایک محافظ کا کردار ادا کرتے تھے۔ظاہر ہے یوں تو یہ صورت حال ایک سیاسی اور نظریاتی انقلاب کا تقاضا کرتی ہے لیکن اس کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بھی نہیں بیٹھا جاسکتا۔کچھ افراد سماج کی جانب یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں اپنا مقدور بھر حصہ ڈالا جائے۔

ڈاکٹر مبارک علی ایک تاریخ داں ہیں۔ان کی تعلیم و تربیت بھی تاریخ کے حوالے سے ہوئی ہے اور انہوں نے اپنی ساری عمر تاریخ کے علم کو پڑھانے اور اسے پھیلانے میں ہی گزاری ہے۔میرے علم کے مطابق نہ وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ رہے ہیں اور نہ ہی ان کا عملی سیاست سے کوئی تعلق رہا ہے۔پاکستان کی تاریخ کو تنقیدی اور سائنسی نکتہ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے والے چند ایک اور مورخ بھی ہیں لیکن مبارک علی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ میں عالموں کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے لکھتا ہوں۔یہ ایک لحاظ سے بہت ہی معصوم سی خواہش ہے لیکن تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حکمران طبقات کے لیے بالکل ہی ناقابل قبول ہے۔وید، گیتا، برہمنوں کے دور میں تو جانے کی ضرورت نہیں ہے جب مقدس کتابوں کے الفاظ نچلی ذات کے لوگوں کے کانوں میں پڑنے سے ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ گھول دیا جاتا تھا اس وقت پاکستان میں انگریزی جرائد اور اخبارات میں بہت ساری باتیں برداشت ہو جاتی ہیں لیکن اردو اور ملک کی دوسری قومی زبانوں میں وہی مواد قابل تعذیر قرار پاتا ہے۔مبارک علی کی چالیس سے زائد کتب ہیں جن میں سے کچھ انگریزی اور زیادہ تر اردو میں ہیں۔لکن وہ صرف یہاں تک ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کو نہ صرف بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے بلکہ حکمرانوں نے اپنے مفادات کو مدنظر رکھ کر اس کی تشریح کی ہے۔اس لیے ان کا کام لوگوں تک صحیح معلومات پہنچانا اور اس صحیح تشریح کرنا ہے۔جہاں تقلید ایک عقیدے کی صورت رکھتی ہو

وہاں اپنی آزادرائے کا اظہار ایک جرم اور گناہ بن جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا کسی ادارے میں ہونا بذات خود اس ادارے کے لیے اعزاز کا باعث ہوتا ہے اور وہ ادارے ان افراد کے حوالے سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس طرح مبارک علی کا سندھ یونیورسٹی کے تاریخ کے شعبے کا سربراہ ہونا یونیورسٹی اور تاریخ کے شعبے کے لیے اعزاز تھا۔ لیکن سندھ یونیورسٹی بھی ذاتی پسند، ناپسند، خوشامد اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے عمل میں اس حد تک آگے بڑھ گئی ہے کہ اس کے لیے علمی شخصیات کو ہضم کرنا اور ان کی قدر کرنا ایک ناممکن سی بات بن گئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ سماجی علوم کے عالم ڈاکٹر فیروز احمد جب وطن لوٹے تو انہیں سندھ یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی پیش کش کی گئی تھی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اسسٹنٹ پروفیسر ہونا قبول کیا تھا کہ وہ جہاں سے آرہے ہیں وہاں بھی وہ اسی حیثیت میں پڑھا رہے تھے اس لیے وہ کوئی ناجائز فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن وہ اس ماحول کو حصہ نہ بن سکے اور اپنے ساتھیوں اور افسران کی سازشوں سے تنگ آکر آخر کار انہیں یہ نوکری چھوڑنی پڑی۔ یہ کہانی مشہور سندھی لیکھک حلیم بروہی اور بہت سے دوسرے لوگوں کی بھی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ بھی یہی ہوا کیونکہ وہ نمک کی کان میں پڑ کر نمک بننے کے عادی نہیں تھے۔

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی ان کا تجربہ زیادہ خوش گوار نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شروعات میں جو ڈائریکٹر تھے ان کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار اور باہمی عزت واحترام پر مشتمل تھے۔ بعد میں آنے والے ڈائریکٹر کا رویہ ان کے ساتھ غیر مساویانہ تھا اور وہ ان کے ساتھ باس اور ماتحت والا رویہ رکھنا چاہتے تھے جو انہیں قبول نہیں تھا۔ اور انہوں نے صاف طور پر انہیں کہا تھا کہ ہم دونوں ساتھی اور کلیگ ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی باس اور ماتحت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مزید کہنا ہے کہ اپنے ملکوں میں تو یہ لوگ ایک مڈل کلاس کی زندگی گزارتے ہیں اور چھوٹے فلیٹوں میں رہتے ہیں اور اس طرح سے  ان کے رویے بھی ایک عام انسان کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جیسے ہی پاکستان جیسے ملکوں میں پہنچتے ہیں تو یہاں کے جاگیردارانہ کلچر کی چمک دمک، امراء کے ٹھاٹ بھاٹ افسران کی عیاشیاں اور سب سے بڑھ کر خوشامدی دانشور انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اس طرح ان کے رویے اور طور طریقے بھی وہیں ہو جاتے ہیں جو یہاں کے ایلیٹ کے ہوتے ہیں۔ اپنی عزت نفس کی قربانی نہ دینے کی بناء پر ڈاکٹر صاحب کو اپنے  عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس معاملے میں مدیحہ گوہر اور اجوکا تھیٹر کے لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مقامی دانشوروں میں سے وہ کسی کو موردالزام نہیں ٹھہراتے بلکہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ بہت سوں نے ان کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک



پر احتجاج اور مظاہرے بھی کیے لیکن ساتھ ساتھ انہیں یہ شکایت بھی ضرور ہے کہ ان دانشوروں نے بجائے اپنے موقف پر قائم رہنے کہ دوبارہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ ان کی یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ پاکستان کے دانشوروں کی اکثریت ذہنی لحاظ سے کرپٹ اور اپنے ذاتی مفادات کے پیچھے سرگرداں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے دوستوں کا  حلقہ ایسے لوگوں تک ہی محدود ہے جو ذہنی طور پر اس سے ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ پاکستان کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہے تا کہ یہاں کے لوگوں اور خاص طور پر نئی نسل کو صحیح حقائق سے آگاہ کیا جا سکے جو چیز آگے چل کر توہم پرستی، مذہبی منافرت اور فرقہ واریت وغیرہ ختم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ایسے تاریخ داں نہ ہونے کے برابر ہیں جو عربی اور فارسی زبانوں سے واقف ہوں۔ جو اور یجنل ماخذوں سے استفادہ کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں وہ تاریخ دانوں کی تربیت پر زور دیتے ہیں اور مختلف مواقع پر انہوں نے متعلقہ حقام کی توجہ بھی اس جانب دلائی ہے۔ مختلف حکومتوں نے نئے سرے سے تاریخ لکھنے کے لیے کمیٹیاں وغیرہ بھی تشکیل دی ہیں لیکن تاریخ دانوں کی تربیت کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسی کچھ کمیٹیوں میں ڈاکٹر صاحب کو بھی نامزد کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کا ہمیشہ سے یہ اعتراض رہا ہے کہ جب ان کمیٹیوں کے ارکان تاریخ دان ہی نہیں ہیں اور اصل ماخذوں تک پہنچانے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے تو وہ تاریخ کیسے لکھ سکتے ہیں۔

چاروں جانب گھپ اندھیرے کے باوجود اگر روشنی کی ایک کرن بھی ہے تو اندھیرا ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت ملک میں ہر جانب فرقہ واریت، دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی زوروں پر ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ یہ سماج کی جڑوں تک سرایت کر گئی ہیں۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر مبارک علی یقیناً ایک روشنی کی کرن اور ایسی امید ہیں جو بہت سوں کو اپنی منزل تک پہنچنے کا حوصلہ بخشتی ہیں۔ یہ بات صرف اس کے منفرد تاریخ دان ہونے جنہوں نے عوام کے لیے لکھنے کو ترجیح دی اور ایک متبادل اپروچ کو متعارف کرایا جو بات بھی یقیناً اپنی جگہ بہت اہم ہی نہیں ہے لیکن ان کے کردار کی مضبوطی اور کمٹ منٹ اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنی اہمیت تو ضرور رکھتی ہے۔ ایک مڈل کلاس کے فرد ہونے کی حیثیت سے اپنے موقف اور عزت نفس کی خاطر پر کشش عہدوں اور مختلف مواقع پر سرکاری پیش کشوں کو ٹھکرا دینا اور جوانمردی سے مالی مشکلات کو جھیلنا اور اپنے کام کو جاری رکھنا یقیناً ایک قابل ستائش بات ہے۔

# ڈاکٹر مبارک علی ــــ ایک مؤرخ، ایک ادارہ

حفیظ کنبھر

یہ 1986ء-1987ء کا زمانہ تھا جب ہم سندھ یونیورسٹی کے شعبہء انگریزی ادب کے طالب علم ہوا کرتے تھے۔ اختیاری مضمون کے طور پر ہم نے تاریخ کا مضمون اس لئے لیا ہوا تھا کہ یہ آسان مضمون ہے۔ امتحان میں نمبر بھی زیادہ مل جاتے ہیں۔ پڑھنے کی تکلیف بھی نہیں کرنی پڑتی......!

مطلب یہ کہ تعلیمی روایت کے مطابق ایک طالب علم کو اختیاری مضمون سے جو رویہ اختیار کرنا چاہئے تھا۔ وہ ہم نے پوری محنت سے اختیار کر رکھا تھا۔ البتہ فلاسافی کو اختیاری مضمون کے طور پر لینے کی غلطی ہمیں آج تک بمعہ مضمون سمجھ میں نہیں آئی۔

ان ہی دنوں ڈاکٹر مبارک علی صاحب شعبہء تاریخ کے چیئرمین تھے۔ کبھی کبھار ہم ان کے آفس میں چلے جاتے تھے۔ چونکہ ہمیں تاریخ کا مضمون پڑھانے والے اساتذہ تاریخ کو سماجی سائنس کے مضمون کے طور پر پڑھانے کی بجائے مذہبی نقطہء نظر سے تاریخ پڑھاتے ہوئے ثواب حاصل کرنے کا کام بھی کرتے رہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے خیالات سننے کے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ تاریخ کا مضمون ایسے نہیں ہے جیسے ہم نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ یا یہ کہ نہ اسے اتنا آسان سمجھنا چاہئے اور نہ اتنا خشک اور روکھا پھیکا، دلچسپی سے خالی مضمون ہے۔ اصل میں مسخ شدہ تاریخ کی کتابیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ ان کتابوں کو الٹا یا سیدھا کر کے پڑھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تاریخ کے مضمون کو بہت آسان یا بہت خشک کر کے پیش کرنے کے پیچھے تاریخ کو مسخ کر کے اس سے جان چھڑانے کا وہ ریاستی ارادہ تھا۔ جس پر ہمارے تعلیمی اداروں میں برسوں سے ایمانداری سے کام ہو رہا تھا اور اسی مستقل مزاجی سے یہ کام اب تک جاری ہے۔

خیر! ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی دو تحریریں ہمیں پڑھنے کا موقع ملا۔ ایک ''مغلیہ دورِ حکومت'' پر اور



دوسری ''کیا ناؤمل غدار تھا'' کے عنوان سے تھی۔

چونکہ ہمیں کبھی نہیں پڑھایا گیا تھا کہ بھوجوانی خاندان نے کراچی شہر کو جدید بنانے کے لئے کیا کاوشیں کی تھیں؟ کس طرح خان آف قلات سے یہ شہر واپس لے کر سندھ میں شامل کرنے میں ناؤمل نے کردار ادا کیا تھا؟ ناؤمل کا تصور ایک ایسے غدار کے طور پر ہمارے ذہن میں تھا جس کے مقابلہ میں ہمارے جیسے کند ذہن شخص کو کوئی ہیرو بھی نہیں مل رہا تھا۔ بس روایت تھی تاریخ کی یا نظریاتی سبب تھے جو اسے غدار بنائے جا رہے تھے، اور ہم قبول کرتے جا رہے تھے۔ ابھی تک ناؤمل کے والد کو جبری طور پر ہندو سے مسلمان بنانے کا واقعہ بھی علمی آنکھ سے اوجھل تھا۔ جس کے ردِعمل میں بھی ناؤمل نے انگریزوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب کہ بہت سارے جاگیرداروں نے انگریز حکومت کا ساتھ فقط اپنی جاگیروں کو تحفظ دلوانے کے لئے دیا تھا۔ نہ فقط اتنا بلکہ چارلس نیپئر کو اس وقت وہ فوجی امداد لشکر کی صورت میں دے رہے تھے جب نیپئر سندھ پر حملہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر مبارک علی صاحب کی اس تحریر نے سندھ میں اچھی خاصی بحث کا ماحول پیدا کیا۔ کئی نئے سوال ابھر کر سامنے آنے لگے۔ تاریخ میں وطن یا غدار کا تصور نئے سرے سے زیر بحث آنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب سندھ یونیورسٹی کو الوداع کر کے لاہور شفٹ ہو گئے۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی کو الوداع تو کیا کیا ــــ یوں سمجھیں کہ وہ خاموش رویوں سے نکالے گئے تھے۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنی آپ بیتی ''در در ٹھوکر کھائے'' میں کیا ہے ــــ طلبہ نے انہیں ڈرایا، دھمکایا، روایتی پروفیسروں نے نظر انداز کرنے کی کوششیں کی اور انتظامیہ نے کیا کچھ کہا وہ ــــ اس آپ بیتی میں محفوظ ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ایک سندھی بولنے والے فرد کی حیثیت سے میں ان سے معافی مانگوں ــــ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان تمام طالب علموں کی طرف سے معافی مانگوں جنہوں نے اس دور میں ڈاکٹر صاحب کو ذہنی اذیت پہنچائی ــــ وہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی حیثیت کو پہچان نہ سکے مگر دوسری طرف سندھ کے وہ نوجوان اور پڑھے لکھے طبقہ کے دوسرے لوگ بھی تھے جنہیں ڈاکٹر صاحب کی قدرشناسی کرنی تھی۔ اپنی علمی پیاس بجھائی تھی، اور جب ڈاکٹر صاحب کی کتابیں لاہور سے شائع ہو کر سندھ آنے لگیں تو ان کے قارئین میں سندھ کے سندھی بولنے والے نوجوانوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا۔ اس بات کے وہ خود بھی معترف ہیں، اور اس طرح سندھ کے نوجوانوں کے سامنے تاریخ کا ایک منفرد زاویہ اور پہلو آنے لگا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب تک سندھ کے نوجوانوں کو تاریخ پڑھائی نہیں گئی تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے جو سندھ میں، ملک میں، تاریخ کو نئے سرے سے متعارف کرانے کا بیڑہ اٹھایا

تھا تو اس میں بہت ساری نئی باتیں تھیں جو دلچسپ بھی تھیں، بلکہ وہ انکشاف بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے قارئین میں سے سندھ کے ایک حلقہ کو یہ دبی دبی سی شکایت بھی رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے برصغیر میں سندھ کے مقابلہ میں عہدِ مغلیہ پر زیادہ توجہ دی ہے وغیرہ۔ مگر یہ حضرات شاید اس حقیقت سے چشم پوشی کر جاتے ہیں کہ سندھ کی تاریخ کے حوالے سے جو بھی معیاری تحقیق ہوئی ہے اس میں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق صفِ اول میں ہی شامل ہے۔

لاہور سے ڈاکٹر صاحب نے سہ ماہی ''تاریخ'' کا اجراء کیا تھا۔ اس میں ''سندھ نمبر'' بھی شامل تھا جس میں سندھ کی تاریخ کے ماخذات کے حوالہ سے چچ نامہ، تحفۃ الکرام، تاریخ معصومی، تاریخ مظہر شاہجہانی کا جس طرح روایتی تاریخی وسماجی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے وہ آج تک کسی بھی محقق کے حصہ میں کم سے کم ان ماخذات کے حوالہ سے نہیں آیا ہے، اور عربوں کے نقطۂ نظر سے جو چچ نامہ لکھا گیا تھا ڈاکٹر صاحب نے اس کو حملہ آوروں کا وہ نقطۂ نظر ٹھہرایا تھا جس میں مفتوحین کی آواز دب کر رہ گئی تھی اور اس طرح ڈاکٹر صاحب نے گمشدہ تاریخ کے اوراق پر سے صدیوں کی چڑھی ہوئی خاک کو ہٹانے کی کوشش کی اور اس موقف کو ایک تاریخی سند فراہم کی ہے کہ عربوں کا سندھ پر حملہ کا پس منظر مذہب کو پھیلانا نہیں بلکہ وہ استعماری ذہن تھا جو اپنی تجارت کے لئے بحرِ عرب کے راستے محفوظ بنانا چاہتا تھا۔ تاریخ میں یہ بھی سوال اہم بن جاتا ہے کہ کیا کسی بھی مذہب کے پھیلانے کے لئے، کسی آزاد ملک وقوم پر حملہ جائز بنتا ہے یا نہیں؟ شاید تاریخ میں جائز و ناجائز کا تصور کچھ الگ ہے!! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تاریخ اخلاقیات سے ماوراء ہے!!

اسی شمارے میں ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی پاکستان سے پہلے کی معیشت وتجارت کے حوالے سے اور بھی بہت سارے مضامین شامل کئے تھے جو مستند محققین کے لکھے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے ''سندھ کی سماجی اور ثقافتی تاریخ'' کے زیرِ عنوان کتاب کی ترتیب وتدوین کا خوبصورت کام کیا۔ اس کتاب کے ماخذات میں سترہویں صدی سے انیسویں صدی کے یورپی سیاحوں کی ڈائریاں، تاثرات، مشاہدات ہیں اور تقریباً چار صدیوں کا سندھ ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں قارئین تک پہنچ جاتا ہے۔

سندھ کے حوالے سے ___ ''سندھ: خاموشی کی آواز'' کے عنوان کے تحت ان کی لکھی گئی کتاب میں سندھ کے سیاسی ولسانی پس منظر کے حوالہ سے تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور سندھ میں لسانی بنیادوں پر کی جانے والی سیاست کے علاوہ دوسرے ان سماجی عوامل کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو اس سندھ



کی ترقی وخوشحالی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ جس سندھ کو ڈاکٹر مبارک علی بارہا اپنی تحریروں اور تاثرات یا انٹرویوز میں ___ پاکستان بننے کے بعد ___ سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کرنے والا صوبہ کہتے ہیں، اور خاص طور پر سندھ کی ثقافتی تباہی کو درد کی آنکھ سے دیکھتے رہتے ہیں۔ روایتی تاریخ کے حوالے سے ہمارے ہاں ویسے بھی لوگوں میں سطحی تصورات پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تاریخ کو بادشاہوں یا حکمران طبقوں کی سرگرمیوں کا ریکارڈ ہی سمجھا گیا ہے۔ لیکن مورخ کی حیثیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب وہ تاریخ نویسی کے مرحلہ کے دوران تاریخ کے حوالہ سے سوالات اٹھائے، اور ان سوالات کے جوابات تحقیق کے حوالہ سے پیش بھی کرے یا وہ مفروضات جن کو سچ سمجھا گیا ہے ان کو مفروضات ثابت کر کے لوگوں کو حقائق کی طرف لانے کی کوشش کرے۔ میں یہاں ایک بار پھر سندھ پر عربوں کے حملہ کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لئے مثال پیش کرنا چاہوں گا کہ سندھ پر عربوں کے حملہ کی جو وجوہات بیان کی گئی ہیں یا جو وجوہات نصابی تاریخ میں درج ہیں اس میں ایک وجہ عرب تاجروں کے جہازوں کا بحرِ عرب میں قزاقوں کے ہاتوں لوٹنا بھی بتائی گئی ہے، اور ایک ایسی عورت کا کردار بھی سامنے لایا گیا تھا جو حجاج بن یوسف کو مدد کے لئے جذباتی انداز میں فریاد کرتی ہے اور حجاج بن یوسف اس عورت کو انصاف دلانے کے لئے آزاد سندھ پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس قسم کی باتیں نسیم حجازی کے ناولوں تک تو سمجھ میں آ سکتی ہیں مگر جب ایسے واقعات ڈاکٹر مبارک علی جیسے محقق اور ہسٹاریوگرافر کے زیرِ نظر آتے ہیں تو یہ واقعات تحقیق کے دائرہ میں آ جاتے ہیں اور وہ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ جنگ یا حملہ کا ایک محرک کردار ___ وہ عورت آخر تاریخ کے صفحات میں کیوں گم ہو گئی؟ کہیں یہ تو نہیں کہ حملہ کے بہانہ کے طور پر وہ عورت ہی ایک فرضی کردار کے طور پر درباری مورخ نے بنالی ہو!! اور یہ بات کسی تحریر میں ڈاکٹر صاحب اس انارکلی کے حوالہ سے بھی تحریر کے دائرہ میں لے آئے ہیں جو انارکلی ہندوستان میں محبت کی علامت بن گئی تھی ___ تاریخ بھی کیا ظالم چیز ہے!!

مجھے یاد ہے کہ دسمبر 2012ء میں جب ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کی حیدر آباد پریس کلب میں تقریبِ رونمائی ''تاریخ کے پچاس سال'' کے عنوان کے تحت ہوئی تھی تو اس میں سوالات وجوابات کی نشست میں ہمارے دوست گوبند میگھواڑ کا ان سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ ''ڈاکٹر صاحب! کیا تاریخ ظالم ہوتی ہے؟'' تو اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر مبارک علی نے کہا تھا کہ ''ہاں! تاریخ دو دھاری تلوار کی طرح ہوتی ہے۔ جو مظلوم بھی ہوتی ہے اور ظالم بھی ہوتی ہے۔'' ایک طرح سے تاریخ واقعی یہ ظلم بھی کرتی ہے کہ لوگ برسوں تک کچھ کرداروں کا سہارا لئے چلتے ہیں۔ ان کو آئیڈیل بناتے ہیں۔

ان پر لکھتے ہیں۔ شعراء حضرات خوبصورت شاعری کرتے ہیں۔ ناول نگار ناول لکھتے ہیں۔ جب وہ کردار پاپولر کلچر کا حصہ بن جاتے ہیں تو تاریخ بیدردی سے آ کر یہ بتاتی ہے کہ اس کردار کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔

تاریخ خود کس طرح مظلوم ہوتی ہے؟ شاید جب اسے حقائق تک پہنچنے سے حکمران طبقات روکتے ہوں!! ہوسکتا ہے یہ رکاوٹ عام لوگوں کی صورت میں بھی تاریخ کو پیش آتی ہو!!

ہوسکتا ہے کہ تاریخ کے سامنے عقائد کا بند باندھنے سے تاریخ مظلوم بن جاتی ہو، اور ان المیوں سے تاریخ گذرتی ہو، اور ہمارا ذہن ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''المیہ تاریخ'' کی طرف کھنچ جاتا ہے، اور قاری کے ذہن میں یہ سوال گردش کرنے لگتا ہے کہ ''کیا تاریخ اتنی مظلوم ہے کہ اسے بھی المیوں سے گذرنا پڑتا ہے؟''

جب تاریخ میں فلسفہ کی بات آتی ہے تو یہ کچھ پیچیدہ سی بات لگتی ہے کیونکہ ہمارے تعلیمی نظام سے ایک تو تاریخ کے مضمون کی طرح فلاسافی کے مضمون کو بھی خارج کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں فلاسافی کا شعبہ برائے نام ہی رہ گیا ہے، تو جب تاریخ کو فلسفہ کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے تو فلسفیانہ سوالات و جوابات میں قاری یا پڑھنے والے کی ذہنی الجھنوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں اس حوالہ سے کوئی پیچیدگی اور الجھن نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے تاریخ نویسی میں جس اسلوب کو اپنایا ہے وہ انتہائی سادہ، خوبصورت اور عام فہم ہے۔ چونکہ وہ تاریخ میں عام لوگوں کی شمولیت کے بڑے وکیل رہے ہیں اور اپنے قلمی سفر میں وہ اپنی اس بات کو حرف بہ حرف ثابت کرتے آئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں کو اپنے پڑھنے والوں پر ''تحریر کا بوجھ'' ڈالنے سے پرہیز کرتے ہوئے سہل اور آسان اسلوب اس طرح اپنایا ہے کہ عام پڑھنے والا بھی اسے سمجھ سکے۔

میں سندھ کے ایسے کئی سندھی بولنے والے نوجوانوں کو جانتا ہوں کہ جن کے گھروں میں کوئی اور کتاب ہو یا نہ ہو۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی کوئی کتاب ضرور ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو پڑھنے والے مجھے ایسے کئی نوجوان ملے ہیں جنہوں نے برسوں سے ڈاکٹر صاحب کے وہ مضامین محفوظ کر رکھے ہیں جو وہ بڑے عرصہ سے روزنامہ ڈان میں ہفتہ وار لکھتے آئے ہیں۔ ایسے نوجوان آپ کو جیکب آباد سے بدین اور کراچی سے تھرپارکر تک ملیں گے۔

برصغیر میں ___ خاص طور پر ہندوستان، پاکستان میں دہائیوں سے کشمکش میں تاریخ کو امن کے لئے کیا کردار ادا کرنا چاہئے؟ دونوں ملکوں کے لئے تاریخ امن اور خوشحالی کا پیغام کیسے لاسکتی ہے؟ پوری



دنیا سمیت ڈاکٹر صاحب طویل عرصہ سے برصغیر میں پائیدار امن کے خواہاں رہے ہیں۔ اس لئے وہ حکمران طبقات سے کوئی توقع رکھنے کے بجائے دونوں ممالک کے عام لوگوں کی تاریخ میں شمولیت پر زور دیتے ہوئے کام کر رہے ہیں، اور برصغیر کے عام آدمی کی ثقافتی تاریخ کے پس منظر میں امن کا وہ خواب دیکھ رہے ہیں جو چار جنگوں سے زخمی دونوں ملکوں کے لئے خوشحالی اور امن کا پیغام ثابت ہوسکتا ہے ___ شاید یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہ فقط نوجوان نسل کو ایک فرد اور اپنی ذات میں ادارے کی حیثیت میں تاریخ کے نئے زاویوں اور نئی جہتوں سے روشناس کرا رہے ہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلوں میں بھی وہ تاریخی شعور پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو تاریخی شعور تمام تعصبات سے پاک ہو، اور اس بات کی گواہی ڈاکٹر صاحب کی تاریخ پر بچوں کے لئے لکھی گئی ''تہذیب کی کہانی'' کی وہ سیریز ہے جو ڈان اخبار کے بچوں کے میگزین میں ہفتہ وار شائع ہوتی رہی ہے۔ تاریخ کے حوالہ سے بچوں کے لئے لکھی گئی یہ کہانی ایک طرف تو ہماری آنے والی نسلوں میں تاریخی شعور پیدا کرنے کی بڑی کاوش ہے تو دوسری طرف اس بات کی گواہی بھی ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب ہماری آنے والی نسلوں سے ''امید بہار'' رکھے ہوئے ہیں۔ جو خوش آئند بات ہے۔

# میرا محسن —— ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر ظہور چوہدری

اب یہ تو یاد نہیں پڑتا کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ پہلے پہل میں نے انہیں فکشن ہاؤس میں بیٹھے دیکھا تھا۔ ان کے ہمراہ قاضی جاوید، طاہر کامران، مرحوم رشید ملک، مرحوم فاروق قریشی ایڈووکیٹ اور مرحوم عزیز سندھی بھی موجود تھے۔ میں نے ان دنوں محکمہ تعلیم میں بطور لیکچرار شعبہ سیاسیات فرائض انجام دینا شروع کئے تھے اور ریڈیو پاکستان لاہور کی پروگرام پروڈیوسری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ ریڈیو پر ملازمت کے دوران جب بھی تقاریر، مباحثوں یا Talks کے لئے سماجی علوم کے ماہرین کے پینل تشکیل دیئے جاتے تو کسی کونے کُھدرے سے ''ڈاکٹر مبارک علی'' کا نام بھی لیا جاتا جس کو بڑے استکراہ سے رَد کر دیا جاتا اور کئی پروڈیوسر ناک بھوں چڑھا کر کہتے ''میاں نوکری سے نکلنے کا ارادہ ہے کیا'' اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا نام نامی میرے لئے کشش کا محور بنتا گیا اور پھر فکشن ہاؤس میں ان سے ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اب تک جاری و ساری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کئی اعتبار سے نہ صرف میرے بلکہ کئی قابلِ ذکر دوستوں کے بھی محسن ہیں اور تو اور جس نوجوان وکیل نے ان کو زچ کرنے کے لئے قانونی جنگ شروع کی تھی اس کی ذہنی پرداخت اور نشوونما میں بھی ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ تھا۔ رشید ملک صاحب برملا کہا کرتے ''بس جی فیصلہ ہو گیا ڈاکٹر مبارک میرے استاد ہیں ___ انہوں نے ہی مجھے تاریخ کی نئی راہیں بجھائی ہیں ورنہ میں پیشتر رومیلا تھاپر، ہربنس مکھیا، پرکاش ٹنڈن، حمزہ علوی اور پروفیسر عرفان حبیب کو نہیں جانتا تھا۔''

فکشن ہاؤس کی ان محفلوں میں گرما گرم بحثیں بھی ہو جاتی تھیں جن کی وجہ سے بعض احباب بدمزہ ہو کر آنے کا سلسلہ بھی ترک کر دیتے تھے۔ آخری دنوں میں طاہر کامران اور رشید ملک مرحوم نے بھی



نامعلوم وجوہات کی بناء پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ خیر بات ہو رہی تھی ڈاکٹر صاحب کے ان احسانات کی جو وہ وقتاً فوقتاً احباب پر کرتے رہتے تھے کسی کو ترجمہ کرنے کے لئے کوئی مضمون تھما دیا۔ کسی کو ''تاریخ'' کا پروف پڑھنے کو دے دیا۔ کسی کو تحقیق کرنے کے لئے موضوعات تجویز کر دیئے۔ موسیقی سے میرا شغف دیکھ کر مجھے تلقین کی کہ موسیقی کے شعبے میں تحقیقی کام کرنے کی بہت ضرورت ہے چنانچہ ان کی تحریک پر میں نے ماہنامہ ''بدلتی دنیا'' میں گلوکاروں اور موسیقاروں پر تحقیقی مضامین کا سلسلہ شروع کیا جو ''بدلتی دنیا'' کی آخری اشاعت تک جاری رہا اور اس کے نتیجے میں 70 کے قریب مضامین شائع ہو گئے جو برادرم ظہور احمد خان کی فرمائش پر ''جہانِ فن'' کی کتابی صورت میں یکجا کر کے چھاپ دیئے گئے۔ اسی سلسلے کی دوسری کتاب ''جہانِ آہنگ'' بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کے سامنے آنے والی ہے۔ اگر ڈاکٹر مبارک علی مجھے ان مضامین کو تحریر کرنے پر آمادہ نہ کرتے یا میری تحریروں کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تو میں کبھی نثر نگار نہ بن سکتا۔ یہی نہیں ''تاریخ'' کے لئے کئے جانے والے میرے بعض تراجم کو بھی انہوں نے سراہا اور یوں مجھے زندگی میں پہلی بار ترجمے کی خارزار وادی کا تجربہ حاصل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک احسانِ عظیم اس خاکسار کو پی۔ ایچ۔ ڈی کرانا ہے۔ 2004ء میں فکشن ہاؤس اور اردو یونیورسٹی کراچی کے تعاون سے برادرم ایوب ملک نے کراچی کے ایک معیاری ہوٹل میں تاریخ کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں یونیورسٹی کے ریکٹر جمیل الدین عالی بھی شامل تھے۔ رات کے کھانے سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب سے گذارش کی کہ عالی جی سے کہہ کر مجھے اردو یونیورسٹی سے بطور ریسرچ سکالر رجسٹریشن لے دیں کیونکہ میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تقریباً تمام چیئرمین حضرات کا دھتکارا ہوا تھا۔ منیر الدین چغتائی، سجاد نصیر، حسن عسکری رضوی اور فاروق حسنات غرض کون ایسا صدر شعبہ سیاسیات تھا جس نے مجھے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی غلام گردشوں سے بے نیل و مرام واپس نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ہامی بھر لی اور عالی جی سے پُرزور سفارش بھی کی جنہوں نے برادرِ عزیز توصیف احمد خاں (شعبہ صحافت اردو یونیورسٹی) کی ڈیوٹی لگا دی کہ میاں ان صاحب کو تمہیں سونپا ___ ''اب تم جانو اور تمہارا کام۔'' توصیف خان نے اس ڈیوٹی کو خاطر خواہ طور پر سرانجام دیا اور مجھے میرے مستقبل کے گائیڈ ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری سے ملوایا یوں 10 سال پنجاب یونیورسٹی لاہور کے صدورِ شعبہ سیاسیات کا گزیدہ، یہ راقم اردو یونیورسٹی کا ریسرچ سکالر بنا اور 2009ء میں میری ڈاکٹریٹ مکمل ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب اور دیگر مہربانوں کی کاوشوں سے مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ میں اردو یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کا پہلا پی۔ ایچ۔ ڈی تھا جس کا تعلق کراچی کی بجائے پنجاب سے تھا۔ دورانِ تحقیق مجھے طریقہ تحقیق اور

بنیادی وثانوی ماخذوں کی پرکھ، ترتیب اور جانچ سے بھی ڈاکٹر مبارک علی نے ہی روشناس کرایا وگرنہ میرے جیسا کندہ ناتراش اس کام کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا۔ پنجاب میں قائم مختلف لائبریریوں کے موادتک راہنمائی، مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے نام تعارفی خطوط پھر برادریوں کے موضوع پر بھرپور انٹرویوز، غرض اس ڈاکٹریٹ کا کونسا حصہ ایسا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی جھلک موجود نہ ہو۔

اپنی گھریلو پریشانیوں اور مجبوریوں کی بناء پر میں آہستہ آہستہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب کی محفلوں سے دُور ہو گیا لیکن اُن سے احترام اور شاگردی کا رشتہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس کتاب کے دیگر مضمون نگاروں کی طرح میں بھی ان سے بہت ڈرتا ہوں کیونکہ پتہ نہیں کس وقت بھری محفل میں مخاطب کر کے کہیں گے "ہاں تو ___ چوہدری صاحب! کیا ہو رہا ہے آج کل؟ ___ بس پڑھتے وڑھتے تو آپ ہیں نہیں ___ ہیں۔ نہ کچھ لکھنے لکھانے میں دلچسپی ہے ___ اب ایسا تو ٹھیک نہیں صاحب!"

تاریخ کا اچھوتا شعور دینے اور مجھ ایسے اندھے کی لاٹھی ثابت ہونے تک ان کا کردار میرے لئے ناقابلِ فراموش ہے۔ میرا محسن، میرا مورخ ___ ڈاکٹر مبارک علی ___ زندہ و پائندہ باد!



# ڈاکٹر مبارک علی ___ جیسے میں نے ان کو دیکھا

اعجاز احمد قریشی

یہ 1960ء کی دہائی کا زمانہ ہے جب میں نے سندھ یونیورسٹی کے اقتصادیات کے شعبے میں داخلہ لیا۔ اُسی فلور پر شعبہء تاریخ، شعبہ جغرافیہ اور شعبہ سیاسیات ہوا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں کافی گہما گہمی ہوتی تھی۔ مختلف مضامین میں بہت اچھے اساتذہ مقرر تھے اور وہ ہمیں بڑے اچھے طریقے سے پڑھاتے تھے۔ بی۔اے۔آنرز میں میرا میجر مضمون اقتصادیات تھا اور مائنرز میں تاریخ اور سیاسیات تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب شعبہء تاریخ میں لیکچرر تھے۔ میں انہیں اپنے ایک دوسرے دوست سید ظفر حسن، جو کہ جغرافیہ میں لیکچرر تھے کے ساتھ اکثر دیکھا کرتا تھا، وقت گزرتا رہا، پڑھائی ہوتی رہی۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر احمد بشیر صاحب جو کہ شعبہء تاریخ کے سربراہ تھے اور ڈاکٹر مرزا امجد علی بیگ جو کہ شعبہء اقتصادیات کے سینئر استاد تھے، مل کر نوجوان اساتذہ اور طلبہ کیلئے اور ان کی معلوماتِ عامہ کو بڑھانے کے لئے ایک "گریٹ بک اسٹڈی سرکل" (Study of great book circle) قائم کیا۔ یہ ایک پڑھائی کے حوالے سے سب کیلئے ایک کلب تھا جہاں کافی طلبہ اور اساتذہ ہفتے میں ایک بار تین بجے سے پانچ بجے تک بیٹھ کر لیکچر سنتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک نئی کتاب پر لیکچر اور بحث ومباحثہ بھی ہوتا تھا۔ میں اُس کلب کا ریگولر ممبر بن گیا اور ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے اس سرکل میں ریگولر آنا شروع کر دیا۔ تب تک میری اُن سے صرف سلام دُعا تھی۔ وہ اس سرکل میں کافی حصہ لیتے تھے۔ مجھے ان کو سُن کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔

1970ء کے مارچ میں، میں شعبہ اقتصادیات کا لیکچرر بن گیا تھا۔ میرے دوست سید ظفر حسن نے ڈاکٹر مبارک علی صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ اس طرح تقریباً روزانہ یونیورسٹی بس میں آتے جاتے وقت ہماری سلام دعا ہوتی رہی۔

ڈاکٹر صاحب، سید ظفر حسن اور میں صبح ساڑھے سات بجے ایک ہی بس میں سوار ہوتے تھے۔ جو لطیف آباد سے شروع ہوتی تھی۔ 1970ء کے اواخر میں یونیورسٹی کے کافی اساتذہ، اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ اور امریکہ چلے گئے۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب پی-ایچ-ڈی کرنے کیلئے مغربی جرمنی چلے گئے اور وہاں سے پی-ایچ-ڈی کر کے غالباً 1974ء میں واپس آئے اور سندھ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ میں بھی لندن یونیورسٹی سے ایم-اے کر کے 1974ء میں واپس آیا۔ ان ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے لگا، اور ہماری اچھی جان پہچان ہوئی جو آگے چل کر دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحب اور ہم نے سندھ یونیورسٹی جامشورو میں کافی اچھا وقت گزارا۔ ڈاکٹر صاحب نے شعبہ تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ وہاں رہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے طلبہ کو تاریخ کے نئے زاویے بتائے۔ انہوں نے تاریخ کو ایک ترقی پسند سوچ کے تحت متعارف کروایا۔ انہوں نے تاریخ کی پرانی اور فرسودہ تحریروں کو رد کیا اور یہ بتایا کہ اصل میں تاریخ کا تعلق عوام کیساتھ ہے۔ کیونکہ تاریخ صرف بادشاہ، وزراء اور بڑے آدمی نہیں بناتے۔ یہ لوگ ہمیشہ تاریخ اپنی مرضی سے لکھواتے ہیں جس میں عوام کا ذکر بالکل نہیں ہوتا۔ کئی تاریخوں میں بادشاہوں نے اپنے تاریخ دانوں کی معرفت عوام کو باغی، جاہل، ظالم اور غدار بتایا۔ دراصل یہ عوام ہی ہیں جنہوں نے تاریخ بنائی اور جو ہر وقت تاریخ بناتے رہتے ہیں۔ کسی بھی تاریخ میں ہاری (کسان) اور مزدور کا ذکر نہیں ہے۔ دراصل بادشاہ، وزراء اور اُمراء ہی ہوتے ہیں جو لٹیرے اور ظالم واقع ہوتے ہیں۔ جیسے اوپر کہا گیا ہے کہ دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جن کی تاریخ کا عوامی زاویہ ظاہر نہیں کیا گیا۔ جب تک ان ممالک میں آہستہ آہستہ تبدیلی آئی۔ ان ممالک میں اٹلی اور یونان کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ پھر بھی مغربی ممالک نے جلدی ترقی کی اور تاریخ کا دائرہ وسیع ہوگیا۔

روم میں جب شہر کی تعمیر نو ہوئی تو انہوں نے کچھ ایسی کھلی جگہیں بنائیں جہاں شہر کے عوام کیساتھ سیاست دان، حکمراں، فوجی جرنیل اکٹھے ہو جاتے تھے۔ جہاں کھلی فضاء میں بحث و مباحثہ ہوتا تھا اور حالات حاضرہ کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ اسی طرح یورپ کے کئی ممالک میں ایسے فورم بنے جہاں سب مل کر بیٹھے حتیٰ کہ موسیقار، رقاص اور تماشہ کرنے والے بھی آجاتے تھے۔ اسی طرح اگر ہم اپنے مشرقی ممالک میں دیکھیں تو عوام اور حکمرانوں میں بہت بڑا فرق نظر آئیگا۔ ہمارے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں امیر اور غریب مل کر بیٹھیں اور سیاسی یا سماجی مسائل پر بات کریں۔ یہاں عوام کو وزراء اور



اُمراء سے الگ رکھا گیا ہے اور جہاں کافی طبقاتی فرق نظر آئیگا۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے سے ہمیں مندرجہ بالا چیزوں کا علم ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں ڈاکٹر صاحب وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ "تاریخ" کی نئے سرے سے تشریح کی۔ چنانچہ تاریخ کو انہوں نے ایک نئی زندگی دی۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ تاریخ کا موضوع جو کسی زمانے میں ایک مخصوص طبقے کی ثناخوانی کے لئے مختص تھا وہ تاریخ کے حقیقی معماروں: ہاریوں، مزدوروں، چرواہوں، ہنرمندوں، استادوں، شاگردوں، عورتوں، بچوں کے زوایوں سے مرتب ہونے لگا۔ اس طرح انہوں نے تاریخ کو آمریت کے کباڑ خانے سے نکال کر جمہور کے سر کا تاج بنا دیا جو کہ میری نظر میں ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے ہر پہلو کو عوامی رنگ میں ظاہر کیا اور اس سلسلہ میں اب تک انہوں نے کوئی پچھتر (75) کے قریب کتابیں تحریر کی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے تاریخدان ہیں بلکہ برصغیر ہند و پاک کے تاریخ دانوں میں بھی سرفہرست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ہم چند دوستوں نے مل کر جن میں اے-آر-ناگوری صاحب، ڈاکٹر عیسیٰ داؤد پوتہ، ڈاکٹر محمد علی مہیسر اور ظفر حسن شاہ شامل تھے۔ ایک فورم بنایا جس کے تحت ہر پندرہویں دن لیکچر اور سیمینار کراتے تھے جس میں یونیورسٹی کے مقامی اسکالر اور کچھ اور یونیورسٹیوں سے مہمان مقررین آتے تھے اور یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔ اسی طرح یونیورسٹی ہی میں مل کر "سندھ ریسرچ سوسائٹی" قائم کی، جس کے تحت چند کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونیورسٹی میں دورانِ ملازمت سندھ کی تاریخ کو جدید طرز اور اسلوب سے قلم بند کیا اور انہوں نے سندھ کے درد کو سرزمینِ سندھ کے ایک عام باشندے کی طرح محسوس کیا لہٰذا انہوں نے سندھ کی تاریخ پر قلم اٹھایا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی چار کتابیں سندھی زبان میں ترجمہ کیں۔

ڈاکٹر صاحب جتنا عرصہ سندھ میں رہے وہ سندھ کی تہذیب، ثقافت، سیاست، اقتصادیات کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرتے رہے۔ اس دور میں سندھ میں قوم پرست سیاست کا عروج تھا۔ اس کو انہوں نے بڑے قریب سے دیکھا۔ سندھ کی سیاست کی داخلی و خارجی الجھنوں کو سمجھا اور ان کا حل پیش کیا۔

شروع شروع میں ان کی کتاب "سندھ کی تاریخ کیسے لکھنی چاہئے" کو میں نے جب سندھی میں ترجمہ کیا تو اس کے کم از کم تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ کیا ناؤل غدار تھے؟ اور بھی چھوٹے

چھوٹے کتابچے ڈاکٹر صاحب کے اس دور کی یادگار ہیں۔ ان کتابوں کو سندھ کے نوجوانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پڑھا اور اس طرح کافی نوجوان طلبہ کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رابطہ ہونے لگا چنانچہ روزانہ ڈاکٹر صاحب کے پاس سندھ کے کئی شہروں سے طلبہ، اساتذہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ آتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہم دوستوں کے ساتھ مل کر سندھ کے مختلف شہروں اور دیہی علاقوں میں گئے۔ جہاں کے لوگوں نے ان کے کئی لیکچرز کا پروگرام بنایا۔

ڈاکٹر صاحب کے سندھ کی تاریخ پر کام کرنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ تاریخ سندھ کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں جاری کام میں تیزی پیدا ہوئی بلکہ تحقیق و ترتیب کے نئے دریچے بھی کھلنے لگے۔

گو کہ ڈاکٹر صاحب بعد میں لاہور چلے گئے، لیکن وہاں جانے کے بعد بھی انہوں نے سندھ کی تاریخ کے حوالے سے اپنے کام کو جاری رکھا۔ سہ ماہی ''تاریخ'' کا ایک ضخیم ''سندھ نمبر'' ان کے قیام لاہور کے دوران کی محنت کا ثمرہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب موجودہ دور کے ایک بہت بڑے عالم، محقق اور باعمل مورخ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جہاں سرزمین سندھ کی تہذیب و ثقافت کی تعریف کی ہے وہاں انہوں نے سندھ کی سیاست میں وڈیروں کے موقع پرستانہ کردار کو بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کو اگر ایک دردمند نقاد کے زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو یقیناً سندھ کے نوجوان نسل کی ترقی کے لئے ڈاکٹر صاحب کے خیالات ایک موثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لہٰذا میں اُمید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب سندھ کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے اپنی مزید کاوشوں سے اہلِ سندھ کو بہرہ مند رکھیں گے۔



# ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کے احساس کے ساتھ

زبیدہ مصطفیٰ

ہمارے ڈاکٹر مبارک علی کے معاملے میں شاید داخلی دکھاوا ایک دھوکہ ثابت ہو۔ یہ ایک ناقابلِ یقین لگتا ہے کہ ایک بزم گفتار شخص نے اسٹیبلشمنٹ کے نظریہ تاریخ کو روشن خیالی (لبرل) نقطہ نظر سے بدل کر رکھ دیا ہے وہ ان تمام لوگوں کے لیے ناپسندیدہ شخص قرار پاتے ہیں جو کہ سیاست اور علم و دانش میں کسی بھی تبدیل شدہ نقطہ نظر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

لیکن اس کے باوجود مبارک علی آج پاکستان میں کثرت سے لکھنے والے (prolific) اور ستاؤ رکھنے والے تاریخ نویسوں میں سے ایک ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں انہوں نے کئی موضوعات پر بڑی گہرائی سے لکھا ہے یہ موضوعات یورپ کے نشاۃ ثانیہ سے لے کر جنوبی ایشیا میں خواتین کی تحریکوں کی تاریخ سے متعلق بھی ہیں ایک ایسا شخص جو کہ تاریخ نویسی میں کسی بڑی سوچ و بچار یا پھر اپنے کسی بچپن کے خواب کو پورا کرنے کے لیے داخل نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود اس مضمون سے ان کی وابستگی (commitment) بڑی حیران کن ہے انہوں نے تاریخ کے مضمون کو اس چیلنج کے نتیجے میں اختیار کیا جوان کے ایک دوست کی طرف سے تھا۔ ان کے دوست نے ان کو چیلنج کیا کہ وہ اپنے ایم اے کی ڈگری کے لیے تاریخ کا مضمون اختیار کریں اور اچھے نمبروں سے اس میں کامیابی بھی حاصل کر کے دکھائیں۔

لیکن جب وہ ایک بار تاریخ کے شعبے میں داخل ہو گئے تو پھر ان کو ان کے اساتذہ اور بالخصوص پروفیسر تفضل داؤد اور پروفیسر احمد بشیر شامل ہیں یہ بڑے اچھے اساتذہ تھے لیکن اپنے خیالات میں بڑے رجعت پسند (orthrdox) تھے۔ ''بعد ازاں میں نے ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا اور بالکل ہی جدا راہ اپنائی''۔ مبارک علی کہتے ہیں وہ بات جو کہ مبارک علی کو دلچسپ اور relevent بناتی ہے اور ان

کو پڑھنے اور ان کے متعلق بات کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ ہے ان کا ماضی کو حال سے جوڑنے کا فن۔
ان کی تحریروں میں تاریخ ایک زندہ حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے نہ کہ مردہ اور dull واقعات کے طور پر جو کہ عمومی طور پر دیگر تاریخ نویسوں کے یہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح نہ توان کی کتابیں بادشاہوں اور حکمرانوں کے دیگر گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں جو کہ قوموں کے فیصلے کرنے والے ہوتے ہیں مارکسی روایات کے زیرِ اثر تربیت پانے کے باعث وہ عام لوگوں کی طرزِ زندگی، ان کی نفسیاتی کیفیت، طبقاتی تضادات اور عمرانی تبدیلیوں کو تاریخی تناظر میں بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''ہم پاکستان میں عام طور پر بڑی سادگی سے صرف تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں یہ تاریخ صرف فاتحین اور ان کی فتوحات کے متعلق ہے۔ہم نے کئی معاملات میں نوآبادیاتی پہلو (perception) اپنا لیا صرف حکمرانوں کی تاریخ رقم کرتے ہوئے ہم نے درحقیقت اپنی تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا بہت ضروری ہے کہ ہم تاریخ کو دوبارہ جاننے کی کوشش کریں اور اس میں عام آدمی اور اس کی ثقافت کا ذکر ہو جو کہ اب تک ہم بڑے بڑے طریقے سے نظر انداز کرتے آئے ہیں معاشرہ کے کسی بھی گروہ کو اگر تاریخ میں کوئی جگہ نہ ملے تو پھر وہ بالآخر اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔بحیثیت تاریخ دانوں کے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم تاریخ نویسی کے اس روایتی طریقے کو ختم کر دیں جس کے تحت مخصوص شخصیات اور واقعات کے گرد توہمات کے کڑے حصار کا خاتمہ کرنا ہوگا۔بالآخر سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ جو ماضی پر کنٹرول رکھتے ہیں، وہی مستقبل پر تسلط رکھتے ہیں''۔مبارک پر بات کرتے ہیں بڑے احساس کے ساتھ conviction۔وہ بات بڑے دکھ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ساٹھ کی دہائی کے اوّل میں جب ہاورڈ کی ٹیم کے مشورے پر ایوب خان نے تاریخ کے پڑھائے جانے کو ختم کرنے کا اعلان کیا تو دراصل یہ عمل بچوں کو اپنے ماضی سے کاٹ کر رکھ دینے کا آغاز تھا۔حقیقت تو یہ ہے کہ امریکیوں کی اپنی کوئی تاریخ نہیں ہے ایک جواں قوم کی طرح ان کی تاریخ نئی دنیا کی تلاش کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے ''اسکولوں میں تاریخ کو نہ پڑھائے جانے کے باعث ہم نے پاکستان کے اسکول جانے والے بچوں کو تاریخ کے احساس سے ہی محروم کر دیا ہے جو کہ ان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اس مضمون کی دیگر مضامین کے مقابل اہمیت کا درست اندازہ لگا سکیں'' وہ کہتے ہیں ''تاریخ کے مضمون کو مطالعۂ پاکستان سے تبدیل کر کے رکھ دیا گیا ہے اور یہ مضمون طلباء کو بڑی ہی محدود (tunnel view) آگاہی فراہم کرتا ہے۔یہ مضمون نظریہ بندی کا شکار ہے اور نوجوان نسل کے ذہنوں کو علم کے ذریعے کنٹرول کرنا چاہتا ہے اس کا واضح نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم عدم برداشت اور تنگ نظر نوجوان نسل پیدا کر رہے



ہیں جو کہ تسلسل اور تبدیلی کے عمل سے مکمل طور پر سے ناواقف ہے'' وہ کہتے ہیں کہ بحیثیت تاریخ دان انہیں اپنی بات کہنے کی آزادی حاصل رہی جس کو انہوں نے بڑا پسند بھی کیا بحیثیت استاد سندھ یونیورسٹی کا معاملہ ہو یا پھر ایک لکھاری کے طور پر ان پر کبھی بھی پابندیاں عائد نہ ہو سکیں ''لیکن شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ماضی کے متعلق بات کر رہا تھا اور اپنی بات کی وضاحت کے لیے میں دستاویزی ثبوت بھی فراہم کر رہا تھا'' وہ یہ بات کرتے ہیں تاریخ کا اپنا سفر انہوں نے اسلامی تاریخ کے معاملے کے ساتھ شروع کیا اور اس مقصد کے لیے انہیں عربی اور فارسی زبانیں سیکھنا پڑیں۔بعدازاں ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ اور خصوصاً عہدِ وسطیٰ کی تاریخ پر زیادہ توجہ دی، بحیثیت ایک حقیقی اور عوامی تاریخ داں کے نہ کہ ایک بکہ بند نظریاتی (ideologue) ہونے کے باعث مبارک علی نے بڑے تواتر سے کھانے کے آداب، نجی زندگی، عورت، مذہب، سیاست اور تاریخ میں ڈاکوؤں کے کردار پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے وہ اپنی دو کتابوں ''المیہ تاریخ'' اور ''برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ'' کو بڑی ہی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔انگریزی میں لکھی گئی کتاب ''historians dispute'' برصغیر میں مسلمان کمیونٹی کے متعلق ان کے خیالات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ایک ایسے ملک میں جہاں تاریخ نویسی اور تحقیق کو ہماری درسگاہوں میں کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی ہو۔وہاں ڈاکٹر مبارک علی جیسے پُرامید شخص کو ملک کے تعلیمی ماحول کے متعلق مایوس ہونے پر حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیے جب وہ اپنی ڈاکٹریٹ (PHD) کرنے کے لیے جرمنی گئے تو انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ تحقیق کے طریقوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور انہیں یہ بات بھی معلوم نہیں کہ کس طرح ماخذ کے متن کا جائزہ لیا جائے اور اس سے کس طرح کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ان کو ان بنیادی طریقوں کا فہم حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔
اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہماری تاریخ غلطیوں سے بھری پڑی ہے ''ہم بڑی سادگی سے صرف سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں'' وہ کہتے ہیں ''حد تو یہ ہے کہ اسلامی تاریخ جس میں کہ ہم بڑے شائق ہیں اس میں بھی ہم نے کوئی خاص حصہ نہیں ڈالا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری اسٹیبلشمنٹ نہیں چاہتی ہے کہ ان معاملات میں بات چیت کی جائے جس کے نتیجے میں واقعات کی سچائی ظاہر ہو۔'' وہ دیگر ممالک میں تاریخ نویسی کے رجحانات پر بھی بات کرتے ہیں جہاں اس مضمون میں بڑی ترقی دیکھنے کو ملی ہے مثلاً فرانس میں تاریخ کے انلز (annals) نظریے کے مطابق کوئی بھی معاملہ تاریخ کی دسترس سے باہر نہیں ہے لکھاریوں نے تاریخ کے ہر پہلو کو جاننے اور اس کے بارے میں لکھنے کی کوشش کی ہے چاہے وہ لکھنے پڑھنے کی تاریخ ہو، چاہے رونے اور گریہ کرنے کی، خدا کی یا ابلاغِ عامہ وغیرہ۔

انڈیا میں سبالٹرن (subaltern) نقطہ نظر نے نو آبادیاتی دور کی تاریخ کا نئے معروضی (objective) طریقے سے جائزہ لینے اور ان کی نئی توجیح پیش کرنا شروع کی ہیں۔ تاریخ دانوں کو یقین ہے کہ نو آبادیاتی دور میں لکھی جانے والی تاریخ تعصبات پر مبنی نامکمل تاریخ ہے اب وہ تاریخی حقائق کا از سر نو جائزہ لیتے ہوئے اسے نئے اور معروضی انداز میں رقم کر رہے ہیں لیکن سبالٹرن اسٹڈیز کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ تخلیقی طور پر اس قدر دقیق اور عالمانہ طریقے سے لکھی جا رہی ہے جو کہ عام قاری کی فہم اور سمجھ سے بالاتر ہے اس کے مقابلے میں پاکستان میں تاریخ نویس اب تک دقیانوسی طریقوں سے تاریخ رقم کر رہے ہیں کیونکہ پاکستان کا حکمران طبقہ تبدیل شدہ اور جدید پیرائے میں لکھی جانے والی تاریخ کو قبول کرنے کو تیار نہیں اور اس کو اس کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ مبارک علی صاحب کے پاس تاریخ رقم کرنے کے دونوں مواقع مہیا تھے وہ انگریزی اشرافیہ کے لیے تاریخ لکھتے یا پھر اردو میں طبقہ عام کے لیے تاریخ رقم کی جائے اور یہ تاریخ 'محروم طبقات' کی تاریخ کے متعلق ہو۔ انہوں نے اشرافیہ کے بجائے عوام کے لیے لکھنے کو ترجیح دی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کبھی کبھار اور بسا اوقات انگریزی میں بھی لکھا ہے۔ لیکن ان کی انگریزی میں لکھی گئی تحریروں نے انہیں اسٹیبلشمنٹ کے حلقوں میں مزید نا قابل قبول بنا دیا۔ رجعت پسندوں کی نظر میں ان کے خیالات بہت زیادہ روشن خیال، خرد افروز اور لبرل ہیں۔ اسی طرح وہ ''طالبائزیشن'' کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے رجعت پسند مسلمان مذہب اور تہذیب کو ایک ہی چیز سمجھ بیٹھے ہیں۔ اسی لیے طالبان جدیدیت کو مکمل طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ عمل اسلام کی صدیوں پرانی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش ہے۔ کیونکہ ان کی تربیت میں مغرب سے آنے والے علوم کو پڑھنے اور سمجھنے کی تربیت شامل نہیں اس لیے وہ ان کو اخلاقیات کے منفی سمجھتے ہوئے ان کو مکمل طور پر مسترد کر دیتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ مغرب کے ان جدید علوم کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں جو کہ ان کی ضروریات کو پورا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستان میں کام کرنے والی مذہبی جماعتیں جو کہ اس ملک میں طالبان کے طرزِ حکومت لانے کی خواہش مند ہیں اور اس کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایسی جماعتیں کوئی بھی علمی (intellectual) روایات نہیں رکھتیں۔ نہ ہی یہ جدید سائنسی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی ارد گرد پائی جانے والی دنیا کے متعلق کوئی گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ یہ قبل از اسلام کی تہذیب کے بھی انکاری ہیں کیونکہ یہ تاریخی شعور سے مکمل نابلد ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کو اس بات پر پورا اعتماد ہے کہ افغانستان کی طرح پاکستان کو طالبانائز نہیں کیا



جا سکتا۔ کیونکہ پاکستان کا متوسط طبقہ علمی (intellectual) طور پر زیادہ ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہیں اور وہ افغانستان میں طالبان کے طرزِ نظام کو پاکستان میں متعارف کرانے کی سختی سے مخالفت کرے گا۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے پسماندہ اور دیہی علاقے وہ جگہیں ہیں جہاں توہمات اور علم کی کمی کے باعث ایسے خیالات کو قبولیت کا موقع مل سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خدشہ اپنی جگہ پر موجود ہے کہ متوسط طبقہ اپنی گرفت کمزور کرتا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکومت پر بیرونی ممالک سے امداد دیئے جانے والے اداروں کا دباؤ بھی ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ وقت ان لوگوں کے لیے بڑا ہی کٹھن ہے جو کہ اس وقت حکمرانی کر رہے ہیں۔ ان پر دو اطراف سے دوہرا دباؤ ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں ''میرا خیال ہے کہ بیرونی طاقتوں کا دباؤ اور اقتصادی صورتحال کی وجہ سے بیرونی امداد فراہم کرنے والے اداروں کا دباؤ زیادہ مضبوط ہوگا اور اس کے کامیاب ہونے کے زیادہ امکانات ہیں'' زیادہ تر لوگوں کی خواہش ہے کہ ان کی یہ بات ایک لطیف خواہش ہی نہ رہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات تاریخ کے وسیع مطالعے کے تناظر میں کہی گئی بات ہے۔ لیکن ایک حقیقی اور عوامی تاریخ داں کی طرح ڈاکٹر مبارک علی ایک سوال پر زور دیتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ہر باشعور شخص بھی یہ سوال اٹھائے کہ ''آخر یہ مذہبی گروہ کس طرح ابھر کر سامنے آئے؟''

ڈاکٹر مبارک علی اس سوال کا جواب سوچنے کے لیے کافی مواد فراہم کرتا ہے۔ اس ملک کا حکمران ملک کے تمام وسائل، دولت اور مراعات پر قابض ہے اور عام آدمی کو کوئی بھی چیز دینے کے لیے تیار نہیں۔ غربت نے جہادیوں کو بڑا زرخیز میدان فراہم کیا ہے۔ یہ جہادی سمجھتے ہیں کہ وہ سیاسی نظام کو نظر انداز کرتے ہوئے اس ملک پر اپنا نظام مسلط کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس ملک کا سیاسی نظام جاگیردارانہ جمہوریت یا پھر فوجی تسلط کو جنم دیتا ہے اور انتخابی عمل میں عوام ان کو منتخب نہیں کریں گے۔ ان مذہبی گروہوں کا خیال ہے کہ کیونکہ وہ انتخابی عمل میں ووٹ حاصل نہیں کر سکتے اس لیے ان کے لیے مسلح جدوجہد کا واحد راستہ رہ جاتا ہے۔

# ڈاکٹر مبارک علی

اسحاق سومرو

مبارک علی تاریخ کے شاگرد سے تاریخ دان تک پاکستان کے ایک ایسے لکھاری ہیں جنہوں نے تاریخ کو جس طرح سے بیان کیا اور لکھا ہے اس سے تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے میں عام قاری کو بہت مدد ملی ہے۔

مبارک علی نے صرف 11 سال کی عمر میں ٹونک راجستھان سے ہجرت کی جو دراصل برصغیر کے بٹوارے کا سفر تھا اور شاید آگے جا کر یہ ہی نکتہ مبارک علی کے تاریخ کے طالب علم سے ایک منفرد تاریخ دان بننے کا سبب بن گیا۔ تاریخ دان مبارک علی کی والدہ نے اُن کی تاریخِ پیدائش سے متعلق کہا کہ وہ رمضان کے مہینہ تھا اور بہت زوروں کی برسات ہو رہی تھی چناں چہ انہوں نے خود 21 اپریل 1941ء کو اپنی تاریخ پیدائش قرار دے دیا۔ شاید وہ دنیا کا واحد تاریخ دان ہے جس نے اپنی تاریخ پیدائش خود منتخب کی اور آگے چل کر پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا تاریخ دان بن گئے۔

مبارک علی اپنے والد کے ساتھ ٹونک سے ہجرت کر کے حیدر آباد آئے۔ اُن کے دادا بھی سنبھل سے ٹونک آئے تھا۔ اس خاندان کی ہر نسل نے ایک سے دو مرتبہ ہجرت کی اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ نہ تو ان کی کوئی بڑی برادری ہے اور نہ ہی کوئی آبائی قبرستان ہے۔ مبارک علی نے اپنے والد اور بیمار دادی کو ساتھ لے کر ٹونک سے مونا باؤ اور کھوکھرا پار کا سفر کیا اور رات ریگستان میں چادروں کے خیمے میں بسر کی۔ وہاں سے آگے جانے کے لیے ہفتے میں صرف ایک بار ٹرین چلا کرتی تھی۔ یہ دل خراش منظر دیکھ کر مبارک علی سوچا کرتے تھے کہ یا خدا کیا یہ پاکستان ہے؟ انہوں نے وہ ایک ہفتہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گذارا۔ ایک سپاہی کی جانب سے گالی دے کر بھگا دیئے جانے کا واقعہ مبارک علی کے ذہن میں آج بھی تازہ ہے کیوں کہ وہ اُن کے لیے ایک غیر متوقع تجربہ تھا۔



ہجرت اور تقسیم کے تکلیف دہ لمحات سے گزرنے کے بعد زندگی کچھ رواں ہوئی تو مبارک علی حیدر آباد کے علاقے ہیر آباد میں سکونت پذیر ہوگئے۔ 1956ء میں ادیب کا امتحان پاس کیا۔ اُس زمانے میں ادیب کا امتحان پاس کر لینے کے بعد میٹرک پاس کرنے کے لیے صرف انگریزی کا پرچہ پاس کرنا ضروری تھا چناں چہ 1957ء میں انہوں نے میٹرک کر لیا اور سٹی کالج حیدر آباد میں داخلہ لیا۔ یونیورسٹی میں داخلے کا وقت آیا تو مبارک علی نے تاریخ عمومی کا انتخاب کیا جسے مشکل مضمون مانا جاتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اُس وقت سندھ یونیورسٹی کے اس شعبے میں محض پانچ طلباء نے داخلہ لیا تھا جب کہ اس کے مقابلے میں شعبۂ اسلامی تاریخ میں کثیر تعداد میں داخلے ہوئے۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخِ عمومی میں داخلے کے نتیجے میں اُن کا سامنا ڈاکٹر احمد بشیر سے ہوا جو شعبے میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ مبارک علی بتاتے ہیں کہ احمد بشیر سیکولر نظریات کے حامل تھے جن کا واحد شوق مطالعہ تھا۔ وہ جب لیکچر روم میں داخل ہوتے تو گویا علم کا ایک سیلاب رواں ہو جاتا۔ ڈاکٹر احمد بشیر کی شخصیت نے مبارک علی کو کافی متاثر کیا۔ ایم اے کے امتحانات میں اوّل پوزیشن لینے کے بعد ڈاکٹر مبارک نے سندھ یونیورسٹی میں ہی بہ حیثیت جونیئر لیکچرر کیریئر کا آغاز کیا۔ اُس وقت پروفیسر رضی الدین صدیقی سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے جنہوں نے مبارک علی کو تقرری کے بعد مشورہ دیا کہ وہ کینٹین میں بیٹھ کر طلباء کو اُن کے خلاف بھڑکانا چھوڑ دیں۔ سندھ یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران انہوں نے بیرونِ ملک اسکالرشپ کے حصول کے لیے کوشش کی مگر وائس چانسلر کی جانب سے اُن کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ سندھ یونیورسٹی میں سندھی قوم پرستوں کے رویئے نے بھی انہیں بہت مایوس کیا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ قوم پرستی میں انتہا پسندی شامل ہو جائے تو معاشرے پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مبارک علی کے ساتھ سندھ یونیورسٹی میں امتیازی رویہ جاری رہا۔ ضیاء الحق کی آمریت میں یہ سلسلہ مزید شدت اختیار کر گیا اور ڈاکٹر مبارک کے خلاف ڈین اور وی سی آفس میں درخواست دائر کردی گئی کہ انہوں نے اپنے کمرے میں موجود مذہبی کُتب جن میں طبری کی تاریخِ اسلام، ابنِ کثیر اور دیگر کُتب شامل تھیں، نذرِ آتش کی ہیں۔ جب اُن سے جواب طلبی ہوئی تو ڈاکٹر مبارک نے مخالفین کو یہ کہہ کر لاجواب کردیا کہ کتابیں جلانے کا کام مذہبی لوگوں نے کیا ہے۔ غیر مذہبی لوگ ایسے کام نہیں کرتے ہیں۔

مبارک علی نے سندھ کی تاریخ دستاویز کی تو اُنہیں نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہونے لگی اور یوں سندھ یونیورسٹی کی انتظامیہ کے ہاتھوں پریشان مبارک علی سندھ کے مختلف شہروں میں لیکچر دینے

جانے لگے۔ ایم آرڈی تحریک کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مبارک کے لیکچرز نے سندھی نوجوانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن ہمارا ملک و معاشرہ ڈاکٹر مبارک کی صلاحیتوں سے کُھل کر فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ تاریخ عمومی میں طلباء کی دل چسپی نہ ہونے کے برابر ہی رہی۔ ایک بار سندھی قوم پرست گروپ سے تعلق رکھنے والا نوجوان شعبے کے ایک طالب علم جو پورے سمسٹر کے دوران غیر حاضر رہا تھا، کے فارم دستخط کروانے آیا تو مبارک علی نے انکار کر دیا جس پر وہ نوجوان بولا کہ تُو ہوتا کون ہے فارم بھیجنے سے انکار کرنے والا! اس رویئے نے ڈاکٹر صاحب کو یونیورسٹی سے مکمل طور پر بدل کر دیا۔ یوں بہ طور طالب علم، لیکچرر، پروفیسر اور صدرِ شعبہ مجموعی ط62 سال گزارنے کے بعد ڈاکٹر مبارک علی نے 1989ء میں سندھ یونیورسٹی کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سندھ یونیورسٹی کی بدنصیبی تھی کہ وہ ایک قابلِ فخر استاد سے محروم ہوگئی اور انفرادی و اجتماعی تعصب کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے لیکن تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ایسے نادر و نایاب افراد کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور نقصان صرف اداروں کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی دوسروں کی شرائط پر زندگی گزارنے کے قائل نہیں ہیں اور یہی اصول پرستی ان جیسے لوگوں کو منافق معاشروں میں سکون سے جینے نہیں دیتی۔ میں اُن بدقسمت افراد میں شامل ہوں جو سندھ یونیورسٹی میں دورِ طالب علمی کے دوران خواہش کے باوجود ڈاکٹر مبارک علی سے ملنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا اور اس خواہش کے پورا ہونے کے لیے مجھے 1995ء تک انتظار کرنا پڑا جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میری خوش نصیبی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے درخواست قبول فرمائی اور یوں لاہور میں اُن کی رہائش گاہ پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ سندھ میں انہیں پڑھا جاتا ہے اور یہ کہ سندھ کے عوام خصوصاً طلباء دیگر صوبوں سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ سندھ کے کئی شہروں اور قصبوں میں جا کر طلباء سے بات چیت کرتے رہتے ہیں تا کہ اُن کی ذہنی تربیت کی جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ انٹرویو سندھی روزنامہ ''الکھ'' نے صفحۂ اول پر شائع کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتابوں اور مضامین میں مسخ شدہ تاریخ کی اصل تصویر سامنے لاتے رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں 1965ء کے بعد قدیم تاریخ اور سندھ کی تہذیب کو سرکاری نصاب سے ہی خارج کر دیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ جو سرکاری نصاب سے باہر ہے وہ تاریخ کا حصہ ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے مضامین میں جبر کا استعمال کر کے اقوام اور خطوں پر قبضہ کرنے والوں کو بھی ہیرو بنانے اور خطابات دیئے جانے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ حملہ آور کبھی بھی ہیرو اور معزز نہیں



ہوتے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق تاریخی مقامات کی ایک علیحدہ پہچان ہے اور موہن جو دڑو کے آثار کے دریافت کے بعد یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ یہ خطہ بھی کسی زمانے میں دنیا کی عظیم تہذیب کا امین تھا اور اس حقیقت میں برصغیر کی آزادی نے بھی اہم کردار ادا کیا کیونکہ اس سے پہلے اس خطے میں رہنے والے لوگوں کو تہذیب یافتہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخِ ہند و پاک پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور اقتدار کے اصل مالکان سے ہٹ کر ایک غیر جانبدار مصنف اور مورخ کے طور پر خود کو منوایا۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں اطراف کے اسٹیبلشمنٹ کے حمایت یافتہ مورخین اور دانشوروں نے تاریخ کو مسخ کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اب تک بٹوارے پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ جانبدار اور تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ کا درست تجزیہ کر کے اس کو از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور فاتحین کے بجائے عام لوگوں کا نقطۂ نظر اجاگر کیا جائے۔ اب تک مذہب کے لبادے میں لپٹی ہوئی تاریخ کو درست انداز میں لکھنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں اقتدارِ اعلیٰ کے اصولوں کے خلاف تاریخی سچ آشکار کرنے پر پولیس نے بھی ڈاکٹر صاحب کو ہراساں کیا۔ تفتیش کے نام پر کئی مرتبہ ان کے گھر پر پولیس نے چھاپے مارے، گھر والوں کو ہراساں کیا اور ان کی تذلیل کی گئی۔ ڈاکٹر مبارک علی کے خلاف لاہور پولیس نے چار ایف آئی آر بھی درج کیں جیسے وہ ایک عالم نہیں بلکہ دہشت گرد ہوں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ تاریخ دان جو دنیا کی کئی نامور جامعات میں پاک و ہند کے تاریخ پر لیکچر دیتے رہے ہیں، ان کے گھر پر نچلے درجے کا ایک پولیس انسپکٹر تفتیش کے لیے چھاپے مارے تو کسی قوم کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

# روشنی اور روشن خیالی کا استعارہ — ڈاکٹر مبارک علی

محمد ابراہیم خلیل

تاریخ کے ہر دور میں چند ایک ایسی شخصیات ضرور موجود رہی ہیں جنھوں نے اپنے معاشروں پر اثر ڈالا اور تاریخ ساز ہوئے۔ یہ بات صرف حکومت اور سیاست تک محدود نہیں ہے بلکہ ادب، فلسفہ، تاریخ اور فنونِ لطیفہ میں ایسی صاحبِ کمال ہستیاں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہے جو کہ ایک مورخ ہوتے ہوئے بھی ایک تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی شناسائی اُن کی out of box تحریروں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پشاور میں کتابوں کی ایک بڑی دُکان میں کتابوں کی اُلٹ پھیر کے دوران اُن کی ایک کتاب ''برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ'' ہاتھ لگی۔ یونہی ہاتھ میں اُٹھا کر دیکھا کہ دیکھیں یہ صاحب معاشرے اور اُس کے المیے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ یہ مختصر سی کتاب میں نے ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ کتاب اگرچہ تاریخ کی دیگر ضخیم کتابوں کے برعکس مختصر تھی لیکن سوچنے کا جو طریقہ اور سلیقہ یہ کتاب دے گئی وہ بڑی بڑی کتابیں نہ دے سکی تھیں۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ کسی نے تاریخ کو ہمارے سامنے اُس کی اصل شکل میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد تو میں ڈاکٹر مبارک علی صاحب کی تحریروں کا باقاعدہ فین ہو گیا۔ اس سے پہلے تو ہمارے دل و دماغ میں تاریخ کا بڑا روکھا سُوکھا اور پھیکا تصور تھا۔ تاریخ کو ہم صرف بادشاہوں کے فتح و شکست اور فاتحین اور شکست خوردہ قوتوں کے درمیان آویزش کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن یہ پہلی دفعہ تھا کہ کسی نے پیپلز ہسٹری کو ہماری نگاہوں کے سامنے رکھا تھا اور ہمیں بتایا تھا کہ تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں اور فاتحین کے شوکت و سطوت کا نام نہیں بلکہ عام آدمی بھی تاریخ کا اتنا ہی اہم کردار ہے جتنا کہ ایک بادشاہ یا فاتح ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری تقریباً ہر اتوار کو فون پر بات ہوتی ہے۔ جتنا جاندار اُن کا قلم ہے اُتنا ہی



جاندار بلکہ اُس سے زیادہ اُن کا اخلاق اور لہجہ بھی ہے۔ ہر سوال کو نہایت صبر و تحمل سے سننا اور پھر نہایت اطمینان سے اُس کا جواب دینا اُن کا خاصہ ہے اور یہی سقراطی طریقہ کار اُن کو اُن کے دوستوں اور چاہنے والوں میں مقبول بنا دیتا ہے۔

پلوٹی نورس نے شاید مطلق سچائی کے متعلق کہا تھا کہ یہ ایک اندھیری رات میں روشن الاؤ کی طرح ہے۔ جو کوئی جتنا اُس کے قریب ہو گا وہ اُتنا ہی روشن ہو گا اور جو کوئی جتنا دور ہو گا اُسی نسبت سے اُس کو روشنی کم دکھائی دے گی لیکن روشنی ہو گی ضرور۔ بے شک اگرچہ ڈاکٹر صاحب مکانی حساب سے ہم سے دور ہیں لیکن اُن کی روشنی اُن کی تحریروں کی صورت میں برابر ہم کو مل رہی ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن اور عقل و دانش کا کارواں ہزاروں سال کی مسافت کے بعد موجودہ جگہ پر پہنچا ہے۔ ہزار سالہ دورِ تاریکی کے بعد دنیا میں روشن خیالی اور خرد افروزی کی صبح ہوئی۔ فرانس میں خرد افروزی کا سورج ایک نئی صبح کی نوید دے رہا تھا۔ ایک ایسی صبح کا نوید جس کو کہیں بھی زوال کا ڈر نہ تھا؟ آج اکیسویں صدی میں دنیا جس مقام پر کھڑی ہے اُس کا آغاز فرانس کے اُس خرد افروزی کی تحریک سے ہی ہوا تھا ورنہ وہ لوگ بھی آج ہماری طرح تعویذ گنڈوں سے کام چلانے کی ناکام کوشش کرتے نظر آ رہے ہوتے۔ برصغیر پاک و ہند میں خرد افروزی اور عقل پرستی کا علم سب سے پہلے علامہ نیاز فتح پوری نے اُٹھایا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے سر سیّد احمد خان نے اس کا آغاز کر دیا تھا لیکن نیاز صاحب اور اُس کے رسالے ''نگار'' نے صحیح معنوں میں روایات اور معتقدات کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کے۔ ایم۔ اشرف، سیّد سبطِ حسن، علی عباس جلالپوری، اور اب ڈاکٹر مبارک علی اس علم کو اُٹھائے آگے کی جانب گامزن ہیں۔ اگرچہ تاریکی کے پجاریوں نے اس علم کو گرانا اور اس چراغ کو بجھانے کی بہتیری کوششیں کیں۔ لیکن بھلا سورج کو طلوع ہونے سے کوئی روک سکتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی کبھی بھی اسٹیبلشمنٹ کے لئے قابلِ قبول نہیں رہے۔ قدم قدم پر اُن کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ اُن پر ملک کے تدریسی اداروں کے دروازے بند کیے گئے۔ اُنہیں جھوٹے مقدموں میں پھنسایا گیا تا کہ اُنہیں اپنی راہ سے ہٹنے پر مجبور کیا جائے۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ اس کے برعکس ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ روشنی اور سچائی کے راستے پر چلے ہیں وہ گھپ اندھیروں کو بھی روشنی دے گئے ہیں۔ لاریب ڈاکٹر صاحب بھی اسی راہ کے راہی ہیں۔

تیسری دُنیا اور خاص کر عالمِ اسلام میں اور پھر پاکستان میں تاریخ نویسی کبھی بھی پھولوں کی سیج نہیں رہی ہے بلکہ یہ ہمیشہ کانٹوں کی سیج رہی ہے۔ یہاں پر ہر حاکمِ وقت نے تاریخ کو اپنے انداز سے

دیکھنے اور لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر کسی نے اپنے آپ کو "زندہ پیر" اور دوسروں کو ظالم و غاصب دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس دو انتہاؤں کے بیچ کسی نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے تو وہ ڈاکٹر مبارک علی ہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اعتدال اور غیر جانب داری کی اس تنی ہوئی رسّی پر بڑے یقین اور اطمینان سے چل رہے ہیں اور یہی اطمینان اور یقین وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے قاری کو منتقل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتابیں سندھی اور دیگر پاکستانی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک سہ ماہی رسالہ "تاریخ" کے نام سے بھی نکالتے ہیں۔ اس رسالے میں وہ خود بھی لکھتے ہیں اور اپنے دوستوں سے بھی مختلف موضوعات پر مضامین لکھواتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں ہونے والی تاریخ اور اُس پر تحقیق کے موضوع پر چھپنے والے مضامین کو بھی ترجمہ کر کے شائع کئے جاتے ہیں۔ پاکستان میں عام طور پر سنجیدہ کتابوں کی اشاعت کم ہوتی ہے اور وہ بکتی بھی کم ہیں لیکن ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں ہاٹ کیک کی طرح بکتی ہیں اور ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر مبارک علی اور اُس کی تحریروں کی مقبولیت کی ایک بڑی دلیل ہے اور اس بات کی بھی ایک دلیل ہے کہ آنے والا دور روشنی اور روشن خیالی کا ہے۔ بقول شاعر ؎

اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں



# ڈاکٹر مبارک علی — ایک دوست کا تاثر

راحت سعید

آج ڈاکٹر مبارک علی تاریخ نویسی کے حوالے سے پوری دنیا میں پاکستان کی پہچان بن چکے ہیں۔ ان کی ساٹھ سے زائد کتابیں، سہ ماہی "تاریخ" کتابی سلسلے کی اشاعتیں اور سیکڑوں علمی و تعلیمی کالم اور مضامین ہیں جن کے باعث وہ ملک کے کثیر ترین تحریروں کے مصنّفین کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔

مجھ سے ڈاکٹر مبارک علی کا پہلا تعارف سندھ کے ایک محترم سیاسی رہنما جناب جمال الدین بخاری نے 1985ء میں کرایا تھا۔ انہیں دنوں سندھ کے ایک مذہبی خانوادے کے رہنما مولوی شہاب الدین نے بھی ان کی دو دُبلی پتلی کتابوں کے ذریعے ڈاکٹر مبارک سے ہم دوستوں کی ملاقات کرائی۔ ان کتابوں کی خطاطی بھی خود ڈاکٹر مبارک علی ہی کے ہاتھ سے کی ہوئی تھی۔

ان دونوں بزرگوں نے ڈاکٹر مبارک علی کی تعریف یوں کی تھی وہ ایک ایسے عالم اور استاد ہیں جو پاکستان میں تاریخ کی مسخ شدہ صورت حال کو اپنی تحریروں کے ذریعہ تبدیل کرنے اور صحیح تاریخ نویسی کے لئے جرأت آزمائی کر رہے ہیں۔

یہ کتابیں پڑھ کر یوں لگا کہ جیسے ڈاکٹر مبارک علی اپنے ہی جھنڈ کے بچھڑے ہوئے آہو رم خوردہ ہیں۔ طبیعت مفرح ہوئی اور ڈاکٹر مبارک علی کے لئے احترام کے ساتھ ساتھ محبت کا جذبہ بھی بیدار ہوا جو آج تک موجود ہے۔

بعد میں ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ میری ہر کاوش کو ڈاکٹر مبارک علی کی کم و بیش حمایت حاصل رہی۔ ارتقاء کتابی سلسلہ کا اجراء ہو یا ارتقاء انسٹی ٹیوٹ کا قیام یا پھر اس ادارے کے پلیٹ فارم سے مختلف النوع اجتماعات کا انعقاد ہو، ڈاکٹر مبارک علی کا تعاون شامل حال رہا۔

ہم دونوں کا باہمی تعلق خاندانی تعلق میں تبدیل ہوا۔ گھروں میں آنا جانا شروع ہوا۔ کئی بار کراچی

آنے پر وہ لاکھ زحمت کے باوجود غریب خانے پر قیام کرتے اور میں جب کبھی لاہور جاتا تو اُن کی بے حد خلیق بیگم ذکیہ زیدی پر اپنی مہمانی کا بوجھ ڈالتا۔ بلکہ ایک سے زائد بار تو پورے خاندان کا بوجھ ہی انہیں اٹھانا پڑا۔ یوں محبت وخلوص کے رشتے ہمارے خاندانوں کے مابین استوار ہوئے۔

اگر چہ اب دنیا بھر کی طرح کراچی میں بھی ان کے مداحین اور چاہنے والوں کا ایک وسیع وعریض حلقہ ہے جس میں گھرے ہونے کے باعث ڈاکٹر مبارک علی سے پہلے جیسی کثرت اور تواتر سے ملاقاتیں نہیں ہو پاتیں۔ مگر اُن کے لئے دلی محبت کے جذبات میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ اپنی محبت کے اظہار کے طور پر ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی ایک کتاب بھی میرے نام معنون کی ہے۔ جو میرے لئے سرمایہ ہے۔

حق بات یہ ہے کہ مختصر سی تحریر میں نہ تو ڈاکٹر مبارک علی کی تعریف وتوصیف کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ ان کے علمی کارناموں کا اعتراف، اور یہ کام آج ملک کے طلباء، اساتذہ اور روشن خیال حلقوں کی طرف سے کیا ہی جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تحریر کے غازی ہیں۔ ان کی بے لاگ تحریروں سے بہت لوگ متاثر ہوئے ہیں اور اگر آج ملک میں مستحکم شدہ جھوٹ کے بخیہ ادھیڑنے کے تھوڑے بہت آثار دکھائی دیتے ہیں تو بلاشبہ ان میں ڈاکٹر مبارک علی کی مساعی کا بھی حصہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ناتوانی خودنوشت میں لکھا ہے کہ ”پاکستانی سوسائٹی کا المیہ یہ ہے کہ جیسے جیسے یہ سیاسی، معاشی اور سماجی طور پر غیر مستحکم ہوتا چلا گیا، اسی طرح اس میں قدامت پرستی کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ جب قدامت پرستی کی زنجیریں مضبوطی سے لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں، جب ذہن روایات کی ہتھکڑیوں میں اسیر ہوتے ہیں، تو اس وقت مشکل ہوتا ہے کہ اس قید سے کیسے آزاد ہوا جائے۔“

ڈاکٹر مبارک علی چونکہ اپنے ہی الفاظ میں ”روایات اور قدامت پرستی کے منحرفین میں سے ہیں“ لہٰذا زندگی گزارنا انہیں مشکل بھی پڑا ہے اور مہنگا بھی۔ مگر صریح دروغ پر مبنی لکھی جانے والی تاریخ کی پردہ کشائی اور صحیح تاریخ نویسی کے لئے لاتعداد مضامین اور کتب کو تحریر کرنا اور شائع کرانا کسی مجاہدے سے کم نہیں۔

علمی وسماجی منافقتوں سے متنفر، اور اپنے نظریاتی موقف پر تمام تر مخالفتوں، مخالفوں کی ریشہ دوانیوں، ایذا دہی، معاشی تکلیفوں اور معاشرے کی عمومی ناقدری کے باوجود ثابت قدم رہنے، اپنے مشن کو جاری رکھنے اور علم تاریخ کا شعور عام کرنے کے سبب میرے دل میں ان کی محبت اور میری نظروں میں ان کا وقار اور احترام بڑھتا ہی گیا ہے۔



ڈاکٹر مبارک چونکہ علم کے ایک سچے رسیا اور اس میدان کے پکّے کارگذار ہیں لہٰذا وہ جانتے ہیں کہ ”محض تحریر یا تقریر کے ذریعہ معاشرے میں تبدیلی نہیں آتی ہے“، تبدیلی کے لئے سیاسی عمل ہی راستہ ہے اور اس کے لئے سیاسی جماعت یا جماعتوں کا تبدیلی کے لئے تحریک چلانا لازمی امر ہے۔ مگر تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلانے والی تحریروں اور تقریروں کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں کہ ”پاکستان کو ایسے دانشوروں کی ضرورت ہے جو بدلتے ہوئے حالات میں سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کی نشاندہی کرتے ہوئے نئے خیالات اور افکار پیدا کریں۔“

بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حمزہ علوی، سبط حسن، علی عباس جلالپوری، ضمیر نیازی جیسے دانشوروں کی فہرست میں ڈاکٹر مبارک علی بھی ایک ایسے ہی دانشور ہیں جن کے دم سے جہالت، توہم پرستی، قدامت پرستی کے گھُپ اندھیروں میں روشنی کے جھماکے ہوتے ہیں اور اُمید کی کرن نظر آتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس عہد خرابی، ملکِ ناپرسان اور علم دشمن معاشرے میں مبارک علی ان خال خال ہستیوں میں ہیں جو اس عہد میں نوجوانوں کے لئے مثالیہ اور Role Model ہیں۔

# تاریخ کا شعور اور ڈاکٹر مبارک علی

مقتدا منصور

1960ء کے عشرے میں تقریباً ہر پڑھے لکھے مڈل کلاس گھرانے میں نسیم حجازی کے ناول پڑھنے اور رکھنے کا فیشن ہوا کرتا تھا۔ ان ناولوں کے پڑھنے پر عمر کی پابندی بھی نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ عام طور پر بچوں کو رومانوی ناول پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، لیکن نسیم حجازی کے ناولوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی، کیونکہ والدین کا خیال ہوتا تھا کہ ان ناولوں کے پڑھنے سے ان کی اولاد تاریخ سے آگہی حاصل کرے گی۔ حالانکہ تاریخ کے نام پر ان ناولوں نے مڈل کلاس میں جو تہذیبی نرگسیت ذہنوں میں پیدا کی، آج وہ اس معاشرے کی تباہی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ آٹھویں اور نویں جماعت کے دوران ہمیں بھی نسیم حجازی کے ناول پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ابتدا میں ہم بھی ان ناولوں کے چٹخارے سے محظوظ ہوئے اور انہیں اپنی تاریخ سمجھنے لگے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ اگر جاری رہتا تو ہمارے ذہن میں بھی اس تہذیبی نرگسیت کا خمار پختہ ہوجاتا اور ہم بھی اسی راستے پر چل رہے ہوتے جس پر بہت سے ہم وطن گامزن ہیں۔ وہ تو بھلا ہو NSF کا میٹرک پاس کرنے کے بعد جس کے رکن بنے اور جس نے ہماری ذہنی و فکری تربیت میں کلیدی کردار ادا کرتے ہوئے ہمیں حقیقت پسندانہ انداز میں معاملات و مسائل کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کا شعور بخشا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے، جب طلباء تنظیمیں اسلحہ رکھنے کی بجائے بحث و مباحثہ اور دلیل و مکالمہ کے ذریعہ اپنے نظریات پروان چڑھانے کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس مقصد کے لئے ان کے یہاں باقاعدگی کے ساتھ ہفتہ وار اسٹڈی سرکلز کا انعقاد ہوا کرتا تھا، جن میں شرکت لازمی طور پر کتب بینی سے مشروط ہوتی تھی۔ NSF میں شمولیت اور اسٹڈی سرکلز میں شرکت سے کئی فوائد ہوئے۔ اول یہ کہ صرف نصابی کتب پر تکیہ کرنے کی بجائے مختلف موضوعات پر کتب بینی کی عادت پڑی، جو آج تک قائم ہے۔ کیونکہ اسٹڈی



سرکل کی ہر نشست میں کسی نہ کسی موضوع پر بحث ہوتی اور اس میں لازمی طور پر شرکت کرنا ہوتی تھی۔ بغیر پڑھے ان مباحث میں شریک ہونے کا مطلب اپنی سبکی کرانا تھا۔ دوئم، سائنس کا طالب علم ہونے کے باوجود سماجی علوم کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ سوئم، سماجی مسائل کو سمجھنے اور ان کا سائنسی انداز میں تجزیہ کرنے کی اہلیت میں اضافہ ہوا۔ ان اسٹڈی سرکلز میں تاریخ پر خصوصی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس لئے تاریخ کے مطالعہ میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ سکھر میں دو بڑی پبلک لائبریریاں تھی۔ ایک معصوم شاہ میونسپل لائبریری اور دوسری جنرل لائبریری۔ ان دونوں لائبریریوں میں تاریخ پر خاصی کتب تھیں، جن میں انگریزی، اردو اور سندھی میں لکھی کتب شامل تھیں۔ لیکن یہ زیادہ تر بیانیہ تھیں۔ جنرل لائبریری میں ابن خلدون کے مقدمہ، چچ نامہ اور باری علیگ مرحوم کی ''کمپنی بہادر کی حکومت'' پڑھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں سبط حسن مرحوم کی موسیٰ سے مارکس تک اور پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء شائع ہوئیں۔ ان دونوں کتب نے ذہن میں لگے جالے صاف کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت مختلف محفلوں اور مذاکروں میں یہ بات ہوا کرتی تھی کہ انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں تو تاریخ کا ہر پہلو سے جائزہ موجود ہے، لیکن اردو میں ایسی کتب کا فقدان ہے، جو تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کریں۔

سکھر سے گریجویشن کرنے کے بعد ماسٹرز کرنے کے لئے سندھ یونیورسٹی جانا ہوا۔ اس زمانے میں سائنس فیکلٹی کے شعبہ جات تو جامشورو منتقل ہو گئے تھے، لیکن آرٹس فیکلٹی ہنوز حیدرآباد والے پرانے کیمپس میں تھی۔ طلبہ سیاست سے تعلق کی وجہ سے اکثر و بیشتر اولڈ کیمپس جانا ہوتا تھا۔ وہاں کسی دوست نے بتایا کہ شعبہ تاریخ میں ایک استاد مبارک علی خان نام کے ہیں، جو تاریخ کے مختلف موضوعات پر ترقی پسندانہ اور تجزیاتی انداز میں مضامین لکھ رہے ہیں۔ لیکن کچھ طلبہ سیاست کی سرگرمیوں اور کچھ تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ جامشورو میں دو برس گذارنے کے بعد سکھر اور پھر کراچی آگیا۔ کراچی آنے کے بعد ان کی کچھ تحریریں نظر سے گذریں اور ایک دو کتابیں بھی سامنے آئیں۔ جن سے ان کی سوچ کا ہی نہیں بلکہ تاریخی موضوعات کو تجزیاتی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوا۔ اگلے دس برسوں کے دوران ان کی کئی کتابیں مارکیٹ میں آچکی تھیں اور بائیں بازو کے حلقوں میں ان کی خاصی پذیرائی ہو رہی تھی۔ میں خود بھی ان کا مستقل قاری بن چکا تھا اور ان کے طرز تحریر سے خاصا متاثر تھا۔ خاص طور پر سندھ کی تاریخ کے بارے میں ان کے حقیقت پسندانہ (Rational) خیالات نے خاصی دھوم مچائی۔ بعض حلقوں نے ان پر تنقید بھی کی لیکن مثبت سوچ رکھنے والے حلقوں نے ان کے اس جرات مندانہ اقدام کو کھل کر سراہا۔ میرے دل میں بھی ان کے لئے

غائبانہ احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ مگر ملاقات پھر بھی نہ ہو سکی۔ ایک روز اتفاقاً برادرم راحت سعید سے
ملاقات کے لئے گیا تو وہاں درمیانی قامت، کشادہ پیشانی، کھلتی ہوئی گوری رنگت اور مسکراتی آنکھوں
پر موٹا سا نظر کا چشمہ لگائے ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ راحت سعید صاحب نے تعارف کرایا
کہ یہ معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی ہیں۔ اس طرح ان سے پہلی بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ وہ بغیر
کسی جھجک انتہائی بے تکلفی کے ساتھ ملے اور کافی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ غالباً
1980ء کی دہائی کے آخری برسوں کی بات ہے۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے سندھ یونیورسٹی
سے استعفیٰ دیدیا ہے اور لاہور منتقل ہو گئے ہیں، جہاں انہوں نے گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ریزیڈنٹ
ڈائریکٹر کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔

اس دوران زاہدہ حنا نے روشن خیال کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ شروع کیا۔ جس میں ہمیں نائب
مدیر کی ذمہ داریاں تفویض کیں۔ اگلے برس ہمیں خاندان کی ایک تقریب میں شرکت کی غرض سے لاہور
جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے سوچا کہ لاہور میں قیام کے دوران کیوں نہ لگے ہاتھوں کچھ اہم شخصیات کے
انٹرویوز بھی کر لئے جائیں۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ صفدر میر مرحوم، قاضی جاوید اور ڈاکٹر مبارک علی کے انٹرویوز کر
لئے جائیں۔ لہٰذا اس انٹرویو کے بہانے ڈاکٹر صاحب سے دوسری طویل ملاقات گوئٹے انسٹیٹیوٹ میں ان
کے دفتر میں ہوئی۔ یہ ملاقات ہماری ان کے ساتھ دائمی دوستی اور احترام کے تعلق کی بنیاد بنی۔ اس کے بعد
ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رہنے لگا۔ وہ ان دنوں خاصے مطمئن اور خوش تھے اور سندھ یونیورسٹی میں ہونے
والی تلخیوں کو بھلانا چاہتے تھے۔ گو کہ گوئٹے انسٹیٹیوٹ میں ان کی ملازمت بھی عارضی ثابت ہوئی اور اگلے
برس اس سے بھی مستعفی ہو گئے۔ لیکن لاہور کو بہر حال انہوں نے اپنا مستقل مستقر بنا لیا اور ملازمتوں کی
بجائے اپنی پوری توجہ تصنیف و تالیف پر مرکوز کر دی۔ وہ گذشتہ 24 برس سے لاہور میں مقیم ہیں۔ جہاں
رہتے ہوئے انہوں نے تاریخ کے مختلف موضوعات پر معرکۃ الآرا کتب کے علاوہ ایک تحقیقی جریدہ
سہ ماہی ''تاریخ'' بھی شائع کرتے ہیں۔ جس کے اب تک 45 شمارے مارکیٹ میں آچکے ہیں اور اس
مضمون کی اشاعت تک 46واں شمارہ بھی منظر عام پر آچکا ہوگا۔

گوئٹے انسٹیٹیوٹ میں ہونے والی ملاقات سے قائم ہونے والی دوستی تا دم تحریر قائم ہے۔
وہ جب بھی کراچی آتے ہیں، ان سے ملاقات لازمی ہے، بشرطیکہ میں شہر سے باہر نہ ہوؤں۔ ڈاکٹر
کھری طبیعت کے مالک ہیں۔ دل کی بات زبان پر لے آتے ہیں۔ منافقت اور چاپلوسی انہیں
چھو کر بھی نہیں گذری۔ اسی عادت کے سبب اکثر انہیں ہزیمت بھی اٹھانا پڑتی ہے۔ بہت سے لوگ



ان کی صاف گوئی کو ناپسند بھی کرتے ہیں۔ لیکن سمجھ دار اور بااصول لوگوں کی نظر میں ان کی اسی
عادت کی وجہ سے ان کی قدر و منزلت دوچند ہوئی ہے۔ ان تیس برسوں کے تعلق میں میں نے کبھی
انہیں کوئی غیر معقول یا بے اصولی کی بات کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی انہوں نے اپنے ذاتی مفادات
کی خاطر دوستوں کو زیر وزبر نہیں کیا۔ وہ اپنی کھال میں مست رہنے والے قلندر صفت انسان
ہیں، جن کی زندگی کا سرمایہ ان کا علم اور قناعت پسندی ہے۔ واقعی ایک سچے اور کھرے دانشور کی
تمام خصوصیات ان میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی تاریخ کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔
وہ انگریزی روزنامہ ڈان میں ہفت روزہ کالم ماضی اور حال کے عنوان سے کئی برسوں سے تحریر کر
رہے ہیں۔ ان کی تاریخ کے مختلف موضوعات پر ساٹھ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں
مغل دربار، سندھ کی تاریخ کیسے لکھی جائے، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، تاریخ اور عورت، علماء اور سیاست،
تاریخ اور دانشور، تاریخ اور آج کی دنیا، تاریخ اور آگہی، برطانوی راج، اکبر کا ہندوستان، جہانگیر کا
ہندوستان وغیرہ نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کے علاوہ ان کی دو سوانح در در ٹھوکر کھائے اور
میری دنیا بھی شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی کی تحاریر سادہ زبان، پُرکشش انداز بیان اور پُرمغز دلائل کی وجہ سے اثر انگیز
ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کو متاثر کرتی ہیں اور تاریخ کو پڑھنے پر راغب
کرتی ہیں۔ اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ سب سے بڑی مثال تو خود میرے اپنے گھر کی
ہے۔ میری بیٹی ارم جوائنر میڈیٹ میں پری میڈیکل کی طالبہ تھی۔ امتحانات کے بعد تین ماہ کی فراغت
کے دوران اس نے میری کتابوں کی الماری سے ڈاکٹر صاحب کی کتب کا مطالعہ شروع کیا اور اسے
تاریخ میں دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوگئی۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تقریباً 90 فیصد کتب
میرے پاس ہیں۔ جب رزلٹ آیا تو اس نے فرسٹ کلاس میں انٹر پاس کر لیا تھا۔ ہم اس کے میڈیکل
کالج میں داخلے کا انتظار کرنے لگے، کہ ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا کہ پپا، اگر آپ ناراض نہ ہوں
تو ایک بات کہوں۔ میں نے کہا کہ کہو۔ اس نے کہا کہ اگر میں میڈیکل کی بجائے تاریخ کا مضمون لینا
چاہوں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ میری ذمہ داری صرف تمہاری ضروریات
کی تکمیل ہے۔ نہ کہ تمہارے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے۔ میری بیٹی ارم اس وقت تاریخ میں نمایاں پوزیشن
کے ساتھ ایم اے کر چکی ہے۔ اس کے ذوق اور لگن کو دیکھتے ہوئے میری سب سے چھوٹی بیٹی کرن نے

بھی سائنس چھوڑ کر تاریخ کے کلیدی مضمون کے ساتھ بی اے (آنرز) میں داخلہ لیا ہے۔ ارم کے پاس ان کے ڈان سنڈے میگزین اور ینگ ورلڈ میں شائع ہونے والے مضامین کی پوری فائل موجود ہے، جو اس کی تاریخ سے دلچسپی اور ڈاکٹر مبارک سے عقیدت کا اظہار ہے۔

دوسرا واقعہ جنوبی بلوچستان کے علاقے دشت کا ہے۔ 2005ء میں بذریعہ کار تربت سے گوادر جا رہا تھا۔ راستہ سنگلاخ اور بے آب وگیا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد اس بیابان میں ایک جگہ پانی کا ایک تالاب اور اس کے ساتھ جھگی ہوٹل پر ڈرائیور نے گاڑی روکی تا کہ انجن کو ٹھنڈا کیا جاسکے اور ہم لوگ چائے پی کر تازہ دم ہوسکیں۔ میں جیسے ہی ہوٹل کے اندر داخل ہوا، میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ کاؤنٹر پر ایک کونے پر ڈاکٹر مبارک کی تین چار کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ میرے استفسار پر کاؤنٹر پر بیٹھے ایک انتہائی مہذب اور شائستہ بلوچ نوجوان نے بتایا کہ وہ ہوٹل کے مالک کا بیٹا ہے اور اپنے والد کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کا کہنا تھا ڈاکٹر مبارک علی کی تحاریر نے اسے سیاسی وسماجی مسائل کو سمجھنے کا شعور دیا ہے، اس لئے فارغ اوقات میں وہ ان کی کتب کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر مبارک کی جب کوئی نئی کتاب شائع ہوتی ہے تو کراچی میں اس کا کزن وہ کتاب خرید کر اسے بھجواتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے سکھر، شکارپور اور سندھ کے دیگر اضلاع میں ایسے بیشمار سندھی نوجوان ملتے ہیں، جو ڈاکٹر صاحب کی کتب بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ سندھی قوم پرست تنظیموں میں ان کا نام عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ ایک دو تنظیموں نے انہیں ایوارڈ دینے کا بھی اعلان کیا۔ لیکن معاملہ ایوارڈ لینے یا دینے سے زیادہ اس احترام کا ہے جو نوجوان نسل میں ان کے لئے پایا جاتا ہے۔ ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتب بینی سے فرار کے اس دور میں ڈاکٹر مبارک کی تحاریر نوجوانوں میں سماجی مسائل کو تاریخ کے تناظر میں سمجھنے کا شوق پیدا کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔

یہاں اپنے والد کا ایک قول نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تین علوم ایسے ہیں جو انسان کی ذہنی وسعت میں اضافے کا باعث بنتے ہیں، یعنی ادب، قانون اور تاریخ۔ مگر آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف یہ تینوں مضامین ہی نہیں بلکہ دیگر سماجی علوم کی طرف وہ طلبہ وطالبات آتے ہیں، جنہیں انٹرمیڈیٹ میں اچھے نمبر نہیں ملتے۔ حالانکہ اصولی طور پر ذہین طلبہ وطالبات کو سماجی علوم کا انتخاب کرنا چاہئے، کیونکہ آگے چل کر انہیں ہی ملک کی باگ دوڑ سنبھالنی ہوتی ہے۔ لیکن صرف نوجوان ہی نہیں، بلکہ تعلیم یافتہ والدین بھی اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر سائنس، ٹیکنالوجی



اور مینجمنٹ سائنسز کی طرف بھیجتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ ہمارے ملک میں سماجی علوم میں فارغ التحصیل افراد کے لئے روزگار کے ذرائع محدود ہیں۔ دوئم، پُرکشش ملازمتیں جن شعبہ جات میں ہیں، وہاں سماجی علوم کی بجائے مینجمنٹ سائنسز یا ٹیکنالوجی کے فارغ التحصیل افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوئم، ہمارے معاشرے میں بچوں کے ذہنی رجحان یا میلان کو جانچنے کا کوئی طریقہ کار نافذ العمل نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے سماجی علوم کی نہ بہتر تدریس ہورہی ہے اور نہ ہی سرکاری سطح پر ان علوم میں تحقیق و تخلیق کی سرپرستی کی جارہی ہے۔ لہٰذا سماجی علوم کا انتخاب نوجوان نسل کے لئے محض مجبوری بن کر رہ گیا ہے۔

لیکن ڈاکٹر مبارک علی کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے مینجمنٹ سائنسز اور ٹیکنالوجی جیسے کسبی علوم کی نوجوانوں میں مقبولیت کے اس دور میں سماجی علوم کو بھی قابل قبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نجی شعبہ کی وہ جامعات جنہوں نے چند برس پہلے تک خود کو صرف مینجمنٹ سائنسز اور ٹیکنالوجی کی تدریس تک محدود کر رکھا تھا، اب سماجی علوم کی فیکلٹی بھی شروع کر رہی ہیں، جو ایک صحت مند رجحان ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کا ایک دوسرا کریڈیٹ یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں تاریخ نویسی کی روایت کو ایک نئی شکل دی ہے۔ انہوں نے مختلف سماجی امور کا تاریخ کے تناظر میں جائزہ لے کر غور وفکر کے نئے زاویئے کھولے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سے عام موضوعات کو بھی تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کا تصور عام کیا ہے، مثلاً تاریخ اور کھانے، یا تاریخ اور طوائف وغیرہ۔ اس طرح وہ موضوعات جنہیں لوگ عام طور پر سرسری لیا کرتے تھے، ان کا تاریخی پس منظر سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو میں چند دہائی قبل تک انگریزی، عربی اور فارسی میں لکھی گئی بیانیہ تواریخ کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض اہم شخصیات کی سوانح حیات کو بھی تاریخ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخی واقعات پر مبنی جو ناول لکھے گئے، وہ تہذیبی نرگسیت پھیلانے کا سبب بنے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اس رجحان کو بھی چیلنج کیا اور ثابت کیا کہ تاریخ ایک سائنس ہے، جس کی اپنی حرکیات ہے اور جو سماجی تبدیلی کے عمل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر مبارک علی نے مختلف سماجی موضوعات پر تاریخ کے تناظر میں بحث شروع کر کے اس معاشرے پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں خواندگی کی شرح کم اور غور وفکر کی روایت کمزور ہو، وہاں لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرنے اور انہیں بہتر سمت کے تعین میں

مدد دینے میں تاریخی حوالے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی حال کا ماضی سے تقابل کر کے مستقبل کے لئے نئی راہیں تلاش کرنے کی جستجو پیدا کرنے کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا انہیں طویل عمر صحت اور تندرستی کے ساتھ عطا کرے، تا کہ وہ یونہی اس معاشرے کی فکری راہنمائی کرتے رہیں۔



# ڈاکٹر مبارک علی — حیدرآباد کی یادیں

رفیق احمد

بائیں بازو اور لبرل سوچ رکھنے والے ڈاکٹر مبارک علی خان اپنے مزاج اور رویے اور گفتار میں جس قدر سادہ اور علمی دلائل رکھنے والی شخصیت ہیں اس قدر اصولوں اور کمٹمنٹ میں سخت بھی ہیں۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم کہ ان کی آمد سے گھڑیوں کو درست کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی تقریب میں شرکت کا وعدہ کیا تو دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے حاضری ضروری ہے۔ ان کا حلقہ احباب کسی خاص نوعیت یا کسی خاص عمر کا نہیں رہا۔ ان کی دوستیاں پڑھے لکھے لوگوں سے بھی رہیں تو محنت کشوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات پُر جوش رہے۔ بزنس مین، سرکاری افسران، اساتذہ، شاعر، ادیب، افسانہ نگار، تاریخ داں، سماجیات، سیاسیات، فلسفہ، عمرانیات، غرض ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے حلقہ احباب میں شامل رہے۔ طلباء اور نوجوان بھی ان کے حلقہ احباب کا حصہ تھے اور اب بھی ہیں۔

پاکستان میں تاریخ کا صرف ایک تصور رہا ہے۔ اسلامی تاریخ اور اسی سے جڑی ہندوستان کی بھی وہ تاریخ جس دور میں مسلمان حکمران رہے اسی بنا پر پاکستان میں بالخصوص ہائی اسکول اور کالجوں کے طلباء میں بھی تاریخ کا مضمون مذہبی مضمون کا ایک حصہ ہی تصور کیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی خان نے اپنی تحقیق اور پی ایچ ڈی کے مقالے میں مغلیہ دور کا جس طرح تجزیہ کیا وہ تاریخ کے طالب علم کو چونکا دینے سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ڈاکٹر مبارک کے مضامین تنقیدی نشستوں میں سنائے جانے لگے یا تحریری شکل میں لوگوں تک پہنچنے لگے تو ان پر بہت تنقید بھی ہوئی۔ خاص طور سے مسلمانوں کی تاریخ جو عرصہ دراز سے فاتحین، مصلح، سخی اور ان داتا کے طور پر پیش کیے جا رہی تھی اور اس سماج میں عوام کی حالت زار سے متعلق تاریخ نہیں ملتی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی خان نے عوام الناس کو اپنی تحقیق اور تصنیف کا عنوان بنایا۔ تاریخ کا سائنسی اور معروضی حالات کے تحت تجزیہ کیا۔

حیدرآباد جیسا چھوٹا شہر اپنی کئی شناخت رکھتا ہے۔ تاریخی عمارتیں، تاریخی واقعات، فن تعمیر، حکمران خاندان اگر اس شہر کی شناخت ہیں تو بعض ایسی شخصیات بھی اس شہر کی شناخت بنیں ان ہی میں ڈاکٹر مبارک علی خان بھی شامل ہیں۔ تاریخ کے علم کے ساتھ ساتھ تہذیب، ثقافت، ادب سے بھی گہری وابستگی ان کا مشغلہ رہا۔ وقت کی پابندی اور قدر جاننے والوں کے لیے بھی ڈاکٹر مبارک علی خان ایک بڑی مثال ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی خان سے پہلی ملاقات 1977 میں پروفیسر نایاب حسین کی معرفت ہوئی۔ یہ 77ء کی انتخابی مہم کا دور تھا۔ ہم این ایس ایف کی طرف سے اس انتخابی نظام کے خلاف سرگرم تھے۔ جس طرح سیاسی جماعتیں انتخابی مہم چلا رہی تھیں اس طرح ہم لوگ اس کے خلاف کارنر میٹنگز کرتے تھے۔ چھونکی گٹی پر ایک ایسی ہی کارنر میٹنگ کے دوران ہجوم میں موجود ایک شخص با آواز بلند مقررین کی حمایت کر رہا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو وہ آگے بڑھ کر مقررین سے ملے۔ یہ پروفیسر نایاب حسین تھے جن کا تذکرہ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب میری دنیا (آپ بیتی) میں بھی کیا۔ پروفیسر نایاب حسین سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ساتھ ہی ان کے حلقہ احباب اور ہم خیال یعنی بائیں بازو اور لبرل سوچ رکھنے والوں سے بھی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ان ہی میں ڈاکٹر مبارک علی خان بھی تھے۔ ان کی بائیں بازو کی سوچ فکر اور علم سے ہم جیسے طالب علموں کو سیکھنے کا بہت موقع ملا۔ تاریخ کا جدلیاتی انداز میں جاننے اور پڑھنے کا شعور ڈاکٹر مبارک علی کی ملاقاتوں سے ہی یقینی بنا۔ اس سے قبل ہم سب تاریخ کو مذہب کا ایک جُز سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کچھ عرصہ قبل ہی جرمنی سے تاریخ میں پی ایچ ڈی کر کے واپس آئے تھے اور سندھ یونیورسٹی میں تاریخ پڑھا رہے تھے۔ کالج سے فارغ ہو کر ہم نے بھی سندھ یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں داخلہ لیا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ سندھ یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے فرسٹ فلور پر ہمارا شعبہ تھا اس کے اوپر شعبہ تاریخ تھا۔ کلاسوں اور یونیورسٹی کے دیگر سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مبارک اور شعبہ فلسفہ کے استاد پروفیسر فریدالدین شیخ کے ساتھ بھی خاصا وقت گزرتا تھا۔ شعبہ تاریخ میں طلبا کی کمی کے باعث ڈاکٹر مبارک علی خان کا زیادہ وقت پاکستان اسٹڈیز سینٹر کی لائبریری میں گزرتا تھا۔ اکثر وہ سارا سارا دن وہاں پڑھنے اور لکھنے میں گزارتے تھے۔ یونیورسٹی سے باہر شہر کی محفلوں میں ڈاکٹر مبارک علی خان کی شرکت بھی خاصی ہوا کرتی تھی۔ ادبی نشستیں ہوں یا مشاعرے کی محفلیں یا کسی سماجی اور تاریخی موضوع پر کوئی مباحثہ ڈاکٹر صاحب موجود رہتے۔ پاکستان نیشنل سینٹر ان دنوں شہر کی سماجی، ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ سید جوہر



حسین اس کے ڈائریکٹر تھے جو خود بھی صاحب دانش اور مجلسی انسان تھے۔ ان دنوں ایسا لگتا تھا کہ جوہر حسین اور نیشنل سینٹر کے بغیر شہر کی کوئی سماجی، ادبی سرگرمی کوئی مشاعرہ، کوئی تاریخی مباحثہ ادھورا ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ ان سرگرمیوں میں ڈاکٹر مبارک علی خان کی عدم موجودگی بھی ادھورے پن کا احساس دلاتی تھی۔

یونیورسٹی اور شہر کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ چند احباب نے مل کر ایک بے نام کلب بنالیا تھا۔ جو ہر جمعرات کو کیوں کہ ان دنوں جمعہ کی چھٹی ہوا کرتی تھی جمعرات ویک اینڈ تھا۔ یہ احباب مل بیٹھتے تھے۔ علم و ادب سے تعلق رکھنے والی ان شخصیات میں سرفہرست ڈاکٹر مبارک علی خان ہی تھے جو نہ صرف کسی ناغے کے بغیر شریک ہوتے بلکہ اس نشست میں تنقید کے لیے پیش کی جانے والی 90 فیصد تحریریں ان ہی کی ہوا کرتی تھیں۔ اس بے نام کلب جسے میں نے بیٹھک کا نام دیا، کی نشستیں دیال داس کلب میں ہوتی تھیں۔ سردی میں دیال داس کلب کے اندرونی حصے میں ایک کمرہ مہیا ہو جایا کرتا تھا، گرمیوں میں لان کے سبزے پر کرسیاں اور سر پر بجلی کے کھمبے پر لٹکایا ہوا بلب ہوا کرتا تھا۔ شرکا میں ریڈیو اور ادب کی بڑی شخصیت الیاس عشقی، یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے پروفیسر فریدالدین شیخ، سٹی کالج کے تاریخ اور سیاست کے پروفیسر زبید احمد فردوسی، ممتاز ماہر تعلیم مرزا عابد، ممتاز افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ڈاکٹر حسن منظر، کاظم رضا کے ساتھ میں ایک طالب علم کی حیثیت اور ہمارے دوست شکیل پٹھان اس نشست کا مستقل حصہ ہوا کرتے تھے۔ گاہے بگاہے آنے والوں میں ڈاکٹر مبارک علی خان کے استاد تاریخ کے پروفیسر احمد بشیر جن کی بینائی کافی حد تک کم ہو گئی تھی، جوہر حسین، حیدرآباد بورڈ کے مرزا اسلم، سندھ میوزیم کے ڈائریکٹر ظفر کاظمی، ممتاز شاعر حمایت علی شاعر جو ان دنوں سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے شامل ہیں۔ کبھی کبھی این ایس ایف کے دیگر دوست بھی آ جایا کرتے تھے۔ بیٹھک میں شہر اور ملک کے حالات حاضرہ پر گفتگو کے ساتھ ساتھ کوشش ہوا کرتی تھی کہ شرکا میں سے ہر ایک کچھ لکھ کر لائے، ڈاکٹر حسن منظر نے اپنے کئی افسانے اسی نشست میں سنائے جو بعد میں کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ الیاس عشقی صاحب کبھی کبھی اپنی شاعری سنا دیا کرتے تھے۔ مگر ڈاکٹر مبارک علی خان تواتر کے ساتھ مضامین لکھا کرتے تھے۔

دیال داس کلب کی اس بیٹھک میں لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تو چل ہی رہا تھا۔ ساتھ ہی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ ڈاکٹر مبارک علی خان جو تواتر کے ساتھ مضامین لکھ کر بیٹھک میں پیش کر رہے تھے شرکا کا تقاضہ بڑھ رہا تھا کہ اسے شائع بھی ہونا چاہیے۔ سوال یہ تھا کہ کیسے شائع ہو۔ کوئی ادارہ ایسا

نہیں تھا جو تاریخ کے حوالے سے کتاب شائع کرے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش لاہور جا کر ضرور پوری ہوئی۔ حیدرآباد جیسے چھوٹے اور دو لسانی شہر میں یہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی خان کی مالی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ ازخود اشاعت کے اخراجات برداشت کر سکیں لہٰذا فیصلہ ہوا کہ چوں کہ ڈاکٹر صاحب کی لکھائی اچھی ہے وہ خود کالی سیاہی سے بٹر پیپر پر اپنی کتاب کا مواد تحریر کریں اس طرح کتابت کا خرچ بچے گا جسے چھپائی کے دیگر معاملات میں استعمال کیا جاسکتا ہے اس طرح پہلی کتاب جسے کتابچہ بھی کہا جاسکتا ہے "تاریخ کیا ہے" شائع ہوئی اس کے لیے ادارہ بھی تشکیل دیا گیا جس کا نام آگہی پبلی کیشنز رکھا گیا۔ بیٹھک کے دوسرے اہم رکن ڈاکٹر حسن منظر اس قابل تھے لہٰذا انہوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ترتیب دیا۔ افسانے کے مجموعہ کا نام رہائی تھا۔ سندھی کے معروف ادیب طارق اشرف کے پریس سوہنی میں شائع ہوا۔ ان کے پاس سندھی کے حروف تو تھے۔ اردو کے نہیں تھے۔ لہٰذا خصوصی طور پر کراچی سے اردو کے حروف بنوائے گئے اور ان سے کمپوزنگ کرا کے کتاب شائع کی گئی۔ بعد ازاں ڈاکٹر مبارک علی خان اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اردو کے حروف جو ڈاکٹر حسن منظر نے بنوائے تھے کمپوزنگ کے ساتھ شائع کرایا۔

ڈاکٹر مبارک علی ان اساتذہ کرام میں سے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا کتاب اور قلم ہے۔ علم اور تحقیق ہے۔ فالتو بیٹھنا ان کے نزدیک قیمتی وقت کا زیاں ہے اور پاکستان جیسے پس ماندہ یا ترقی پذیر ملک میں ہر ایک فرد کا ایک ایک منٹ بہت اہم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ سندھ یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے تو کلاس نہ ہونے کے باعث ان کا سارا وقت لائبریری میں گزرتا تھا۔ ایک نشست میں کتاب کے کئی کئی صفحات پڑھ لینا یا لکھ لینا ان کا معمول تھا۔ علم اور تحقیق کی اس جستجو اور جدوجہد ہی کا شاید تقاضا تھا کہ انھوں نے حیدرآباد میں جرمن زبان سکھانے کا بھی بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کرنے کے باعث جرمن زبان سیکھی تھی۔ اس سلسلے میں مہران آرٹس کونسل کی خدمات لی گئیں اور وہاں جرمن زبان سکھانے کی کلاسوں کا اجراء کیا گیا۔ 80ء کی دہائی میں سندھ یونیورسٹی کے حالات میں سیاسی مداخلت بڑھنے لگی تھی۔ مارشل لاء کے دور کا بعض لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا، مراتب اور عہدے حاصل کیے اور ڈاکٹر مبارک علی خان جیسے لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کیں۔ وہ ان ساری سازشوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ایسے میں انہیں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور سے پیش کش ہوئی تو کسی تردد کے بغیر انہوں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ سندھ یونیورسٹی کو خیر باد کہا اور لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور اشاعتی اداروں کا مرکز اور اہل علم اور اہل قلم کے حوالے سے زرخیز زمین ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی خان جیسے خودرو پودے کو



بھی اسی فضا میں کافی جلا ملی۔ آج یقیناً سندھ یونیورسٹی کے لوگ جنھوں نے ان کی راہ میں کانٹے بچھائے سوچتے ضرور ہوں گے کہ اگر ڈاکٹر مبارک صاحب سندھ یونیورسٹی سے وابستہ رہتے تو ان کو یہ نام اور جو مقام حاصل ہوا ہے وہ سندھ یونیورسٹی کے ساتھ جڑ جاتا۔

1984ء میں، میں کراچی آیا اور جنگ اخبار سے وابستہ ہو گیا یوں ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہوتا گیا پھر ڈاکٹر مبارک صاحب لاہور منتقل ہو گئے تو یہ ملاقاتیں تقریباً ختم ہی ہو گئیں۔ وہ کراچی یا حیدرآباد کبھی آتے تو سرسری سی ملاقات ہی ہو پاتی تھی ایک طویل عرصے کے بعد ہم ایک ساتھ ایک ادارے سے وابستہ ہوئے ہیں تو ملاقاتیں تو نہ سہی مگر رابطہ دورِ جدید کا سیل فون نے تعلقات کو پھر مستحکم کر دیا ہے روزنامہ جہان پاکستان میں ڈاکٹر صاحب مستقل کالم لکھ رہے ہیں اور میں جہان پاکستان کراچی کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

# ڈاکٹر مبارک علی

عزیز بگٹی

تاریخ اور فلسفہ میرے دلچسپ مضامین رہے ہیں گو کہ نہ تو میں ڈگری کالج اور نہ ہی یونیورسٹی میں تاریخ کا طالب علم رہا۔ میں نے علم سیاسیات میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی اور یونیورسٹی بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی لیکن جب میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی یونیورسٹی آف اریزونا، ٹوسان میں زیر مطالعہ تھا تو میرا میجر سبجیکٹ مشرق وسطیٰ کی تاریخ وسیاسیات جبکہ مائنر سبجیکٹ برصغیر کی تاریخ رہا۔ تاریخ کے ایک قاری کی حیثیت میں میں نے ڈاکٹر مبارک علی کا نام کافی سنا تھا اور ان کی کافی کتب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ان سے میری بالمشافہ ملاقات پہلی بار فکشن ہاؤس، لاہور کے جناب ظہور احمد خان کے دفتر میں ہوئی تھی۔ ملک کے اس نامور مورخ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات کوئٹہ میں اس وقت ہوئی جب وہ ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کی علمیت سے کافی متاثر ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک ظہور احمد خان کے ذریعے میرا ان سے سلام دعا کا سلسلہ جاری ہے۔

اسی دوران ظہور احمد خان میری کتاب ”بلوچستان: شخصیات کے آئینہ میں“ کا تیسرا ایڈیشن شائع کر رہے تھے۔ اس کا تعارف ڈاکٹر مبارک علی نے تحریر کیا تھا جس پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا کہ پاکستان کے نامور اور حقیقی مورخ نے میری کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میرے لئے یہ بات باعث اعزاز رہے گی کہ میری اس کتاب کا پیش لفظ نواب اکبر خان بگٹی نے تحریر کیا تھا اور اس کا کور فلیپ ڈاکٹر مبارک علی نے تحریر کیا۔

میری کچھ سطور جو ملک کے عظیم مورخ کے بارے میں شائع ہونے والی کتاب کا حصہ بننے والی ہیں۔ اس میں حوالے کے لئے چند شائع شدہ الفاظ شامل کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔



نواب اکبر خان بگٹی شہید نے اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ پیش لفظ میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

”باوجود اس کے کہ ہم نے تاریخ میں کوئی بڑا نام پیدا نہیں کیا، ہم نے کبھی اور کہیں ایسی زیادہ عظمت حاصل نہ کی لیکن ہمارے لوگ اور رہنما اپنے آپ تک محدود رہے اور اس طرح انہوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ انہوں نے کسی کو خراج تو نہیں دیا۔ یہ بڑی بات ہے کہ ہم نے اپنا مابہ الامتیاز تشخص برقرار رکھا جو آج بھی باقی ہے۔ چاکر پنجاب چلا گیا اور وہیں دفن ہوا۔ گوہرام روپوش ہو گیا اور اس کی قبر کا تو ہمیں پتہ تک نہیں لیکن بلوچوں کا وطن، بلوچوں سے آباد ہے اور بلوچوں کے پاس ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے۔ اپنا وجود ہے۔ ہم بلوچ ہیں بہ حیثیت ایک قوم کے ایک خاص جغرافیائی خطے میں اپنے تشخص کے ساتھ رہتے ہیں۔ بلوچ کسی اور قوم میں مدغم نہیں ہوئے وہ ماضی میں بھی بلوچ تھے اور اب بھی بلوچ ہیں۔“

اب ذرا ڈاکٹر مبارک علی کی تحریر ملاحظہ ہو:

”اہل بلوچستان ابھی تک قبائلی دور میں ہیں کہ یہاں ہر فرد کی شناخت اس کا قبیلہ ہے۔ اگرچہ بلوچ قومیت کی بنیاد پڑ چکی ہے مگر اس قومیت میں قبائلی شناخت کو ختم کرنا ایک بڑا مرحلہ ہے۔ مگر جب تک قومیت کی تشکیل نہیں ہو گی بلوچ قبائلی بنیاد پر بٹے رہیں گے اور اپنے حقوق سے محروم رہیں گے۔“

دونوں ہی تجزیئے اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ ایوب اور بھٹو کے جبر وتشدد اور فوجی آپریشنز کے باعث بلوچ قبائلی حصار سے کسی حد تک نکل کر قومیت کے وسیع تر دائرے میں داخل ہو رہے تھے لیکن ایک بانکے جنرل نے ایک مرتبہ پھر بلوچوں کو قبائلی تقسیم در تقسیم کا شکار بنا دیا۔

اب میں ڈاکٹر صاحب کی تاریخ نویسی کے اس قابل ذکر پہلو کا جائزہ لیتا ہوں جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کو محض حکمرانوں کی فتوحات اور دادودہشت نہیں سمجھتے اور نہ ہی بادشاہی واقعات کا ایک تسلسل۔ وہ تو اسے اپنے دور کے حالات کی ایک تصویر خیال کرتے ہیں جس میں اس دور کے عوام کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مغل دور اکبر کی عظمتوں اور بہادر شاہ ظفر کی محرومیوں کا نام نہیں بلکہ حقیقی داستان تو یہ ہے کہ کئی عوامل اور حالات نے بہادر شاہ ظفر کو انگریز حکمرانوں

کا وظیفہ خوار بن کر لال قلعہ کا متولی بننے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر مبارک علی کی پہچان یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو عوامی لوگوں کی تاریخ بنا دیا۔

تاریخ پر درجنوں کتابیں تحریر کرنے کے علاوہ وہ ''تاریخ'' کے نام سے ایک معیاری سہ ماہی مجلہ بھی شائع کرتے ہیں جس میں انتہائی تحقیقی مواد شامل ہوتا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بارے میں انہوں نے ایک سے زائد مجلے شائع کئے جس میں انہوں نے اس کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ویسے بھی برصغیر کی تاریخ ان کا خصوصی موضوع ہے۔ تاریخ شناسی اور تاریخ فہمی کے ضمن میں اس نے ایک نیا ذہن تیار کیا۔

فکشن ہاؤس کی جانب سے ڈاکٹر مبارک علی کی تین جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ شائع کی گئی جو معیاری طباعت کے علاوہ جامع معلومات کا بھی ذخیرہ ہے۔ ان کی تقسیم کچھ اس طرح ہے:

1- قدیم ہندوستان

2- عہد وسطی کا ہندوستان

3- برطانوی ہندوستان

پہلی جلد میں مسلمانوں کی آمد سے قبل تک کی تاریخ ہے۔ دوسری جلد میں مسلمان حکومتوں کے دور کی تاریخ ہے۔ تیسری جلد کو برطانوی ہندوستان کا نام دیا گیا ہے گو کہ شمولیات کے اعتبار سے یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور تک کی تاریخ ہے۔ میری خواہش ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے بعد 1858ء میں ہندوستان پر براہ راست تاج برطانیہ کے قیام کے بعد سے لے کر 1947ء تک کے حالات کے بارے میں ایک اور جلد تحریر کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے اگر اس دور کی تاریخ رقم ہو تو یہ بھی معلومات کا ایک ذخیرہ ہوگا۔

اپنی تحریر کو طوالت دیئے بغیر میں اتنا ہی کہنے پر قناعت کرتا ہوں کہ ڈاکٹر مبارک علی، اپنی ذات میں تاریخ ہیں اور ہم اس تمام تر ذخیرے کو صفحات پر منتقل ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں جو ملنساری اور انکساری کا عنصر ہے اس کا ذکر نہ کرنا ادبی بددیانتی میں شمار ہوگا۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنے کسی بھی ملنے والے کو اپنی علمیت اور شخصیت سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ یہ سب کچھ ان کی باتوں ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔



# ایک مدبر ۔۔۔ ایک مؤرخ

لطف راجپر ایڈووکیٹ

تاریخ سے میری دلچسپی 2007ء تک یہ ہی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ ایک تو یہ مضمون تضادات سے بھرا ہوا ہے دوسرا یہ کہ تاریخ میں شخصیات کا ہی ذکر ہے اور کچھ نہیں۔ بچپن میں یعنی اسکول میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں سن اور سال طوطے کی طرح رٹائے جاتے تھے۔ فلاں جنگ کب ہوئی؟ کس بادشاہ نے یہ جنگ جیتی؟ بادشاہ نے کتنے سال حکومت کی؟ شاہی جلوس کا سال کون سا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کی ایسی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی جس کے حاشیہ پر جھوٹ نہ لکھا ہوا ہو۔ ظاہر ہے ایسی کتابیں وہ بھی تاریخ کے موضوع پر کسی بھی قاری کا دل اچاٹ کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

2007ء کی ہی بات ہے میں نے ایسے ہی ڈاکٹر مبارک علی کی ایک کتاب اٹھالی اور پڑھتے پڑھتے مجھے محسوس ہوا کہ تاریخ لکھنے کے اور بھی زاویئے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابیں پڑھنے کا جو سلسلہ چل نکلا تو میرے ہاں نئی سوچ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، اور یہ فقط ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کی مرہونِ منت ہوا۔ شخصیات کے گرد جو روایتی تاریخ نے عقیدت کے ہالے بنا رکھے تھے وہ ٹوٹنے لگے عظمتوں کے پردوں سے نکل کر یہ شخصیتیں انسان ہی کی صورت میں نظر آنے لگیں۔ مافوق الفطرت کہانیاں ہوا ہو گئیں، اور تاریخ کا مضمون پڑھنے کا ایسا چسکا لگا کہ ڈاکٹر صاحب کی ساری کتابیں پڑھ لیں، اور دوسروں کو بھی ان کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کتابیں پڑھنے پر زور دیا، اور بہت سارے نوجوانوں نے ڈاکٹر صاحب کو پڑھنا شروع کیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے عزیز دوست حفیظ کنبھر کی توسط سے فون پر بات چیت شروع ہوئی۔ جب ڈاکٹر صاحب 12 دسمبر 2012ء کو حیدرآباد تشریف لائے تو انہوں نے مہربانی کر کے مجھے اور حفیظ کو وقت دیا اور اگلی صبح کو وہ اپنے دوست ظفر صاحب کے ساتھ ہمارے گھر تشریف لائے جہاں

ان سے اچھی خاصی بات چیت بھی ہوئی اور حفیظ نے رات سے ہی ڈاکٹر صاحب کا جو انٹرویو کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا وہ یہاں بھی انہوں نے جاری رکھا۔ انٹرویوز کی ریکارڈنگ میں ہمارے مشترکہ دوست وی۔جی کولبی کی معاونت تھی۔ یہ انٹرویوز بہت تفصیلی ہیں جن کا ڈاکٹر صاحب کے پڑھنے اور سننے والوں کو ابھی تک انتظار ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے پڑھنے والے کی حیثیت سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے پاکستان میں تاریخ کے مضمون کے حوالے سے تحقیق کے نئے زاویئے متعارف کرائے ہیں اور ان کی تحقیق نے درباری تاریخ کے نقصانات کو بے نقاب کیا ہے، اور ایک عام قاری بھی ان کی تحقیقی تحریروں کو پڑھتے ہوئے حقائق تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔

جب بھی کوئی قاری ڈاکٹر مبارک کی تحریروں کو دلچسپ قرار دیتا ہے تو میرا ان سے کہنا یہ ہوتا ہے کہ ان کی آسان اور سہل تحریروں سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر جو بات ان کی تحریروں کو دلچسپ بناتی ہے وہ ___ وہ انکشات ہیں جو ابھی تک ہم تک نہیں پہنچے تھے اور ایک حقیقی مورخ و محقق کے طور پر انہوں نے بغیر کسی سنسنی خیزی کے وہ انکشافات ہم تک پہنچائے ہیں۔ گویا انہوں نے تاریخ کے بہت سارے راز کھول کے رکھے ہیں۔ جو ہماری آنے والی نسلوں کے لئے ضروری بھی ہیں اور مستقبل کے مئورخین اور محققین کو تاریخ لکھنے میں مدد بھی دیں گے۔

چونکہ ڈاکٹر مبارک علی غیر روایتی انداز میں تاریخ کے موضوعات پر لکھتے آئے ہیں اور روایتی تاریخ نویسی کی روایات پر بھی انہوں نے بہت سارا لکھا ہے۔ لیکن کہیں بھی انہوں نے جذبات میں آ کر ان ماخذات کو مکمل رد نہیں کیا ہے۔ ایک عام محقق کے لئے یا مورخ کے لئے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے تاریخ لکھنا بہت آسان ہے۔ لیکن تحقیق اور تاریخ اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ جذبات کی رو میں بہتے ہوئے جب ہم کچھ تحریر کریں گے تو اس تحقیق سے انصاف نہیں کر سکیں گے، اور اپنی تحقیق سے ڈاکٹر مبارک علی نے یہی انصاف کیا ہے۔ جو انہیں ایک مدبر مورخ کا درجہ دیتی ہے وہ علم کے ان تمام تقاضوں سے نبھاتے آئے ہیں جو مورخ کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ خود یا معاشرہ تاریخ سے سیکھتا ہے یا نہیں سیکھتا ___ کسی نے یہ کہا بھی ہے کہ تاریخ سے یہ سبق سیکھا جاتا ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتا۔ لیکن جب یہ بات میں خود پر صادر کرتا ہوں کہ میں نے تاریخ سے چاہے کچھ نہ سیکھا ہو لیکن ایک مورخ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ نہ فقط میں نے بلکہ بہت سے نوجوانوں نے ڈاکٹر مبارک علی ایسے مورخ و محقق کی تحریروں سے یہ سیکھا ہے کہ تاریخ کو کیسے پڑھا جائے؟ تاریخ کو کیوں



پڑھا جائے؟ نصابی تاریخ کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہمیں ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ تاریخ ماضی کا مضمون یا شعبہ رہتے ہوئے بھی حال میں مدد دے سکتی ہے۔ یعنی حال کو تاریخ کے تناظر میں مدد مل سکتی ہے، اور ہم اس دور کے بہت سے معاشرتی، سیاسی اور اجتماعی نفسیاتی مسائل کو سمجھ سکتے ہیں، سمجھنے کے بعد ان کا حل بھی نکال سکتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جیسا کہ ڈاکٹر مبارک صاحب کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کو آگے چلنا چاہئے اور تحقیق ہونی چاہئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس طرح کی کوشش کو ریاستی یا غیر ریاستی عناصر کی طرف سے بہت ساری رکاوٹوں کا سامنا بھی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی بھی محقق کو اس ریکارڈ تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا جو ریاست یا حکومت کے قبضہ میں ہے۔

مزاحمت فقط جنگ کے میدان میں نہیں ہوتی۔ مزاحمت تو قلمی قبیلے والے ڈاکٹر مبارک جیسے محقق اور مورخ بھی کرتے ہیں جو دیرپا ہوتی ہے اور اس قبیلے کے لکھنے والے تاریخ میں وہ اعصاب شکن لڑائی لڑتے ہیں جو روایتی جنگ سے مختلف و منفرد ہوتی ہے اور قلم سے لڑی جانے والی جنگ اجتماعی شعور کا وہ حصہ بن جاتی ہے جو نسلوں تک زیر بحث رہتی ہے۔ اس قسم کی جنگ میں ڈاکٹر مبارک علی کا کردار صف اول کے ان لکھنے والوں میں رہا ہے۔ جس کو تاریخ سے ہی سند ملتی ہے اور میرے خیال میں حقیقی تاریخ کی گواہی نصابی روایتی تاریخ سے ہزار گنا دیرپا ہوتی ہے۔ اس قلمی مزاحمت میں اس وقت فقط ڈاکٹر مبارک علی اکیلے نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی سوچ اور فکر کو درست سمجھنے والے وہ ہزاروں لاکھوں لوگ بھی شامل ہیں جن تک ان کے خیالات کتابوں کی صورت میں پہنچ چکے ہیں۔

## ڈاکٹر مبارک علی —— چند تاثرات

شہزاد احمد

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری محبت میری تاریخ کے Subject کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے ہوئی جب میرے ایک دوست نے مجھے حوالہ دیا کہ اگر تم نے ڈاکٹر مبارک کی کتابیں نہیں پڑھیں تو تم سمجھ لو کہ تم نے تاریخ کے Subject کو نہیں پڑھا اور واقعی ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ جس نے ڈاکٹر صاحب کی کتابیں نہیں پڑھیں وہ ابھی نابالغ ہے۔ خیر ان کی کتابیں پڑھ کر میری ان سے اُنسیت میں اضافہ ہوا تو اکثر ان کے بارے میں کتابوں کی دکانوں کے مالکان سے پوچھنے لگا اور آخر کار فکشن ہاؤس سے مجھے ان کے گھر کا نمبر مل گیا۔ میں نے خوشی خوشی ان کو کال کی اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری پہلی دفعہ بات ہوئی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے اپنے آفس کے Director کو بڑے فخر سے بتایا کہ آج میں نے ڈاکٹر مبارک سے بات کی ہے۔ اس بات کو گزرے دو تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ میں اپنے ایک دوست کو چھوڑنے سانجھ کے آفس گیا تو باتوں باتوں میں وہاں امجد سے پتہ چلا کہ وہ ہر ہفتے سانجھ کے آفس آتے ہیں بس میں نے فوراً امجد سے پوچھا کہ اگر میں بھی ہفتے کو آ جاؤں تو کوئی مسئلہ تو نہیں۔ اس نے کہا مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے میں نے ہر ہفتے سانجھ کے دفتر جانا شروع کر دیا اور یہیں سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میرے تعلقات کا آغاز ہوا۔ اب میرا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ محبت کا یہ عالم تھا کہ میں ان کو روزانہ دو وقت Calls کر دیتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب میرے بار بار فون کرنے سے جھنجلاتے ہیں تو میں نے فون کرنا کم کر دیا اور ایک دن میں نے وہاں پر آنے والے ایک لڑکے کو کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو کال کر کے ان کے گھر چلے جاتے ہیں بس پھر ڈاکٹر صاحب کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا جب بھی دل کرتا ان سے ملنے کے لئے ان کو کال کر کے ان کے گھر چلے جاتے ہیں۔

اب ڈاکٹر صاحب ہر ہفتے دوستوں کے ساتھ نیرنگ گیلری میں بیٹھتے ہیں۔ اس بیٹھک میں،



میں پابندی سے شریک ہوتا ہوں یہاں مجھے موقع ملتا ہے کہ میں ان سے سوالات کروں۔ میں اکثر ان سے پوچھتا ہوں کہ آجکل وہ کونسی کتاب پڑھ رہے ہیں جس پر وہ کتاب کے مصنف اور اس کے مضمون کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہیں کیونکہ میں زیادہ تر تاریخی معلومات انٹرنیٹ سے لیتا ہوں اس پر ان کا کہنا ہے کہ مجھے کتابیں پڑھنی چاہئیں جب میں نے روس کی تاریخ میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ''گبن'' (Gibbon) کی تاریخ ضرور پڑھوں جو اس نے روسی سلطنت کے زوال پر لکھی ہے۔ اس طرح میں نے ان کے کہنے پر دوسری اہم تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جن میں ''شاخِ زریں (Golden Bough) ہے۔ جس کا مصنف جیمس فریزر ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس بیٹھک سے میرے علم میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ میں جب بھی ان سے ذاتی معاملات میں مشورہ لیتا ہوں تو وہ مجھے معقول مشورہ دیتے ہیں، مثلاً جب ایک NGO کی ملازمت میں میرے ساتھ برا برتاؤ کیا گیا تو ان کا مشورہ تھا کہ میں فوراً ملازمت چھوڑ دوں کیونکہ فرد کی عزت سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے اور میں اپنے پروفیشن میں اتنی مہارت حاصل کرلوں کہ لوگ خود مجھے ملازمت کی پیش کش کریں۔

مجھے خوشی ہے کہ میں نے یہ چند تاثرات لکھ کر ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

# ناقابلِ فراموش

خورشید احمد شیخ

شام کے تقریباً چار بجے کا وقت ہوگا جب مجھے محترم ڈاکٹر مبارک علی خاں صاحب کا لیٹر موصول ہوا۔ اس وقت میں حیدرآباد کی سینٹرل جیل کی بی کلاس کے کمپاؤنڈ میں ولادی میر ایلچ لینن کی شہرۂ آفاق کتاب ''کیا کیا جائے؟'' (What is to be done?) کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیٹر میں اس امر پر روشنی ڈالی تھی کہ ہمیں انواع قسم کے لٹریچرز، تحریروں اور کتب کا مطالعہ کرنا چاہئے اور یہ ضروری نہیں کہ مذکورہ لٹریچر اور کتب ہماری فکر ونظریات سے ہم آہنگ ہوں۔ یکطرفہ مطالعہ سے قاری کا ذہن فکری تعصب کا شکار ہو جاتا ہے اور ذہنی وسعت کا دائرہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ لیٹر کے مندرجات نے میری سوچ پر دوررس اثرات مرتب کئے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ایک ہی قسم کے لٹریچرز اور تحریروں کے مطالعہ سے قاری کی سوچ میں تعصب سرایت کر جاتا ہے اور اس کا ذہن علمی وفکری رواداری کے فقدان کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ تمام تحریریں وکتب جو ہمارے نظریات وافکار سے ہم آہنگ نہ ہوں ان کی طرف مطالعے کی عدم دلچسپی ہمیں علمی طور پر بانجھ بنا دیتی ہے۔ اس لئے ہر قسم کے لٹریچرز اور کتب کا مطالعہ موجودہ سماج، اس کی قدروں، ثقافت، معیشت اور سیاست کو سمجھنے کا سائنسی اندازِ فکر مہیا کرتا ہے۔ اس سے پیشتر میں صرف ترقی پسند نظریات وسوچ کے حامل لٹریچرز اور کتب کا مطالعہ کرنا ہی پسند کرتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے مشورے کی روشنی میں میری سوچ میں ایک نمایاں تبدیلی آئی اور میں نے ہر قسم کے نظریات وسوچ کے حامل لٹریچرز وکتب کے مطالعے کا آغاز کر دیا اور جیل کی لائبریری میں جو بھی کتب ورسائل دستیاب تھے، ان کا مطالعہ کر ڈالا، بلکہ جیل سے باہر سے بھی کچھ کتب مختلف ذرائع سے منگوائیں جن کا مطالعہ میرے لئے بہت سودمند ثابت ہوا۔



جیل سے رہائی کے بعد میں ان علمی، ادبی وفکری نشستوں میں وقتاً فوقتاً شریک ہوتا رہا جو دیال داس کلب حیدرآباد میں ہوا کرتی تھیں اور جس کے روحِ رواں محترم ڈاکٹر صاحب اور دیگر سینئر احباب تھے اس کا ذکر خود محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی آپ بیتی میں تفصیل سے کیا ہے چونکہ ان فکری وعلمی نشستوں میں شرکاء کا دائرہ محدود تھا اس لئے ہم دوستوں نے باہمی طور پر یہ طے کیا کہ اسٹڈی سرکلز شروع کئے جائیں جن میں این ایس ایف کے کارکنوں اور دیگر نوجوانوں کی فکری ونظریاتی تربیت ہو سکے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی خاں اور پروفیسر فریدالدین صاحب نے بہت زیادہ تعاون کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب اور پروفیسر فرید صاحب باقاعدگی سے ان اسٹڈی سرکلز میں لیکچرز دیا کرتے تھے اور ہر سیشن کے اختتام پر سوال وجواب کا مرحلہ آتا تھا جس میں تمام دوست بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔ ان اسٹڈی سرکلز میں ڈاکٹر صاحب اور پروفیسر فرید صاحب کے علاوہ دیگر ترقی پسند دانشور بھی نوجوانوں کے ذہنوں کو علم وآگاہی سے سیراب کیا کرتے تھے۔ میں نے ان تمام لیکچرز اور بحث ومباحثے کو آڈیو کیسٹس میں ریکارڈ کیا ہوا تھا جو ایک انتہائی قیمتی علمی سرمایہ تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے میں نے یہ تمام آڈیو کیسٹس اپنے ایک ذمہ دار دوست (جس کا نام یاد نہیں) کے حوالے سے اس شرط کے ساتھ دی تھیں کہ وہ نہ صرف ان کو حفاظت سے رکھے گا بلکہ دیگر دوستوں کو بھی اس سے علمی طور پر مستفیض ہونے کے مواقع فراہم کرے گا۔ لیکن نہ تو مذکورہ دوست اور نہ ہی اس قیمتی علمی مواد کی نشاندہی ہو پا رہی ہے۔ گذشتہ دنوں اس کی اشاعت کے سلسلے میں اشاعتی ادارے فکشن ہاؤس کے جناب ظہور احمد خان صاحب سے تبادلہ خیال ہوا۔ ظہور صاحب نے اس قیمتی علمی مواد کو تحریری شکل دے کر شائع کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ بعدازاں میں نے انتہائی کاوشیں کیں لیکن پھر بھی اس علمی مواد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اگر ان لیکچرز اور بحث ومباحثے کو تحریری شکل مل جاتی تو یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوتی جس کا مجھے بہت ملال ہے۔

بہرحال مجھے امید ہے کہ میں جلد یا بدیر مذکورہ آڈیو کیسٹس مواد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور محترم ظہور احمد خان صاحب اسے فکشن ہاؤس کی جانب سے شائع کرنے کا اپنا وعدہ بھی ایفاء کریں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی خاں صاحب نے اپنی یادداشتوں (آپ بیتی) میں کافی دوستوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے لیکن پھر بھی کچھ دوست ایسے ہیں کہ اگر ان کی خدمات کا تذکرہ ڈاکٹر کے حوالے سے نہ کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی نامکمل رہے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتداء میں جب اپنی تحریروں کو

شائع کرانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے بٹر پیپرز پر نہ صرف خود کتابت کا آغاز کیا بلکہ این ایس ایف کے دوستوں خصوصاً مہتاب احمد خان، نوشاد احمد چندریگر اور ظفر احمد راجپوت وغیرہ نے بھی کتابت کے کام میں ڈاکٹر صاحب کی کافی معاونت کی۔ اسی طرح کتابوں کی اشاعت کے موقعوں پر بھی تمام دوستوں نے بھر پور طور پر ان کی پبلسٹی اور فروخت میں حصہ لیا۔

مزید برآں جب ڈاکٹر صاحب حیدر آباد سے لاہور منتقل ہو رہے تھے ان دنوں اندرون سندھ لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال انتہائی خراب تھی۔ ڈاکوؤں نے قومی شاہراہ اور دیگر چھوٹی بڑی شاہراہوں پر سفر کو ناممکن بنا دیا تھا ان دنوں ظفر احمد راجپوت (جو آج کل حیدر آباد ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر ہیں) نے ڈاکٹر صاحب کی حیدر آباد سے لاہور منتقلی میں کافی مدد کی۔ محترم ظفر احمد راجپوت صاحب، ڈاکٹر صاحب کا تمام گھریلو سامان اور فرنیچر ٹرک میں لوڈ کروا کر حیدر آباد سے لاہور لے گئے تھے۔ ان دنوں قومی شاہراہ پر اتنا طویل سفر کرنا انتہائی خطرناک مگر دلیری کا کام تھا جو ظفر راجپوت صاحب نے انجام دیا۔

میں نے ایک مقالہ بعنوان ''کیا اقبال تصور پاکستان کے خالق تھے؟'' ان دنوں تحریر کیا تھا جبکہ ڈاکٹر صاحب حیدر آباد میں ہی قیام پذیر تھے۔ مذکورہ مقالے میں علامہ اقبال کی تحریروں کی روشنی میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ علامہ اقبال نے بقلم خود پاکستان یا ایسے کسی مجوزہ ملک کی تشکیل کے منصوبے سے واضح طور پر اپنی برأت کا اعلان کیا تھا۔ مذکورہ مقالے کی تحریر سے پہلے ڈاکٹر صاحب اور دیگر سینئر ترقی پسند دوستوں سے کافی گفت وشنید رہی اور کچھ تحریری مواد بھی اکٹھا کیا گیا۔ جس کی وجہ سے مذکورہ مقالہ مکمل ہو سکا۔



# میں نے تاریخ کا مضمون کیوں لیا

ارم علی ورک

دنیا میں ہر انسان کا کوئی نہ کوئی رول ماڈل ہوتا ہے، جس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح یہ رول ماڈل ایک طرح روحانی استاد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی میرے رول ماڈل اور روحانی استاد ہیں، جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تاریخ کے مضمون میں اپنا مقام بنانا چاہتی ہوں۔

میں اپنے بچپن میں نصابی کتب کو شوق سے پڑھتی تھی اور کلاس میں اچھی پوزیشن لیتی تھی، مگر مجھے اپنی بڑی بہن کی طرح اخبار وغیرہ پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ حالانکہ میرے پپا مجھے اکثر اخبار پڑھنے کی ہدایت کیا کرتے تھے۔ میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد اپنی امی کی خواہش پر میں نے پری میڈیکل میں داخلہ لے لیا، یہ جانے بغیر کہ اس مضمون میں میرا رجحان ہے بھی یا نہیں۔ فرسٹ ائیر میں اچھے نمبر لے آئی اور سیکنڈ ائیر کی تیاری شروع کر دی۔ سیکنڈ ائیر کا امتحان دینے کے بعد مطمئن تھی کہ مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل ہی جائے گا۔ اس لئے اپنے پپا سے مشورہ کیا کہ چھٹیوں میں کیا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تمہاری دلچسپی ہو تو میری کتابوں کی الماری سے اپنے پسند کے موضوع پر کتابیں لے کر پڑھ سکتی ہو۔ مگر اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ خراب نہ ہونے پائیں۔ میں بھی گھر میں بور ہو رہی تھی، اس لئے سوچا چلو کوئی کتاب لے کر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

یوں ایک دن میں نے پپا کی الماریوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سامنے تین رنگین سرورق والی کتابیں رکھی تھیں، جو دیکھنے میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ میں نے ایک کتاب اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔ یہ انسانی تاریخ کی مختصر داستان تھی، جس میں رنگین تصاویر بھی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری اور تیسری کتاب دیکھی اور پھر پپا کی اجازت سے اپنے کمرے میں لے گئی۔ تینوں کتابیں بہت دلچسپ اور معلوماتی تھیں۔ ان کے نام پتھر کا زمانہ، کانسی کا زمانہ اور لوہے کا زمانہ تھے۔ ایک کے بعد

دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کتاب پڑھتی چلی گئی اور یوں مجھے اس مضمون میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ میں نے پپا سے پوچھا کہ اس طرح کے موضوع پر کچھ اور کتابیں ہیں آپ کے پاس؟ انہوں نے کہا کہ اب تم خود الماریوں میں تلاش کرو اور جو کتاب اچھی لگے اسے اٹھا کر پڑھ لو، مگر میری شرط یاد رکھنا۔ میں نے جب الماری پر نظر ڈالی تو ایک پوری ریک میں ڈاکٹر مبارک علی کی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ نیچے والی ریک میں سہ ماہی تاریخ کے شمارے، بہت سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی دو کتابیں اٹھائیں اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ کتابیں تاریخ کیسے لکھنی چاہئے اور تاریخ کا شعور تھیں۔

اس کے بعد میری دلچسپی مزید بڑھی اور میں نے پپا کی الماریوں میں موجود ڈاکٹر مبارک علی کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہمارے گھر میں روزانہ چار اخبار آتے ہیں۔ ان میں انگریزی اخبار ڈان بھی شامل ہے۔ میرے پپا ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ انگریزی درست کرنے کے لئے انگریزی اخبار پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر ہم نے کبھی ان کی اس نصیحت پر توجہ نہیں دی۔ لیکن جب ڈاکٹر مبارک کی کتابیں پڑھنے کے بعد تاریخ میں شوق پیدا ہوا تو ایک دن پپا نے بتایا کہ ڈاکٹر مبارک علی ڈان میں ہفتہ وار مضامین لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے اب ہر اتوار کو ڈان کے سنڈے میگزین Images کو نہ صرف پڑھنا شروع کر دیا، بلکہ ان مضامین کو فائل بھی کرنے لگی۔ یوں میرے پاس نتیجہ آنے تک ان کے مضامین کی ایک فائل بن چکی تھی۔

رزلٹ آنے پر میرے بہت اچھے نمبر آئے اور یہ امید تھی کہ مجھے میڈیکل میں داخلہ مل جائے گا۔ امی بہت خوش تھیں کہ بیٹی ڈاکٹر بننے جا رہی ہے کہ ایک دن میں نے پپا سے کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ میں میڈیکل کی بجائے تاریخ میں ماسٹر کروں۔ میرے پپا خاصے روشن خیال ہیں اور بیٹیوں اور بیٹوں میں امتیاز نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا جو تمہاری مرضی جس مضمون میں چاہو تعلیم حاصل کرو، بس میری خواہش ہے کہ تعلیم ضرور حاصل کرو۔ امی کو بہر حال غصہ آیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تمہیں ڈاکٹر بنانے کی خواہش میں تمہارے لئے ٹیوشن لگائی اور اب تم تاریخ پڑھو گی؟ یہاں پھر پپا نے میری وکالت کی اور امی کو سمجھایا کہ بچہ جس مضمون میں دلچسپی لے اسے وہی لینے دینا چاہئے اور اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہئے۔ یوں میں جامعہ کراچی کے شعبہ تاریخ میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ میری زندگی کا ایک انتہائی خوبصورت موڑ تھا، کیونکہ میں اپنی مرضی کا مضمون اپنی پسند کے مطابق پڑھنے جا رہی تھی۔

میں اپنے پپا کے ساتھ ڈاکٹر مبارک علی کی مشکور ہوں جن کی وجہ سے مجھے اپنے ذہنی میلان کے مطابق مضمون منتخب کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر مبارک علی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے محض



تاریخی واقعات بیان نہیں کئے بلکہ تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کے مختلف موضوعات پر اردو میں کتابیں لکھ کر پاکستان کے عام شہری کو تاریخ کا شعور بخشا۔ ان کی تیسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے آج کی صورتحال کو تاریخ کے تناظر میں جانچنے کا سلیقہ سکھایا۔ یونیورسٹی کے چار سالہ دور میں میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ تاریخ کو ایک سنجیدہ طالب علم کے طور پر پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ آج میں نے تاریخ عمومی (General History) میں ایم اے کر لیا ہے۔ لیکن میری پیاس نہیں بجھی۔ میری خواہش ہے کہ میں اس مضمون میں Ph.D کروں اور ڈاکٹر مبارک علی کی طرح عوام کے شعور میں اضافے کا سبب بنوں۔ بہت شکریہ ڈاکٹر مبارک علی کہ آپ کی کتابوں کی بدولت تاریخ کی ایک طالبہ میڈیکل کالج کی لیبارٹریوں میں بھٹکنے سے بچ گئی۔ ڈاکٹر تو بہت لوگ بن جاتے ہیں، مگر تاریخ کا شعور ایک پڑھے لکھے معاشرے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ ڈاکٹر صاحب آپ میرے لئے روشنی کا مینار ہیں۔

# انسان دوست

مسعود جمال

آج مجھے اُس شخصیت پر لکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے جو میرے ممدوح بھی ہیں، میرے روحانی باپ بھی ہیں اور اُستاد بھی، مہربان و محسن بھی ہیں اور دوست بھی!

جی ہاں! پاکستان ہی کیا بلکہ برصغیر پاک و ہند کے وہ عظیم مورّخ و ممتاز محقق کہ اب تک جن کی 70 کے قریب کتابوں سے ایک دنیا مستفیض و سیراب ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی جنہوں نے اپنے دوستوں میں شمار کر کے راقم کو قیمتی بنا دیا ہے۔ میں خدا کے بعد انتہائی متشکر و ممنون کامریڈ اظہر علی کا ہوں کہ جن کے وسیلے سے سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ اُن کے دورہَ حیدر آباد کے موقع پر وہ دن اور آج کا دن، اب مجھے اعزاز حاصل ہے کہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کے دورہَ حیدر آباد و اضلاع دیگر (سندھ) کے موقع پر اُن کا میزبان (جونیئر) رہتا ہوں۔ حیدر آباد چونکہ ان کا شہر ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب یہاں آ کر خود کو بہت بہتر محسوس کرتے ہیں اور دیگر اضلاع سندھ کی نسبت یہاں زیادہ لطف اٹھاتے ہیں۔

ڈاکٹر پروفیسر فرید الدین (فلاسفر) چونکہ ڈاکٹر صاحب کے بہت خاص دوست ہیں تو جب جب ڈاکٹر صاحب حیدر آباد تشریف لائے، اپنے لیکچرز کے بعد انہوں نے زیادہ وقت قبلہ پروفیسر فرید الدین صاحب کے ساتھ ہی گذارا، فاران ہوٹل "صدر" حیدر آباد میں دوستوں کے ساتھ بیٹھنا اور اپنی جیب سے (باوجود حیدر آباد میں مہمان ہونے کے) دوستوں کو چائے پلانا ڈاکٹر صاحب کو بہت ہی اچھا لگتا ہے۔

"نہ جانے سارے "بڑے" "لوگ" "درویش" کیوں ہوتے ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علاماتِ "درویشاں" بھی ایک سی ہی ہوتی ہیں۔"



مکڈونلڈ کی کافی ڈاکٹر صاحب بہت ہی پسند کرتے ہیں۔ اکثر راقم کو یہ شرف ملا کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر مکڈونلڈ آئے اور ڈھیر ساری گپ شپ، کافی کے ساتھ ہوئی۔

ایک دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ میرے دوست کو ڈاکٹر صاحب اور مجھے ایک شادی ہال سے پک کر کے مکڈونلڈ ڈراپ کرنا تھا۔ پر وہ کسی وجہ سے تاخیر کا شکار ہو گئے۔ اب موٹر سائیکل موجود تھی ایک دوست کے پاس۔ مردِ درویش ڈاکٹر صاحب موٹر سائیکل پر سوار ہوئے۔ فرمایا۔ مسعود جمال میں مکڈونلڈ پہنچ رہا ہوں۔ ان کو واپس بھیج رہا ہوں بائیک دے کر پھر آپ ان کے ساتھ آ جائیں۔

بلا کی سادگی اور طبیعت میں فقیری۔ یہ خاصہ ہے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا۔ حق گوئی اور بیباکی "تاریخ" کہ بیان کے حوالے سے میں نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب میں دیکھی۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب سندھ کی ایک نیشنلسٹ پارٹی کے مہمان تھے۔ دوران لیکچر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "جی۔ ایم۔ سید کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ بغیر عوامِ سندھ کی رائے لئے ایوب کھوڑو کو معاف فرما دیں۔" اب چونکہ یہ ایک کھلی حقیقت اور تاریخی بات تھی۔ وہ ہال جہاں یہ فرمایا۔ تالیوں سے گونج اُٹھا۔

دوسرا واقعہ سانحہ 12 مئی کے بعد ڈاکٹر صاحب کا سندھ کی ایک شہری جماعت سے ناراض بلکہ سخت ناراض ہونا بھی راقم کے سامنے کی بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب کہ دورہَ سندھ اور بالخصوص دورہَ حیدر آباد کو لے کر ہم کو سب سے زیادہ فکر اُن کے کھانے کی ہوتی ہے۔ سب دوستوں کی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دیسی کھانے اور سندھ دھرتی کے روایتی پکوان، دسترخوان پر پروسے جائیں۔ مرغی، گوشت، مچھلی سے ڈاکٹر صاحب کوسوں دور۔ البتہ سبزیاں، دالیں، چٹنیاں یہ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

پچھلے سال دسمبر 2012ء کے آغاز میں آپ حیدر آباد تشریف لائے تو امی جان کے ہاتھوں سے بنے مولی کے پراٹھے، شلغم کی بھجیا اور آلو ہری پیاز کے ساتھ بہ رغبت تناول فرمائے۔ پروفیسر حفیظ کُنبھر کی خواہش پر سندھ دریا کی خاص رہو مچھلی بھی کھائی۔

الغرض عوام کے مورخ کے سارے رنگ ڈھنگ ہی عوامی ہیں۔ موسیقی میں راجستھانی رنگ کو پسند فرماتے ہیں۔ راقم سے "کیسریا بالم پدھارو مارے دیس" اکثر فرمائش پر سنتے ہیں۔ یہ ایک راجستھانی فوک گیت ہے۔

آج کل ہم تمام دوست ڈاکٹر صاحب کی صحت کے بارے میں متفکر رہتے ہیں۔ پورے پاکستان

اور دُنیا بھر میں اپنے قارئین کو روشنی دینے والے، بینائی قلب دینے والے ڈاکٹر مبارک علی کی آنکھیں رات کو کم دیکھ پاتی ہیں۔ عظیم ہومیو پیتھ اور راقم کے تیسرے فکری اُستاد پروفیسر ڈاکٹر مزمل احمد اپنی پوری جانفشانی کے ساتھ ڈاکٹر مبارک علی کا علاج کر رہے ہیں۔ مولا انُہیں کامیابی اور ڈاکٹر صاحب کو شفائے کامل عطا فرمائے۔ آمین!

آج ہم پورے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر مبارک علی نہ صرف عوام کے مورخ اور عوام کے محقق ہیں بلکہ وہ پاکستان میں تاریخ کے ایک مکتبہء فکر کا سب سے مستند ادارہ ہیں۔ میں اپنے مضمون کا اختتام، اسی واقع پر کروں گا کہ اپریل 2012ء میں میرا لاہور جانا ہوا، اپنے ایک اور ممدوح و اُستاد محترم ''حسن نثار'' صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے اُن سے وقت لے کر اُن کے گھر واقع (بیلی پور) گیا۔ دوران گفتگو جب میں نے یہ بتایا کہ میں حیدرآباد میں ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا میزبان (جونیئر) ہوتا ہوں تو آپ یقین جانئے کہ وہ نہ صرف بہت خوش ہوئے بلکہ فرمایا کہ پاکستان میں ایک وہ تاریخ ہے جو ''ڈاکٹر صفدر محمود'' نے لکھی۔ جو آمروں کی، جاگیرداروں کی اور ایلیٹ کی تاریخ ہے، اور ایک وہ تاریخ ہے۔ جو ''ڈاکٹر مبارک علی'' نے لکھی۔ جو آپ کی، میری، اس دھرتی کی، اس دھرتی کے بیٹوں بیٹیوں کی تاریخ ہے، پسے ہوئے طبقات کی تاریخ ہے۔ درحقیقت جو عوام کی تاریخ ہے۔



# یادوں کی واپسی

ڈاکٹر مبارک علی

دوستوں نے جس محبت، الفت اور لگاؤ کے ساتھ یہ مضامین لکھے۔ ان سے مجھے اپنی شناخت کا احساس ہوا۔ ان میں سے کچھ مضامین نے پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ احمد جنہیں ہم محبت سے راجہ کہتے ہیں، جرمنی کی بھولی بسری یادوں کو تازہ کر دیا۔ جب میں روحر یونیورسٹی میں گیا تھا تو اس وقت وہاں پاکستانی طلباء کی تعداد بہت کم تھی۔ ان میں سے اکثریت سائنس کے مضامین میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ آرٹس میں، میں واحد تھا۔ دوستوں سے تعارف میں وقت لگا، لیکن باہر جا کر ہندوستان اور پاکستان کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

دوستیاں ہندوستان کے طلباء سے بھی اسی طرح تھیں، جیسے پاکستانیوں یا جرمنوں سے۔ اس وقت ہمارے سینئر یونس خاں تھے، جو الیکٹرونک انجینئرنگ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے وہیں پڑھا رہے تھے۔ یہ نئے آنے والوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ جب ان سے دوستی بڑھی تو ویک اینڈ پر ان کے گھر برج کی بازی ہونے لگی۔ اس میں راجہ میرے پارٹنر ہوتے تھے، اور جہانگیر یونس خاں کے۔ لیکن راجہ یونس خاں کو تنگ کرتا تھا، جس پر اکثر وہ ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ رات بھر یہ ہنگامہ رہتا تھا۔ صبح ہونے پر یونس خاں ہم سب کو اپنی کار میں بٹھا کر، ہمارے ٹھکانوں پر چھوڑنے آتے تھے۔ ان کی جرمن بیوی تھراوڈل بڑے شوق سے ہمیں جرمن کھانے کھلاتی تھیں۔

جرمن یونیورسٹیوں میں سمسٹر کے خاتمہ پر رواج ہے کہ طلباء اپنے شعبوں یا ہاسٹلوں میں فیسٹیول مناتے ہیں، اس موقع پر گانے گائے جاتے ہیں، ڈانس ہوتا ہے، اور بیئر کے جام لنڈھائے جاتے ہیں۔ اکثر غیر ممالک کے طلباء آپس میں مل کر پارٹیاں کیا کرتے ہیں۔ ہم نے ایک بار تو [illegible] میں کھانے کا اسٹال لگایا تھا، یہ کھانا میں نے یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا کے باورچی خانے میں پکایا تھا،

اتفاق سے کھانا مزیدار بن گیا اور خوب بکا۔

دوسری بار ہم نے فلسطینیوں کی مدد کے لئے ایک اسٹال لگایا۔ یہ فیسٹیول بوخم شہر کے قریب ایک پرانے قلعہ میں ہوتا ہے۔ وہاں بھی کھانا لوگوں کو پسند آیا۔ تیسری مرتبہ جب راجہ کی پی۔ایچ۔ڈی مکمل ہوئی تو اس موقع پر یونس خاں نے کھانا پکایا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ کھانا پکانے میں ماہر ہیں، واقعی کھانا لذیذ تھا۔

اس موقع پر بہت سے جرمن دوست یاد آ رہے ہیں۔ ہانس جو بائیں بازو کے نظریات کی جماعت میں سرگرم تھا، ہر موقع پر مدد کے لئے تیار ہوتا تھا۔ جب ہم ہاسٹل سے اپارٹمنٹ میں آئے تو اُسی نے کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے لگائے۔ سامان کو ہمارے ساتھ اٹھوایا، وہ درویشانہ حالت میں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر شہر سے باہر تفریح کرائی، اور اس قدر تیز رفتاری سے موٹر سائیکل چلائی کہ میں آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہا کہ یہ کب مجھے واپس لے آتا ہے۔ جب کبھی وہ نہادھوکر اور نئے کپڑے پہن کر آتا تو اس کو پہچاننا مشکل ہوتا تھا۔

جرمنی کے ہاسٹلوں میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ رہتے ہیں، اس لئے ان کے درمیان دوستی اور محبت ہو جاتی ہے۔ شام کو جب کچن میں سب مل کر کھانا پکاتے، کھاتے، تو اس وقت سیاست پر گرما گرم بحث ہوتی تھی۔ یہ زمانہ سیاسی طور پر بڑا اہم تھا۔ ویت نام کی جنگ نے طلباء میں شعور پیدا کر دیا تھا۔ روس اور چین کے حامیوں کے درمیان بحث ہوتی تھی۔ فلسطینی طلباء اپنے حقوق کی بات کرتے تھے۔ مجھے عمر شالی یاد ہے، جسے اکثر عمردی ٹریبنل بھی کہتے تھے۔ بڑا باتونی تھا، جب کیفے ٹیریا میں آتا تو اس زور سے بولتا کہ صرف اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہم سب فلسطینیوں کے ساتھ ان کے حقوق کی بات کرتے تھے۔ ہماری یونیورسٹی میں بھی ترک طلباء کی تعداد بہت تھی۔ ترک بڑے سیدھے، صاف گو اور پُروقار لوگ ہیں۔ محمد کچک، میرے ساتھ ہی پی۔ایچ۔ڈی کر رہا تھا۔ بعد میں وہ جرمنی ہی میں رک گیا۔ علی جو سائنس کا طالب علم تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ساتھ ہم ایمسٹرڈیم گئے تھے۔ اکثر یہ طلباء ہمیں اپنے گھروں پر بھی بلاتے تھے اور اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے ملاتے تھے۔ مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ ترکی میں آ جاؤ، تمہیں اس کی شہریت دلا دیتے ہیں۔

شعبہ تاریخ کے پروفیسر فوکوالیولن سے میری دوستی تھی وہ اکثر میرے ہاسٹل میں آ جاتے تھے۔ جب بھی میرے ساتھ مسائل ہوتے وہ فوراً مدد کرتے تھے۔ ایک بار میری مالی حالت خراب تھی، تو انہوں نے موسیقی کے شعبہ سے اسسٹنٹ شپ لے کر مجھے دلوادی۔



فراڈ برونگ، جو لائبریری کی انچارج تھیں، اکثر گھر پر کھانے پر بلاتی تھیں۔ ان کے شوہر ایک اسکول میں موسیقی کے استاد تھے۔ ان کا لڑکا بھی موسیقی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جرمنوں کو موسیقی سے بہت دلچسپی ہے۔ جب کبھی اکٹھے ہو جائیں تو مل کر گانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

راجہ کے مضمون نے جرمنی میں پانچ سالہ قیام اور اس کی یادوں کو ایک بار پھر تازہ کر دیا۔ وہ بہت سے دوست یاد آئے کہ جن سے بعد میں کوئی رابطہ نہیں رہا۔ لیکن ان کی یادیں اب بھی ساتھ ہیں۔

جرمنی سے واپس آنے کے بعد میں تین بار جرمنی گیا۔ دو بار اپنی یونیورسٹی کو بھی دیکھنے گیا۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ یورپ کا سیاسی ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کا کیفے ٹیریا جو سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا اب سنسان پڑا تھا۔ یونیورسٹی اپنی جگہ تھی۔ یونی سینٹر بھی اسی طرح سے تھا، مگر جب دوست نہ ہوں تو یہ ویران نظر آئے۔ حالانکہ طلباء و طالبات کے ہجوم اب بھی ہوٹلوں، اور یونی سینٹر کی بنچوں پر بیٹھے خوش گپیاں کرتے نظر آئے۔

میں یونی سینٹر سے پیدل چلتا ہوا، اس بلڈنگ تک گیا کہ جہاں ہم رہتے تھے۔ وہ بلڈنگ اور گلی اسی طرح سے تھی، لیکن اب درختوں کی تعداد بڑھ گئی تھی، ماحول پہلے سے زیادہ خوشگوار اور تازہ تھا۔

کچھ دوستوں نے حیدرآباد کے بارے میں لکھا، خاص طور سے اس وقت کا حال کہ جب میں جرمنی سے واپس آیا اور حیدرآباد میں نوجوانوں سے ملاقات ہوئی کہ جو سیاسی طور پر ترقی پسند نظریات کے حامی تھے۔ اس وقت حیدرآباد میں ادبی سرگرمیوں کا مرکز مجلس مصنفین ہوا کرتی تھی کہ جس کا ہفتہ وار اجلاس لطیف آباد نمبر 7 میں، کارپوریشن کی ایک لائبریری میں ہوتا تھا۔ اس کے لائبریرین خضر مہدی تھے، جنہوں نے بڑی محنت سے کتابیں جمع کی تھیں، اور طلباء میں کتابیں پڑھنے کے شوق کو ابھارتے تھے۔ اس ادبی مجلس نے شہر کے کچھ لوگوں میں ادب کے شوق کو زندہ رکھا تھا۔ لیکن جب خضر صاحب کی اچانک وفات ہوئی تو کارپوریشن جو شاید اس کا انتظار کر رہی تھی لائبریری بند کر دی، پتہ نہیں کہ اس کی کتابوں کا کیا ہوا؟ مجلس مصنفین کے اجلاس بھی ختم ہو گئے۔ شہر کی علمی فضاء کو اس وقت نقصان پہنچا کہ جب یونیورسٹی جام شورو سے چلی گئی۔ کالجوں میں طلباء کی ایسی سیاست آئی کہ اس نے علمی سرگرمیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ اب حیدرآباد میں شاید ایک آدھ ادبی مجلس ہے مگر اس کی فضا میں علمی و ادبی تذکروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اکثر ادبی اور علمی حضرات یا تو وفات پا گئے یا کراچی سدھار گئے۔ شہر میں آبادی تو بہت بڑھ گئی ہے مگر ادبی لحاظ سے یہ بنجر اور ویران ہو گیا ہے۔ شہروں کے اس علمی انحطاط سے ہم معاشرے کے ذہن کا احساس کر سکتے ہیں۔

دوستوں کے مضامین پڑھے تو ان کے ساتھ بیتے دن یاد آئے جب انور کمال اور رضی عابدی پہلی بار حیدرآباد آئے تو ہم مل کر موہنجوڈرو گئے تھے، جہاں نوجوانوں نے ہمارے ساتھ ایک شام منائی تھی۔ دوسری بار انور کمال آئے تو شکیل پٹھان کے ساتھ مکلی بھی گئے تھے۔ اب تصویروں میں یادیں ٹھہر کر رہ گئی ہیں۔

اب پچھلے دنوں ہمارے دوست خورشید قائم خانی بھی انتقال کر گئے، جب میں حیدرآباد میں تھا، یہ ہر ہفتے ٹنڈو الہ یار سے آتے تھے اور پھر ہم فریدالدین صاحب کے گھر جاتے اور وہاں خوب بات چیت ہوتی تھی۔ فرید صاحب نے جدید فلسفہ سے لے کر قدیم ہندوستانی فلسفہ اور مارکسزم پر بہت پڑھ رکھا ہے۔ افسوس ہے کہ انہوں نے صرف دو کتابچے لکھے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں وقت گذارا۔ اب وہ بھی حیدرآباد کو چھوڑ کر کراچی اور کینیڈا میں رہنے لگے ہیں۔

لیکن اب بھی حیدرآباد کے نوجوان اس شہر کی کھلی فضا کو قائم رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس لئے جب بھی میرا جانا ہوتا ہے، محفلیں جم جاتی ہیں، پرانے دوست اور نوجوان اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ جذبہ رہا تو شہر زندہ رہے گا۔

آخر میں، میں اپنے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے یہ مضامین لکھ کر مجھے حوصلہ دیا۔ اس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے جو کچھ کام کیا ہے وہ رائیگاں نہیں گیا ہے اور میری یہ شکایت ختم ہوگئی ہے کہ معاشرہ میں، میں اکیلا ہوں۔

آخر میں، میں ظہور احمد خان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کی تیاری اور چھپائی میں دلچسپی لی۔ خاص طور سے محمد شفیق کا شکریہ کہ اس نے میری تحریر کو پڑھا اور کم غلطیوں کے ساتھ کمپوزنگ کی اور ڈاکٹر ریاض احمد شیخ کا جنہوں نے دوستوں سے مضامین لکھوا کر یہ کتاب تیار کی۔



# سہ ماہی تاریخ کانفرنسیں

1- پہلی تاریخ کانفرنس ''تاریخ لاہور'' 2002ء، لاہور
2- دوسری تاریخ کانفرنس ''پنجاب اور سکھ'' 2002ء، لاہور
3- تیسری تاریخ کانفرنس ''تاریخ سندھ'' 2003ء، حیدرآباد سندھ
4- چوتھی تاریخ کانفرنس ''پنجاب کی تاریخ'' 2004ء، لاہور
5- پانچویں تاریخ کانفرنس ''کولونیل ازم'' 2004ء، کراچی
6- چھٹی تاریخ کانفرنس ''نیشنل ازم'' 2005ء، لاہور
7- ساتویں تاریخ کانفرنس ''شہنشاہ اکبر'' 2005ء، کراچی
8- آٹھویں تاریخ کانفرنس ''تاریخ نویسی'' 2007ء، لاہور، کراچی، گجرات
9- نویں تاریخ کانفرنس ''1857ء'' 2007ء، لاہور، کراچی، گجرات
10- دسویں تاریخ کانفرنس ''پاکستان میں مارشل لاء کی تاریخ'' 2009ء، لاہور
11- گیارہویں تاریخ کانفرنس ''تاریخ اور عورت'' 2010ء، کراچی
12- بارہویں تاریخ کانفرنس ''تاریخ اور عوام'' 2012ء، کراچی، لاہور
13- تیرہویں تاریخ کانفرنس ''تاریخ اور جنگ'' 2012ء، کراچی
14- چودھویں تاریخ کانفرنس ''سماجی علوم'' 2012ء، کراچی

# تاریخ پبلی کیشنز کا کتابی سلسلہ

## سہ ماہی "تاریخ"

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

37- سہ ماہی تاریخ نمبر (37)، خصوصی شمارہ ''کیا تاریخ ضروری ہے؟'' دسمبر 2008ء

38- سہ ماہی تاریخ نمبر (38)، اپریل 2009ء

39- سہ ماہی تاریخ نمبر (39)، خصوصی شمارہ ''پاکستان میں مارشل لاء کی تاریخ'' ستمبر 2009ء

40- سہ ماہی تاریخ نمبر (40)، اپریل 2010ء

41- سہ ماہی تاریخ نمبر (41)، خصوصی شمارہ ''تاریخ اور عورت'' اکتوبر 2010ء

42- سہ ماہی تاریخ نمبر (42)، مئی 2011ء

43- سہ ماہی تاریخ نمبر (43)، خصوصی شمارہ ''لاہور نمبر'' نومبر 2011ء

44- سہ ماہی تاریخ نمبر (44)، خصوصی شمارہ ''تاریخ اور عوام'' مئی 2012ء

45- سہ ماہی تاریخ نمبر (45)، خصوصی شمارہ ''تاریخ اور جنگ'' اگست 2012ء

46- سہ ماہی تاریخ نمبر (46)، خصوصی شمارہ ''ایرک ہابس باؤم'' جنوری 2012ء



# ڈاکٹر مبارک علی کی اردو کتب

1- مغل دربار

2- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان

3- تاریخ شناسی

4- تاریخ و فلسفہ تاریخ

5- تاریخ کے بدلتے نظریات

6- تاریخ کیا کہتی ہے؟

7- تاریخ کی روشنی

8- المیہ تاریخ

9- برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ

10- علماء اور سیاست

11- تاریخ اور عورت

12- تاریخ ٹھگ اور ڈاکو

13- سندھ: خاموشی کی آواز

14- اچھوت لوگوں کا ادب

15- غلامی اور نسل پرستی

16- تاریخ اور سیاست

17- شاہی محل

18- تاریخ: کھانا اور کھانے کے آداب

19- تاریخ اور دانشور

-20 تاریخ اور مورخ
-21 نجی زندگی کی تاریخ
-22 کیتھارینا بلوم کی کھوئی ہوئی عزت
-23 ملحد کا اوورکوٹ
-24 جدید تاریخ
-25 تاریخ اور تحقیق
-26 تاریخ کی آواز
-27 تاریخ کی تلاش
-28 تاریخ اور نصابی کتب
-29 تاریخ سے مکالمہ
-30 سندھ کی تاریخ کیا ہے؟
-31 سندھ کی سماجی وثقافتی تاریخ
-32 لطف اللہ کی آپ بیتی
-33 در در ٹھوکر کھائے
-34 یورپ کا عروج
-35 برطانوی راج (ایک تجزیہ)
-36 بدلتی ہوئی تاریخ
-37 جاگیرداری
-38 تاریخ اور معاشرہ
-39 اکبر کا ہندوستان
-40 جہانگیر کا ہندوستان
-41 تاریخ اور مذہبی تحریکیں
-42 گمشدہ تاریخ
-43 تاریخ اور آج کی دنیا
-44 تاریخ تحقیق کے نئے رجحانات



-45 تاریخ کی دریافت
-46 تہذیب کی کہانی: (1) پتھر کا زمانہ، (2) کانسی کا زمانہ، (3) لوہے کا زمانہ (مکمل سیٹ تین جلدیں)
-47 (1) قدیم ہندوستان، (2) عہد وسطیٰ کا ہندوستان، (3) برطانوی ہندوستان (مکمل سیٹ تین جلدیں)
-48 میں اور میرا مقدمہ
-49 تاریخ کی دریافت
-50 امروز (1857ء) ترتیب
-51 تاریخ کی باتیں
-52 پاکستانی معاشرہ
-53 قائداعظم کیا تھے، کیا نہیں تھے؟
-54 میری دنیا
-55 تاریخ کی آگہی
-56 تاریخ کی گواہی
-57 تاریخ فہمی
-58 تاریخ کیا کہتی ہے

## ڈاکٹر مبارک علی کی انگلش کتابیں

1- *A Social and Cultural History of Sindh*
2- *In the Shadow of History*
3- *Sindh Observed*
4- *The English Factory In Sindh*
5- *Historian's Dispute*
6- *History On Trial*
7- *Ulema, Sufi's and Intellectuals*
8- *Crow's Account of Sindh*
9- *Essays On The History of Sindh*
10- *A Page From History*
11- *Interviews and Comments*
12- *Pakistan In Search For Identity*
13- *In Search of History*
14- *Sindh Analysed*
15- *Dimension of History*
16- *What History Tell Us?*
17- *Power of History*
18- *Tales from the Later Mughals*
19- *Story of Civilization Indian History*
20- *Story of Civilization*
21- *Court of The Great Mughal*



## ڈاکٹر مبارک علی کو ملنے والے ایوارڈز

1- فیض ایوارڈ، 1988ء (فیض فاؤنڈیشن)

2- پیر حسام الدین راشدی گولڈ میڈل، 1993ء (سندھی ادبی سنگت)

3- کمیونل ہارمنی ایوارڈ، 2002ء (رام کرشن سوسائٹی دہلی)

4- کمال اعتراف، 2012ء (کراچی آرٹس کونسل)